آیا بسنت سکھی
واجدہ تبسم

آیا بسنت سکھی

واجدہ تبسم

دسمبر ۱۹۷۴ء

باراول ایک ہزار

قیمت ۱۸ روپے

پرنٹر و پبلشر: اشفاق احمد اوورسیز بک سنٹر
جوہو ویلے پارلے ڈولپمنٹ اسکیم
بمبئی ۵۸

کتابت: شمس

مطبوعہ: اردو ٹائمز پریس

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جامعہ
دلی / بمبئی

ٹھہرو ۔ ذرا ادھر بھی نظر ڈالتے چلو ۔

تایامیاں :- میں ۔ راہ کا ایک پتھر ۔ نام "تاج" تھا مگر کسی کے قدموں میں پناہ نہ مل سکی ۔

جگنو :— میں — چمکیلے پروں والا ننھا منا بدنام فرشتہ ۔ روشنی ہی تو میرا دوسرا نام ہے ۔ مگر میرے آس پاس اندھیرے کی موجودگی شرط ہے ۔ ورنہ میرا جینا بیکار — میری روشنی بیکار ۔

شاجے :- میں — بدنصیب شاہجہاں ، میرے دل میں بہت کچھ ہے ۔ مگر زبان ساتھ نہیں دیتی ۔ آپ میری آنکھوں کو پڑھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ؟ ؟

ظہیر یار جھنگ : میں —؟ مجھے آپ کٹی ہوئی پتنگ کہہ لیجئے

شہابی :- اور میں ہوں شہابی ۔ آپ میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا ۔ کہ جب قسام ازل نے مجھے دنیا میں بھیجنا چاہا ، تو آنکھوں کے بجائے دو جلتے جلتے ستارے مجھے بخش دیئے ۔ دیکھئے تو میری آنکھیں —

"انجام"

تایا میاں نے اپنے جسم کا سارا زور لگا دیا مگر رسیاں نہ کھلیں ــ پھر انھوں نے سرخ سرخ آنکھوں سے رسیوں کو گھورا اور رسیاں آپ ہی آپ ٹوٹ گریں۔ آزاد ہوتے ہی انھوں نے ایک دوڑ لگائی اور سیدھے صحن کے بیچوں بیچ جا کھڑے ہوئے ـــ وہاں سے بھاگے تو بابا کے کمرے میں پہنچ کر رُکے۔ سفید چاندی ایسی چمکتی دیوار کے کونے میں منہ پھیر کر وہ بڑے کرب ناک انداز میں گانے لگے۔ ع ۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱)

آغاز

شہابی بی بی!

آپ لوگوں سے رخصت ہو کر میں بخیریت تمام پہنچ گیا۔ یہاں بھی اللہ کے حکم سے سب خوش اور بخیریت ہیں ـــ اور وہاں بھی یقین ہے کہ اللہ میاں کا فضل ہی فضل ہوگا۔

آپ نے کہا تھا کہ جاتے ہی خیریت کا خط ڈالنا ۔ تو آپ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ اور آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ سب حالات تفصیل وار تحریر کرنا تو وہ بھی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

(مجھے یقین ہے آپ نہایت ہی فرماں بردار قسم کے شوہر ثابت ہوں گے)

تو سنئے ۔ جب میں گاؤں کے اسٹیشن پر اترا تو مجھے لینے کے لئے دو چار نوکر مع بگھی کے آئے تھے ـــ میں اُن کے ساتھ گھر پہنچ گیا۔ وہاں آنگن میں تخت پر جانماز بچھائے دادی اماں نماز پڑھتی بیٹھی تھیں۔ گھر میں اور بھی دو سری عورتیں ہیں جنھیں میں تو نہیں پہچانتا۔ شائد بچپن میں کہیں دیکھا ہو تو دیکھا ہو۔ بھلا اتنے بچپن کی باتیں کسے یاد رہتی ہیں ـــ تو ان لوگوں کو میں نے

سلام ضرور کیا مگر پہچانا نہیں ___ اور بیٹھا انتظار کرنے لگا کہ کب دادی اماں کی نماز ختم ہوتی ہے
اس وقت دادی اماں سجدے میں تھیں ۔ میں سمجھا کہ اب شاید تھوڑی دیر میں سلام پھیر دیں گی مگر
وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوئیں ۔ تب مجھے پتہ چلا کہ نہیں اس وقت تک ان کی دو ہی رکعت نماز ہوئی تھی۔
مرتا کیا نہ کرتا ۔ اس انتظار میں سوکھنے لگا کہ کب وہ نماز ختم کرتی ہیں ۔

پھر دادی اماں نے سلام پھیرا ___ میں سمجھ رہا تھا اتنی دور سے آئے ہوئے پوتے سے ملنے
کے لئے وہ یونہی لپک پڑیں گی ۔ مگر معلوم ہوتا ہے دادی اماں دینی ارکان کی بہت پابند ہیں کہ انھوں
نے پوتے کی صورت بھی نہ دیکھی اور وظیفہ ہی کرتی رہیں ۔ تسبیح پھیرنی ختم ہوئی تو پھر دعا مانگنے لگیں
کوئی دس پندرہ منٹ دعا ہی مانگتی رہیں ، پھر سینے پر پھو پھا کر کے میری طرف مخاطب ہوئیں ۔

"اے بیٹا تم کب آئے گئے ___ ؟"

میں نے کہا " آپ نماز میں تھیں تبھی تو غلغلہ مچا تھا کہ چھوٹے نواب آئے ہیں ___
چھوٹے سرکار آئے ہیں ___ تب آپ کو پتہ نہ چلا ___ ؟

دادی اماں نے ذرا ڈر کر کہا ___ "ایسی باتاں نکو کر دبیٹا ۔ خدا کو یاد کرتے وقت بھلا
کس کا ہوش رہتا ہے ۔ ؟

تب تو شہابی بی بی میں مان گیا کہ واقعی دادی اماں بہت پکی نمازن اور دیندار خاتون ہیں ۔

پھر دادی اماں نے مجھے گلے لگا لیا ۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور بولیں ۔

"موئی کم بختو ۔ بچہ اتی دور سے آیا اور کسی نے چا ، پانی تک کو نئیں پوچھا ___ دادی اماں
کی کراری آواز سے ڈر کر سب چا ، پانی کے انتظام کو ادھر ادھر دوڑنے لگے ۔

"ہو میاں اماں کیسے ہیں ___ ؟" دادی اماں نے پوچھا ۔

" اور گورے پاشا کی شکر کے کیا حالاں ہیئں ؟"

(واہ بی شہابی آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں تھا کہ پاپا کو کتنی شکر آ رہی تھی ۔ میں نے دل سے
کہہ دیا ___)

"حکیم صاحب کا علاج چل رہا ہے نا ۔"

"اور دوسرے بہناں، بھائیاں، نندان، بھاوجاں ۔ یہ سب لوگ کیسے ہیں ۔؟"

"سبھی اچھے ہیں ۔"

دادی اماں نے ایک ایک کر کے سب کا حال پوچھ لیا۔ اتنے کے اتنے تخت پر چار پائی کا انتظام ہوگیا۔ اور میں منہ ہاتھ دھو کر چار پینے بیٹھ گیا ۔

اب سنئے بی شہابی ۔ دادی اماں تو چولھے کے پاس میرے کھانے کا انتظام کروانے گئی ہیں ۔ اور میں ہوں کہ آپ کو یاد کر رہا ہوں ۔ کیونکہ آپ سے وعدہ تھا ۔ میں نے دادی اماں سے کہا بھی کہ آپ فضول تکلیف نہ کریں ۔ مجھ سے بیٹھ کر باتیں کیجئے ۔" مگر وہ بولیں

"باتاں کرنے کو تو وقت پڑا ہے ۔ پہلے تو تمہارے واسطے کھانا پکواتیوں ۔"

اس وقت بڑی پھوپھی اماں حویلی میں نہیں ہیں ۔ کسی سے ملنے محلے میں گئی ہیں ۔ چھوٹی پھوپھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہیں ۔ کہتے ہیں وہ یہیں رہتی ہیں کیونکہ سنتے ہیں ان کے میاں نے رانڈ ڈال لی ہے ۔ پھر بھی ان کے میاں کو ان سے بڑی محبت ہے ۔ اس لئے وہ ہر دوسرے تیسرے دن چکر مارتے ہی ہیں کہ "چلو میرے ساتھ" مگر وہ سنیں تب نا ؛ ابھی سکینہ بوا اور کریم بی آپس ہی باتیں کر رہی تھیں ۔ میں نے سن کر آپ کو بھی لکھ دیں تاکہ پھر آپ کو یہ شکایت باقی نہ رہ جائے کہ دیکھو اسے کہا تھا تفصیل وار لکھنا اور کچھ نہیں لکھا ۔

دادی اماں اور بڑی پھوپھی عنقریب حیدر آباد آنے والی ہیں ۔ پھوپھی بی کہہ رہی تھیں کہ شہر میں رہتے رہتے وہیں کی عادت پڑ گئی ۔ اب گاؤں میں دل نہیں لگتا ۔ مگر اماں جان کی وجہ کیا بولیں ۔۔؟"

ایسا میرا خیال ہے کہ زمینات کی وصولی ہوتے ہی یہ لوگ آجائیں گے ۔ پھر تو وہاں خوب مزا آئے گا ۔

قبلہ والد صاحب کو میری جانب سے مودبانہ خادمانہ قدم بوسی ۔ اور آپ کے پاپا کو بھی قدم بوسی ۔ سراج آپا ۔ مریم آپا ۔ رضیہ بی بی ، سردار بھائی ، اختر ، کلیم ، علیم ، روشن ، عقیل ثمینہ ، بیگم پاشا ، خان بھائی وغیرہ کو سب کو میری طرف سے آداب پہنچے ۔ سب کو درجہ

بدرجہ داجبات اوراب آپ کو کیا لکھوں ۔؟

اور ہاں سنئے ۔ ماسٹر صاحب کو بھی میرا خط بتا دیجئے کہ کہیں اردو کی غلطی تو نہیں ہے املے وملے میں کوئی غلطی ہو تو مجھے آگاہ کردینا ۔

تازہ قلم :- پاپا یہاں کا احوال پوچھیں تو میری طرف سے یہ خط ہی انھیں بتا دینا ۔

ہمیشہ آپ کا خادم : وقار عرف جگنو میاں

یہ اوپر والا خط جگنو نے ہی لکھا تھا ۔ اور یہ خط بھی تو جگنو نے ہی لکھا ہے ۔

مائی ہنی !

Hearty Kisses "(کیوں میری اس ادا پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں شوبی ۔؟")

یہ تو میں خوب سمجھ رہا ہوں کہ تم اس وقت بُری طرح برہم ہو ! ڈیری ۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ تم سدا روٹھی رہو ؟ ادھر دیکھو ــــ میری طرف ۔ بس یوں چٹکی بجاتے میں تمہیں منالوں گا اف ! قسم ہے تمہاری یہ بھیگی پلکیں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں ۔ چلئے حضور مان لیا کہ بہت دنوں سے آپ کو خط نہیں لکھا ۔ مگر میری گڑیا یہ تو بتاؤ کہ محبت کا پیمانہ خط کہاں سے ہو گئے ۔ ؟ یہ تو دل میں رہتی ہے دل میں !

یقین جانو شوبی ۔ انگلینڈ کی یہ پرکیف شامیں ۔ کہر آلود راتیں ۔ اور مٹیالے دھند بھرے دنوں کا سارا حسن بھی تمہارا تصور دل سے محو نہیں کرسکتا ۔ جب سارا ماحول بھیگا بھیگا سا ہو جاتا ہے ۔ تو سچ جانو ، جانے کدھر سے میرے دل میں یہ خیال چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ کہیں شوبی کے آنسوؤں نے تو ماحول کو یہ گیلا گیلا لباس نہیں پہنا دیا ہے ۔ ؟

(بالکل شاعروں کی سی باتیں ہیں جگنو !)

پھر میں یہی کرسکتا ہوں کہ قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاؤں کہ اپنی ہنی کو یاد کروں ۔ مگر جانتی ہو نا کہ ایسا میں بار بار کر بھی نہیں سکتا ۔ مجھے فرصت بھی کہاں ملتی ہے ؟ بی اے کر کے مجھے ایم اے کرنا ہے ۔ لا کرنا ہے ۔ اور پھر بیرسٹر بننا ہے ۔ نام کمانا ہے ۔ اور یہ سب کچھ کس لئے ــــ ؟

اور پھر بھی تم ناراض رہتی ہو ___؟ یہاں کی مصروفیت ___ اف کچھ نہ پوچھو ___ یہ لندن ہے گڑیا۔
خداوندا ___ لندن ___ لندن ___ لندن ___ یہ شامت کا مارا بے چارہ لندن کس قدر مطعون کیا گیا ہے۔
حیدرآباد اور لندن میں کوئی فرق نہیں ہے ___ پاپا کبھی لندن گئے ___؟ پھر اُن کے صحن میں کھلنے
والے سفید گلابوں کے عارض سرخ کیوں پڑ گئے؟ کس کے خون سے ___ کس کی سُرخی سے ___ بتاؤ

پھر بھی تم ناراض ہی ہو ___ اچھا ___ تم مجھ سے اتنی خفا ہو کہ چہرے پر مسکراہٹ تک
نہیں ___ نہ مسکراؤ ___ لیکن یہ ضرور سمجھ لو کہ تمہارے چہرے پر ناراضگی کا یہ ہلکا سا بادل میری ساری زندگی
کو میرے وجود کو لپیٹ میں لے لیگا۔ دیکھو آج تم سے اچھی اچھی باتیں کرنی ہیں ___ لو تمہیں ایک
چیز سنائیں ___ پھر تو من جاؤگی نا ___؟

یہاں میرے ایک دوست ہیں لوئس مارٹن ___ انگریزی ادب کا بڑا گہرا ذوق رکھتے ہیں
اور جگہ جگہ سے پرانی دھرانی کتابیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکال لاتے ہیں ___ دیکھو شوبی ہم نے
شیکسپیئر کو پڑھا ___ کیٹس کو پڑھا ___ بائرن ___ ملٹن ___ ورڈز ورتھ بھی نظر سے گزرے مگر Praed
نام تو کبھی نہ پڑھا۔ (ہو سکتا ہے یہ ہمارے مطالعے کی کمی ہو!)

Winthrop Mackworth
انیسویں صدی کا یہ بڑا اچھا شاعر گزرا ہے۔ اس کا پورا نام
Praed ہے۔ لوئیس نے کہیں سے اس کی نظموں کا مجموعہ حاصل کیا ہے۔ بالکل بوسیدہ
جگہ جگہ سے پھٹا ہوا۔ ورق یوں گلے سڑے کہ صفحہ الٹیں تو کاغذ ہاتھ ہی میں رہ جائے۔ ہم
دونوں بڑی احتیاط سے اسے پڑھتے اور سر دھنا کرتے ہیں، کبھی کبھی تو میری آنکھیں سچ مچ بھیگ
بھیگ جاتی ہیں۔

تم مجھے یاد تو نہیں کرتیں نا ___ غصہ جو ہوا ___ اچھا سنو یہاں سے سات سمندر پار ___
کس قدر دور ___ تم ادھر بیٹھی ہو اور میں ادھر ___ جانے کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے مجھے کیوں خیال ستاتا
ہے کہ اب یہ آنکھیں ___ میری آنکھیں ___ کبھی ان آنکھوں کو نہ دیکھ سکیں گی ___ جن میں جگنو جھلملاتے
ہیں ___ (میں نہیں سچ مچ کے جگنو ___ (تمہاری آنکھیں ہیں ہی ایسی چمکدار)
تم مجھے خط لکھو ضرور ___ یاد کرو ضرور ___ طعنے سے ___ تشنیع سے ___ لعنت

ملامت سے یاد کرو ۔ مگر کرو تو ۔

اچھا دیکھو پریڈ کی یہ پیاری سی نظم تو سنو

Remember me in shine and showers
In sorrow and in glee;
When summer breathes upon the flowers
When winter blasts the tree.
When there are dances in the bowers
Or sails upon the sea.

Remember me beneath far skies
Or foreign lawn and lea
When other worship those wild eyes
Which I no more may see,
When other wake the melodies
Of which I mar the key.

Remember me my heart will claim
No love, no trust, from thee

Remember me through doubt and blame
Linked with the record be,

Remember me with scorn or shame
But yet remember me.

بارہا انگریزی اور اردو نظمیں پڑھتے پڑھتے میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم سبھوں کے دلوں میں جانے کے لئے کوئی نہ کوئی چور دروازہ ضرور ہوتا ہے ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ شاعر ہمارے دلوں کی بات یوں کھلے خزانے تحریر کردیں ؟ یہ کیسے چوری چھپے ہمارے دلوں کا حال جان جاتے ہیں ۔ شوبو ۔۔ ؟

اچھا بتاؤ ۔ تم اس خط کا جواب دوگی یا نہیں ۔۔ گویا احساس مجھے ضرور ہے کہ یہ خط میں نے پورے ساڑھے چار ماہ بعد لکھا ہے ۔ بہر حال میں تمہاری خوشنودی چاہتا ہوں، آخر کو ہم دونوں کو آگے چل کر دولہا دولہن بننا ہے ۔ (کیوں شرما گئیں نا ۔۔ ؟)

پاپا کو میرا پیار ۔

میرے چاہنے والوں کو میری نیک تمنائیں اور محبتیں ۔

ہمیشہ ہمیشہ تمہارا جگنو

شوبی کا جگنو (اگر وہ سمجھے تو)

ان دو خطوں میں کئی زمانوں کا فاصلہ حائل ہے ۔ اتنا فاصلہ دو چار ماہ کا تو ہوتا نہیں کہ حیدرآباد دکن کے نوابی محلوں میں پلا بڑھا لڑکا اپنی منگیتر کو شہابی بی بی ۔ بی شہابی کہتے کہتے "مائی ہنی" ۔ اور "ڈیری" کہنے لگے ۔۔۔ یہ تو تیرہ برسوں کی دیوار ہے اور تیرہ سال (ہمارے ایسے نوابی گھرانوں کے تیرہ سال !) کہیں سچ مچ تیرہ سالوں میں گزرا کرتے ہیں ۔۔ ؟ صدیاں گزر جاتی ہیں اور ایک سال کھسکنے نہیں پاتا ۔ جن ماہ و سال کے نازک پیروں میں غم و اندوہ کی وزنی پازیبیں چھنکتی ہوں وہ ہنستے مسکراتے رقص کر بھی کیسے سکتے ہیں ۔ قدم تو اٹھیں ۔۔ !

ہمارے ان گھرانوں کا بھی عجیب حال ہوتا ہے جہاں مغربی اور مشرقی تہذیب کو ملا جلا کر ایک نئی تہذیب بنا دی جاتی ہے ۔۔ میرا محل بھی تو ان سے الگ نہیں ۔۔ ورنہ کس نے سنا ہے کہ شہابی کی شادی تو جگنو سے ہونے والی ہو اور جگنو اسے سات سمندر پار سے خط لکھتا پھرے ۔۔ اور خط بھی کیسے خط کہ جس میں "مائی ہنی" لکھا ہو ۔ ہر ٹی کسس لکھا ہو

اتنی ترقی پسندی کے باوجود قدیم روایتیں گلے سے لپٹی چلی آتی ہیں ۔ اور بزرگوں کا کہا پتھر کی لکیر
میں جانتی ہوں جگنو کے اس خط میں سچائی کس حد تک ہے اور بناوٹ کتنی ۔ ہم اگر
یوں نہ کریں تو پھر کیا کریں ۔ ہماری زندگیاں تو یونہی بناوٹوں کے جال میں الجھی الجھی ہوتی ہیں ۔
ورنہ امی یوں کیسے مر جاتیں ۔ بابل کے آنگن میں لہک لہک کر ساون گانے والی اور بہن بھائیوں
سے بات بے بات مار کٹائی کرنے والی ، گلابی چہرے اور صندل کی ڈالوں ایسے ہاتھ پاؤں والی تندرست
لڑکی ، یوں چار چھ سال کے اندر ہی قبر میں کیسے سو جاتی ۔ یہ حیدرآباد دکن ہے ۔ نوابوں کی بستی ،
محلوں کی ۔ اونچی اونچی کوٹھیوں کی بستی ۔

مجھے یقین ہے جھونپڑیوں اور چار دیواریوں میں رہنے والے یقیناً ان اونچے اونچے
محلوں کی حرص کرتے ہوں گے ۔ مگر محلوں کے اندر جو آگ جلتی ہے اس کی تپش ، اس کی لپیٹ
انھوں نے کہاں دیکھی ہوگی ۔ انھیں کیا پتہ کہ یہ بڑی بڑی جگمگاتی اونچی دیواریں قید خانے
سے کم نہیں ۔ مگر ہم ایسے قیدی ہیں جن کی کلائیوں میں لوہے کی ہتھکڑیوں کی بجائے ہیروں
کے کنگن دمکتے ہیں ۔

پہلا خط ۔ دوسرا خط ۔ اور تیسرا خط ۔ ان تین خطوں کے بیچ کتنے فاصلے
ہیں ۔ کتنی دیواریں ہیں ۔

لیکن وہ تیسرا خط تو میں نے پڑھا ہی نہیں ۔ چاندی کی وزنی تھالی میں ہرے پیلے
سفید ، گلابی لفافے سجا کر لانے والی صنوبر نے وہ نیلا لفافہ اب تک مجھ تک نہیں پہنچایا ۔ جس
کے اندر ہلکا پھلکا نیلا کاغذ لپٹا ہوتا ہے ۔ جسے میں آنکھوں سے لگا کر دیکھتی ہوں تو ہوائی جہاز
بنے نظر آتے ہیں ۔

ہوائی ڈاک سے آنے والا وہ تیسرا خط ۔ اب تک نہیں آیا ۔ مگر آئے گا ضرور
آج نہیں کل ۔ کل نہیں پرسوں مگر آئے گا ضرور ۔ اتنی دیر میں میں خود ہی ایک داستان
رقم کر ڈالوں ۔

(اے دل تیرے بہلنے کا کچھ تو سامان ہو)

مگر مجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکے گا۔ اونچے اونچے محلوں میں پلنے والی ۔ گھٹنے۔ گھٹنے دھنسنے والے قالینوں پر چلنے والی، حریر و دیبا پہن پہن کر نوکروں پر حکم چلانے والی لڑکی سوائے اس بات کے اور کر بھی کیا سکتی ہے ۔ ؟

" پاپا ۔ مجھے ویسے ہی لال گاڑی چاہیئے جیسی زلیخا کے پاس ہے ۔"

"کیسی گاڑی بٹیا ۔ ؟"

"وہ ویسی نا پاپا جس میں ریڈیو بھی فٹ ہے ۔ ہاں پاپا کونونٹ میں سب لڑکیاں ہنسی اڑا رہی تھیں کہ دیکھو تو آصف الدولہ کی پوتی ۔ ظہیر یار جنگ کی بیٹی اور گاڑی چھ ماہ پرانی"

"ہو ہو۔ ہم دلا دیں گے تم فکر نکو کرو ۔"

آپا بول اٹھتی ۔

"ہو پاشا تم کاٹے کو اپنا جی جلاتیں ۔ دیکھ لینا سرکار اٹھتے کے سنگا پچ کسی کو بھیجتیں پھر اسی میں بیٹھ کے کو آنا جانا ۔"

"ہو ہو۔ ایسا پچ ہوگا ۔ پن بٹیا تم نے آج عربی خانئہ پڑھے کہ نئیں ۔ ؟ مولوی صاحب بول رہے تھے کہ تم بہت ڈٹے مارتیں۔ اٹھ اٹھ کو بھاگ جاتیں ۔ یہ باتاں اچھے ۔ نئیں نا بٹیا ۔ وہ شعر تم کو یاد ہے کہ نہیں ۔ ۔ ؟"

پھر پاپا وہ گھسا پٹا شعر سنانا شروع کر دیتے ۔ جس کے معنی مطالب یہی کچھ تھے ۔ "پڑھیں گے لکھیں گے ۔ اچھی اچھی عادتیں سیکھیں گے ۔ تو نواب بنیں گے ۔ ورنہ کھیل کود کر تو بس خراب ہی بن جائیں گے ۔"

(نواب بننا بھی کس قدر ضروری ہے ۔)

میرا کوئی حصہ دار نہ تھا ۔ پاپا کی محبت کی واحد مرکز بس میں ہی تھی ۔ لاکھ کام کاج ہوں وہ میری خبر ضرور لیتے ۔ میرے سونے جاگنے ۔ اٹھنے بیٹھنے ۔ پڑھنے لکھنے ۔ کھانے پینے ۔ کھیلنے کودنے ۔ ہر ہر کام سے انھیں دلچسپی تھی

صبح ناشتے کی میز پر انڈے پر نمک سیاہ مرچ بعد کو چھڑکتے، پہلے یہی پوچھتے :-

"بٹیا کا ماسٹر آیا کہ نئیں ـ ؟"

"کون سا ماسٹر ـ ؟" آپا پوچھتی

اُدھر جگنو میاں انگلینڈ بھجوا دیئے گئے تھے تو پاپا کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ ان کی بیٹی داماد کے آگے کسی بات میں ہیٹی نہ پڑے ـ انگریزی، اردو، عربی، فارسی کے سارے ماسٹر اپنے اپنے وقت پر آتے اور جاتے، پڑھاتے چاہے جو کچھ ہوں، مگر مہینے کے ختم پر اپنی جیبیں وزنی لے جاتے ـ

"ارے وہی اردو پڑھانے والا ـ یوپی کا ماسٹر ـ"

کونونٹ میں ہمارے ساتھ ایک لڑکی پڑھتی تھی ـ دلی سے آئی تھی ـ جانے کس کے پاس رہتی تھی حیدرآباد کی ساری لڑکیاں ٹکر ٹکر اس کا منہ تکا کرتیں ـ بات کرتی تو یوں جیسے منہ سے ادھ کھلی کلیاں ٹپک رہی ہوں ـ ہم میں سے کسی کو کلاس کے باہر جانا ہوتا تو ایک دوسری سے پوچھتیں ـ "تم کاں جارئیں کی ـ ؟"

وہ اپنے شہد بھرے لہجے میں پوچھتی ـ "آپ کہاں جا رہی ہیں ـ؟" یا ـ "آپ کہاں جایئے گا ـ ؟"

(ایک دن اس نے بڑی نرمی سے کہا تھا :" شہابی! حیرت ہے ہماری مادری زبان تو اُردو ہو اور ہم یوں غلط سلط اردو کہا کریں ـ)"

یوپی والے ماسٹر صاحب غلط زبانی پر بار بار ٹوکتے ـ ق کو قاف کہنا میں نے کتنے دنوں بعد سیکھا ورنہ وہی منہ پر قدم کی جگہ خدم اور قیامت کی جگہ خیامت چلی آتی تھی!

اتنے بڑے بھرے پُرے محل میں میں خود کو کیسی اجنبی اجنبی تنہا تنہا سی لگتی ـ یوں جیسے، کہیں سے مہمان آئی ہوں ـ

"تنہائی کہاں ہوتی ہے ـ ؟"

"تنہائی وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی نہیں ہوتا ـ"

"پھر تم تنہا کیسے ہوئیں ـ تمہارے دل کے آس پاس، تمہارے دل میں ـ تمہاری آنکھوں میں ـ تمہاری دھڑکن دھڑکن میں جگنو چھپا ہوا ہے نا ـ پھر تنہائی کیسی ـ ؟

تمہاری آنکھوں میں دم بدم کوندے سے لپکتے ہیں۔ یہ چمک کیسی ہے ۔؟ کہیں تنہائیاں یوں جگمگایا کرتی ہیں ۔ ؟"

(اپنے دل کی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ۔")

(۲)

"بھنورا"

میاں آصف الدولہ نے سہرے تو رے سے تو ایک ہی کو بیاہ کر محل آباد کیا تھا ۔ مگر ان کی جوانی کا بھوت ایک سے کیا قابو میں آتا ؟ شادی تو لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہوئی تھی ۔ دو تین چار، پانچ، کوئی حد نہ حساب ۔ ہر رات ان کے لئے نئی سیج سجتی ۔ جس گاؤں میں جاگیر وصول کرنے جاتے وہیں ایک محل آباد ہو جاتا ۔ کیا جی دار جوان تھے ۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔ عورتوں کے ایسے لوبھی تھے کہ اپنا آپا بھول بیٹھتے ۔

بڑی بیگم کے مائکے سے پائینچے سنبھالنے کے لئے ایک لونڈیا بھی آئی تھی ۔ کمخواب اطلس ہمرو، اور مشجر کے بھڑکیلے اور وزن دار جوڑے چکلے پائینچے، بھلا بڑی حضور سے کیا سنبھلتے، آگے وہ چلتیں تو پیچھے پیچھے یہ پائینچے اُٹھائے اُٹھائے چلا کرتی کہ قالینوں پر گھسٹ گھسٹ کر اپنی آب نہ کھو دیں ۔ پھر چولی کرتی پر کی کامدار اکلابتیاں ہوا کرتیں ۔ سیروں ٹھپہ گوٹا ٹکے کھڑے دوپٹے ہوا کرتے ان کا وزن تو اور بھی سوا ہوتا ۔

سب کل ملا کر گیارہ باندیاں تو محض بڑی حضور کے ساتھ تھیں ۔

(۱) پاندان سنبھالنے والی

(۲) پائینچے سنبھالنے والی

(۳) نہلانے والی

(۴) کپڑے بدلوانے والی

(۵) کنگھی کرنے والی

(۶) پاؤں دبانے والی

(۷) سیج سجانے والی

(۸) پاخانے میں پانی کا لوٹا رکھنے والی

(۹) رات کو سرہانے دروازے پر جاگنے والی

(۱۰) سندلیسہ بردار ۔ اس کا کام یہی ہوتا تھا کہ نواب صاحب مردانے میں ہوں تو کام پڑنے پر بلوائے جائیں ۔ اور پھر گلاب یونہی چلی آئی کہ ممکن ہے وقت کی بات ہے کوئی کام ہی پڑ جائے

گیارہ پھول تھے، اور سبھی کی خوشبو بڑے حضور نے سونگھی ۔ ہر موسم کی الگ الگ بیوی ہوتی ۔ موسم بہار کی ۔ موسم گرما کی، موسم سرما کی، موسم بارش کی، موسم خزاں کی ۔ کتنے موسم اور کتنی سیجیں ۔؟

خود آصف الدولہ کے والد ماجد کھلی آنکھوں دیکھا کئے ۔ کبھی کچھ نہ کہا ۔ کہتے بھی کیا والدہ صاحبہ بھی کہتیں اور خود یہ بھی کہا کرتے ۔

"لڑکوں کے "کھیلنے" کے دن ہیں ۔"

اب لڑکے کھیلتے بھی نہ تو کرتے کیا بیچارے ۔؟

کہتے ہیں آصف الدولہ ایک دن اپنی سسرال گئے، چمن میں کھڑے چنبیلی گلاب کی بہار کا مزا لوٹتے تھے کہ مالی مالن بھاگتے ہوئے آئے ۔ مالن ہو گی یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال کی اور مالی چوبیس پچیس کے پیٹے میں ۔ سرکار کنیر کی آڑ میں تھے ۔ مالی مالن تو ان کو نہ دیکھ سکیں اور یہ انھیں دیکھیں ۔

دونوں جھارے سے پانی دیتے چلے آتے تھے ۔ مالی نے مالن کے ہاتھ سے جھارا چھینا اور زندہ گلاب کو پانی دینے لگا ۔ جھر جھر ۔ جھر جھر ۔

پتلی پتلی چولی میں سے کہ پہلے ہی جسم کی گلابیاں جھلک رہی تھیں، پانی پڑا نہیں کہ ایکدم سے چولی جیسے غائب ہوگئی ۔ کہاں کا پانی، کہاں کی دھار ۔ بس مالن تھی کہ ایک گلابی پتھر کا

مجسمہ کھڑا تھا ۔ چھدری چھدری ساڑی جسم کا حصہ ہو کر جسم ہی سے چپک گئی ۔ یوں کہ ہے کہ نہیں ہے ۔ تھرکتی پنڈلیاں ساکت ہو گئیں ۔ سفید سفید بازو عریاں ہو گئے ۔ چپے چپے پر چراغ جل اٹھے ۔۔۔ آدھی پیٹھ کی چولی میں پہلے ہی جسم کیا ڈھکا چھپا تھا کہ ناف سے لے کر گردن تک گلابیاں ہی گلابیاں چمک اٹھیں ۔

گلابی گلابی انگلیاں سیدھے سینے کے گرد پہنچ گئیں کہ ان سفید سفید کبوتروں کو چھپا لیں جن کی سرخ سرخ چونچیں آگے بڑھ بڑھ کر سرکشی پر آمادہ ہو رہی تھیں ۔

مالی نے جھارا پٹخا اور اسے گود میں اٹھا لیا

"کیا بات ہے مولی خم ۔"

"چل دور موئے ۔ دل لگی نکو کر میرے سنگات

"نکو ۔۔ ؟" مالی شرارت سے بولا

نکو ۔ نکو ۔۔ نکو ۔ " اور وہ روش روش جلتے چراغ لئے دوڑنے لگی ۔

روشنیوں کا مینار مالی کی گود میں کانپ رہا تھا ۔

"تیرے سنگات نئیں تو پھر کون کے سنگات کر دل لگا رے دل لگی ۔۔ ؟"

ادھر مالی نے مالن کو چک پھیری دی ادھر حضور کا دل اپنی جگہ سے اڑا ۔

مالی نے تو کہتے ہیں تیسرے ہی دن "حسین ساگر" میں جا کر اپنی جان دے دی ۔ ایک تو بیوی سے اسے محبت بڑی تھی اور دوسرے اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ جس پھول کو کلیجے سے لگائے لگائے رکھا وہ کسی اور کی سیج پر بکس بکس جائے ۔

بات تو معمولی سی تھی ۔ مگر مالی کی خودکشی نے اس میں رنگ بھر دیا ۔ محلوں میں بوم بوم ہو گئی کہ ذرا حضور کو دیکھو کہ حرم کو مرغیوں کا ڈربہ بنا رکھا ہے ۔ اس پر بھی بس نہ ہوا تو مالن کو اٹھا لائے اور کیسے لائے کہ مالی کی جان ہی واری گئی ۔"

اس دن کے بعد سے سب یہ سمجھ رہے تھے ۔ اور خصوصیت سے بڑے دادا حضرت ۔ کہ اب آصف الدولہ کی سیج پر باغیچہ کا سب سے تر و تازہ گلاب کھلا پڑا ہے ، وہ مطمئن ہو جائیں گے ۔۔۔

اور اب بڑی بہو بیگم کی چھاتی پر مونگ نہیں دلی جائیگی ۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد تازہ پھول بھی اپنی بو باس کھو بیٹھا
اب کے سے آصف میاں کی نگاہیں اپنے رشتوں کی سالی سے جا ٹکرائیں ۔ ظہیر یار جنگ کے
ختنے کا بھرپور ہنگامہ تھا ۔ محل میں خوب شاٹ بوٹ ہو رہی تھی ۔ جب ختنے کے دولہے گورے پاشا
(ظہیر یار جنگ) کی ہتھیلی بھری جانے لگی تو اشرفیوں اور سفید سفید روپوں کی بارش ہونے لگی ۔
اتنے میں ایک سانولی سی لڑکی آئی ۔ بھڑکیلے جوڑوں کے سامنے اس کا ہلکا جوڑا الگ پھوٹ
نکلا ۔ کہاں تو کار چوب کا ملانی ۔ جھم جھم کرتے دوپٹے ۔ چمکیاں ستارے لگے کرتے ۔ اور یہ سادے
پھلور کے کرتے پاجامے ، کھڑیئے ۔ دوپٹے میں اوڑھی لپٹی ۔ ! ہلکے نیلے رنگ کے دوپٹے کے پلو
سے خواہ مخواہ ناک رگڑتی ۔ بس یوں کہ اتنی ساری بیبیوں سے جھینپ مٹانا اور منہ چھپانا مقصود تھا
۔ آئی ۔ اور جلدی سے ہتھیلی پر خالی پانچ روپے ٹکا کر بولی

"یہ روپے امی نے بھجوائے ہیں ۔"

دوپٹے کی رگڑ سے وہ پتلی سی ناک سرخ سرخ پڑ گئی ۔ روپوں کے گرتے آبشار میں پانچ روپوں
کو کون پوچھنے چلا تھا ۔ مگر اس اونچی اونچی لال لال ناک پر مسند پر بیٹھے ہی بیٹھے آصف الدولہ کی
نظر پڑ گئی ۔

سرخیوں اور گلابیوں کے دلدادہ تو تھے ہی ۔ چاہے وہ گالوں کی گلابیاں ہوں یا بازوؤں
کی ۔ چنچل کبوتروں کی سرخیاں ہوں یا رگڑ سے کھائی ناک کی ۔

ڈھول تاشے بجے اور دادی اماں پر برابری کی دعوے دار سوکن آ گئیں ۔ (بوا اپنا سفید
ہلتا ہوا سر لئے لئے ساری باتیں یوں سناتیں کہ باقاعدہ آنکھوں میں نقشہ گھوم جاتا)

دادا ابا کو کل پانچ اولادیں ہوئیں ۔ پہلی بی بی سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ۔ اور آخر میں
چھوٹی دادی سے ایک بیٹا ہوا ۔ جانے کس مناسبت سے ہم سب انھیں تایا میاں کہتے ۔ شاید
یہ بات ہو کہ دیکھنے میں اونچے پورے ۔ انتہائی وجیہہ ۔ اور اپنے بڑے بھائیوں سے بھی بڑے
نظر آتے ۔

تایا میاں ایسے لڑتے پڑتے کاہے کو گنے جاتے ، اچھی شریف ماں کے بیٹے تھے اور ماں

بھی کیسی کہ محلات کی ساری بیگموں کے مقابل پڑھی لکھی ۔ گن ڈھنگ میں سب سے بڑھی چڑھی ۔ تایا میاں کے نانا ادھر حیدر آباد میں چند سال ہوئے آ بسے تھے ۔ ورنہ وہ تو ادھر دلی میں رہتے تھے ۔ مگر غریبی کا جو کلنک تایا میاں کے ماتھے سے لگا تھا اسے بھلا کون مٹاتا ۔ ؟

ہوا یوں تھا کہ کسی معمولی بات پر ناراض ہو کر دادا میاں نے تایا میاں کو جائداد سے عاق کر دیا تھا ۔ اور اب دن گزرنے پر تو سب ہی بولتے تھے کہ بات وات کچھ بھی نہ تھی ۔ در اصل غریب گھر کی بیٹی اٹھا کر ایک تو دادا میاں یوں ہی لتاڑے جا رہے تھے ۔ پھر اللہ کی دین سے دو چار پھل بھی پہلے ہی پک گئے تھے ۔ جائیداد کا بٹوارہ ہی ہوئے جاتا تو ایک ایک کے حصے میں کیا رہ جاتا اور بٹیا یہ بات تو ایچ تھی ۔ اون بڑے سرکار کیسا غصہ ہوئیں نہ پتہ ۔ دلی والی بیگم کو بیاہنے سے پہلے بس اون بڑی بیگم بول دیئے تھے کہ کبھی اولاد ہوئی بھی تو میں حصے دارنیں بننے دیوں گی ۔ " تم کو عاخ کرنا پڑیں گا ۔" جوانی کا بھوت تھا سر پہ ۔ دلی والی بیگم کو کرنے کی تو ٹھان کر بیٹھے ریئے تھے ۔ سو بولے کہ " ہو جیسا تمے بولیں ویسا ایچ کروں گا ۔"

چپ چار لوگوں میں ناراض ہو کر عاخ کر دیئں ۔ وہ تو پہلے سے سو بٹے کر کو بیٹھے تھے لے دے کے جائیداد کے وارث بس دو ہی دو بھائی ٹھہرے ۔ بی شہابی کے ابا ۔ جگنو میاں کے ابا ۔ بیٹیوں کا کیا ہے ۔ جہیز دے دیا ۔ دامادوں کو گھوڑا چڑھائی اور جوڑے کا روپیہ دے دیا ۔ قصہ ختم ۔

کہیں یوں قصے ختم ہوا کرتے ہیں ۔ ؟

(۳)
"قصر دلپذیر"

کہیں یوں قصے ختم ہوا کرتے ہیں ۔ ؟

اور پھر محلوں کے قصے تو یوں بھی طول طویل ہوا کرتے ہیں ۔ اور محل بھی قصر دلپذیر؟ میں اپنے محل کا نقشہ کھینچوں تو مجھ پر الزام لگے گا کہ یہ تو پریوں کے دیش والے محلوں

کا ذکر لے بیٹھی ہے۔

اونچی اونچی دیواریں ۔ سفید سفید صحن میں ابرق چمکی ہوئی ۔ اندر بڑے بڑے دالان ۔صحن، ۔ پھر جدید وضع کے بنوفیشن ڈرائنگ روم ۔ ڈنگ روم ۔ کہیں چاندنیاں ۔ تو کہیں میز کرسیاں، جھاڑ جھنڈولے ۔ چراغ فانوس ۔ قدم روک دینے والے مجسمے۔ کہیں تیر سنبھالے کیوپڈ کھڑا ہے تو کہیں سائیکی ۔ یہاں سر جھکائے بی بی مریم کھڑی ہیں تو سامنے ہی حضرت عیسیٰ پھانسی پر لٹکے ہوئے ہیں۔

خوش نما پردے ۔ کہیں پتلے پتلے ریشم کے ۔ کہیں چمکدار بھڑکیلے۔ یوں کہ ان پر سورج کی کرنیں پڑنے لگیں تو ایک چھوڑ ہزار ہزار سورج اسی جگہ جگمگانے لگیں۔

قالین یوں کہ اندر ہی اندر پاؤں دھنستے جائیں ۔ صوفے ایسے کہ بیٹھیے تو پہلے ایک غوطہ کھائیے ۔ پھر صوفے کی سطح پر نمودار ہونے کی نوبت آئے ۔ دیواروں میں ہر طرف اتنے بڑے بڑے قدِ آدم آئینے لگے ہوئے کہ کمرے میں داخل ہونے پر ہر طرف سے آپ خود کو اپنا ہی خیر مقدم کرتے ہوئے پائیں۔

فرش کہیں رنگین ۔ کہیں سفید اور کہیں ملوان ۔ ۔ یوں چکنے کہ چلتے میں بار بار لپک لپک جانے کا خدشہ لاحق ۔ یہ بڑے بڑے ڈرائنگ روم ۔ یہاں بیٹھ کر جوش جگر فیض کی شاعری پر بحثیں ہوتی ہیں۔ اقبال، غالب اور میر کے اشعار پر بیت بازیاں کی جاتی ہیں ۔ نئے لکھنے والوں کے افسانوں پر تبصرے ہوتے ہیں۔ عصمت کو اچھالا جاتا ہے۔ کرشن کو گرایا جاتا ہے ۔ لڑکیاں عورتوں کی طرفدار اور لڑکے مردوں کے طرفدار۔ رنگین پیڈ منگائے جاتے ہیں ۔ ادیبوں اور شاعروں کو خط لکھے جاتے ہیں۔

" ہاں ہاں ندیم بھی اپنے ڈھنگ میں خوب لکھتے ہیں مگر عصمت کی بات کہاں "

" عصمت میں کیا دھرا ہے ۔ افوہ عورت ہیں ہول کے اتی لعنت مل رہی "

اور یہاں فضل بھائی کی انگریز بیوی آتی ہیں Sleeve le. بلاؤز پہن کر ساری لڑکیوں کو وہ امریکی لوشن استعمال کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ جس سے بال گھونگھر والے

ہوتے ہیں۔

(گارنٹیڈ ۔ ایک بار لگانے سے چھ ماہ تک بالوں کے کرلس غائب نہیں ہوتے۔
جو سراج آپا، اور مریم آپا کے کانوں میں چپکے چپکے باتیں کرتی ہیں۔

"حسن کو دوبالا کرنے کے لئے برلیسیر پہننی چاہیئے ۔ تمہاری یہ باڈیاں ۔ جو مغلانیاں سیتی ہیں ۔ ہش ۔ وہاٹ نان سنس ۔"

ہمیں انگلش پڑھانے والی مس ڈی کاسٹا ۔ جو سگریٹ پینے میں بری طرح ماہر ہے ۔ حلقہ در حلقہ ایسے گول گول دائرے چھوڑتی ہے کہ زنجیر سی بنتی چلی جائے ۔ محل کے نوجوان لڑکوں کو سگریٹ پینے پر اسی نے راغب کیا ہے ۔ (مگر افضل بھائی کی مسز کا ہاتھ بہت زیادہ ہے)
یہاں محل کی چار دیواری میں کس شان سے کرسمس منائی جاتی ہے ۔ پاپا کے کتنے سارے دوست ہیں ۔ انکل گریگ جو فادر گریگ بھی کہلاتے ہیں ۔) وہ بڑے پیار سے جھک کر مجھ سے پوچھتے ہیں ۔ "ہاؤ آر یو ۔ ؟"

ابھی ابھی جگنو کہیں نہ کہیں سے لپکتا ہوا میرے پاس آئے گا ۔ لمبے لمبے بالوں کو بڑے اسٹائل سے جھٹکے دیتا ہوا۔

(ہاؤ اسٹائلش "۔ مس ڈی کاسٹا دھیرے سے کہتی ہے۔) میرے ہاتھ تھام کر کہے گا
"محل میں کس قدر رونقیں ہیں شوبی ۔ زندگی کا اصل لطف تو یہیں اسی کنج میں ہے ۔ سوچتا ہوں ۔ یہاں کے مقابلے میں لندن میں کیا دھرا ہے ۔ بوگس ۔ کچھ بھی نہیں ۔ پش ۔
ہم سب نے فارسی پڑھی ہے ۔ جگنو دھیرے سے گنگنا رہا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

" انکل تمہیں پوچھ رہے ہیں ۔ چلو ۔ اٹھو ۔ اونہہ ۔ تم سے جلدی جلدی کیوں نہیں چلا جاتا ۔"

اُف ۔ جگنو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے ۔ یہ کیسی خوشی ہے ؟"

"جگنو لندن رہ کر کتنا "ڈگنی فائیڈ" ہو گیا ہے۔"

"ہی از کوائٹ گریس فل جسٹ لائک ہز انکل"

گریس فل انکل ۔ تایا میاں ۔؟

یہ جگنو کہتا ہے کہ فردوس اگر دنیا میں کہیں ہے تو بس یہیں ہے اور تایا میاں کیا کہتے ہیں ؟

ان سب عیشوں میں تایا میاں کا کوئی حصہ تھا نہ حق ۔ تائی بی ۔ یعنی دلی والی دادی اماں کی بہو ۔ ہمارے محل کے احاطے میں ہی رہتی تھیں ۔ مگر ہم سے دور ۔ ہماری نشستوں سے دور ان کا سایہ بھی ہم پر نہ پڑے ۔ محل کا نام "قصر دلپذیر تھا ۔

تائی بی کے حق میں تو یہ اچھا خاصا قصرِ "دل شکن" رہا ہوگا۔

نہ تائی بی کو ایسے دکھ سہنے کی عادت ہی تھی نہ ان سے اٹھائے ہی گئے ۔ چپ چاپ بغیر کسی سے کہے سنے سہاگ کی لال چادر اوڑھ کر نومن مٹی کے نیچے جا سوئیں ۔

تایا میاں کا قصور تو بس اتنا ہی تھا کہ غریب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ۔ باپ تو نواب ہی تھے مگر لگائی بجھائی کرنے والوں نے دل بھر کے توڑ جوڑ کئے ۔ اور باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم کہائے ۔ اور محل کے ہوتے بھی فقیر رہے ۔

تائی بی نے ساتھ کیا چھوڑا، اُن سے تو دنیا ہی روٹھ گئی ۔ پڑے رہتے ۔ نہ کھانے سے دھیان ہے نہ پینے سے ۔ ہنس رہے ہیں تو ہنسی سے ہی فرصت نہیں ملتی ۔ رونے پر آئے تو آنکھیں سرخ کبوتر ہو رہی ہیں ۔ مگر آنسو رکتے نہیں ۔ پھر بعد میں یہ ہوا کہ کھانا پینا اکدم سے ترک کردیا ۔ دن دن بھر قرآن شریف کی آیتیں زبانی پڑھ رہے ہیں ۔ نہ سر پہ ٹوپی نہ جسم پہ قمیص اور بغیر وضو کئے قرآن شریف لے کر بیٹھ گئے ۔ نہ یہ دھیان کہ قبلہ کدھر ہے ۔ نہ یہ کہ محل والی مسجد کو پائینتی پڑ رہی ہے ۔ بس روانی سے قرآن شریف پڑھے جا رہے ہیں ۔ اور سینے پر دم کرتے جا رہے ہیں ۔

گھر میں سب ان سے ڈرتے مگر وہ کسی کو نہ ڈراتے ۔ بچے نزدیک جا کر جان بوجھ کر چھیڑتے ۔ سدا چپ رہتے ۔ اگر کسی نے بہت چھیڑ دیا تو ہنس دیتے اور ایک آدھ پتھر

اُٹھا کر دے مارتے۔ ــ پھر علی بخش رسیاں باندھ کر کونے میں بٹھا دیتا ــ نہلا کر کپڑے پہناتا تو کپڑے پھاڑ ڈالتے ــ رسیاں تڑا تڑا کر بھاگنا شروع کر دیتے ــ کبھی ایسے میں شاجے سامنے آجاتا تو بس ٹھونٹھ بنے کھڑے رہ جاتے ــ اُجڑے گھر کا یہی اک دیا تھا۔ جس سے ان کی روح کے اندھیروں میں تھوڑی بہت، روشنی جھلملاتی تھی۔ جس کے سر پر ماں تھیں نہ باپ ہی حواسوں میں تھے۔ دو دو چچا تھے، پھوپھیاں تھیں۔ اور ان کی ڈھیر ساری اولادیں۔ مگر کس کو فرصت تھی کہ دو گھڑی بٹھا کر پوچھ لیتا۔

"کیوں میاں شاہجہاں تمہارے منہ میں کتنے دانت ہوتے ہیں۔؟"

یہ بھی خدا کی قدرت، کہ کہاں تو شاجے میاں کی قسمت میں جوتیاں چٹخانا اور بہن بھائیوں کی جھڑکیاں کھانا بدا تھا۔ اور ماں باپ نے بڑے چاؤ اور دلار سے نام رکھا تھا شاہجہاں!

اب تو سب انھیں بادشاہ سلامت، بادشاہ سلامت کہہ کہہ کر چھیڑا کرتے۔ ــ کبھی اپنی تنگ ترس کوٹھری سے نکل کر ادھر قصرِ دلپذیر میں قدم دھرتے تو بچے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔

"بادشاہ سلامت محل میں تشریف لاتے ہیں۔ خبردار ــ ہوشیار

پاپا نے ترس کھایا اور نام لکھوا دیا۔ نااہلوں کی اولاد تو جہاں کی تہاں رہی۔ شاجے بی۔ اے بھی پاس ہو گیا ــ مجھے یاد ہے شاجے جس دن اخبار لئے گھر آیا وہاں تاما میاں نہ تھے ــ سیدھا محل کو لپکا آیا ــ چلا کر بولا "ابا میاں میں کامیاب ہو گیا ہوں ــ"

تایا میاں نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں ــ بس بیٹھے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا کئے۔ پھر بڑی نرمی سے بولے ــ "نصرٌ من اللہ وفتحٌ قریب ــ" اور پھر زور زور سے قرآن شریف پڑھنے لگے

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ تایا میاں مجذوب ہو گئے ــ جو کہتے پورا ہو جاتا ــ انور بھائی کی شادی ہونے والی تھی، پھوپھی اماں کے سب سے بڑے بیٹے ــ شادی بیاہ کی رونق دیکھنی ہو تو، ذرا قصرِ دلپذیر میں جھانک دیجئے ــ یہاں آ کر ــ رات دن میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے آنکھیں چکرا جائیں گی۔ کہ اُدھر آسمان پر تو سارے ــ رات ہے ــ اور یہاں زمین پر سورج

شادی کے ہنگامے اپنے عروج پر تھے کہ ایک دن قرآن پڑھتے میں تایا میاں نے آنکھیں ترچھی کرکے صحن میں کھلے موتیا کے پھولوں کو دیکھ کر کہا۔

"انور دولہا بنے گا ۔ ہاں دولہا بنے گا۔ مگر اس کے سر کو نہیں اس کے کھاٹ کو سہرا بندھے گا"

پھوپھی اماں کو بڑا غصہ آیا، بھرے گھر میں ایسا کلمۂ بدمنہ سے نکال رہے ہیں۔ علی بخش سے بولیں ۔ "اجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ ۔ میرے جوان بچے کو کوس لے رئیں۔ ادھر نوکر خانے میں بند کو آجا ۔"

شادی میں دو تین دن رہ گئے ۔ باجے گاجے بھی ہو چکے تھے ۔ رت جگے اور مہندیاں ملدیاں ہوتی ہی تھیں کہ انور بھائی یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے سدھار گئے ۔ جو سہرا سر کو بندھنا تھا وہ جنازے کو بندھا۔ علی بخش نے تو تایا میاں کو نوکر خانے کی کوٹھری میں باندھ دیا ۔ مگر سبھوں نے دیکھا کہ وہ پھر دالان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

علی بخش قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا "حضور میں آپ کے پاؤں پڑ کو بولتا ؤں کریں نے خود ان کو باندھا تھا۔

پھر تو یہ ہو گیا کہ جو تایا میاں نے کہہ دیا ۔ بس کہہ دیا ۔ کیا مجال جو ان کی کہی بات پوری نہ ہو۔ اچھی بھی باتیں کہتے بُری بھی ۔ سب جیسے ان کے وجود سے لرزنے لگے ۔ رسیاں بندھوا کر انھیں دور بیٹھا دیتے تو یوں اُٹھ کر چلے آتے جیسے ہاتھ پاؤں میں موٹی موٹی رسیاں نہ ہوں، ہلکے پھلکے پھولوں کے گجرے ہوں۔

(۴)

"میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے ۔"

مجھے جگنو کے خط کا جواب دینا ہے ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں ؛ بُری بھلی بات لکھ دی تو منہ پھلائیں گے جناب! اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خط لکھوں ہی نا۔

راتیں خنک ہیں اور شامیں ٹھنڈی ٹھنڈی ۔ کچھ عجیب سی امنگیں دل میں لہرایا کرتی ہیں مگر

تنہائی ۔۔؟؟ اس قدر ہجوم کے باوجود کیسی تنہائی ہے ۔۔ بھلا جگنو مجھے یاد کرتا ہوگا ۔۔ لندن تو مقناطیس ہے ۔۔ جسے اپنی طرف کھینچ لے پھر نہیں چھوڑتا ۔۔۔ برف کی سی بنی ہوئی سفید سفید گڑیوں میں اُسے بھلا شہابی یاد آتی ہوگی ۔۔ ؟

خط کے آخر میں میں نے یہ بھی لکھ دیا ہے ۔

تم تو اتنے مہینوں سے وہاں ہو جگنو ۔۔ کیا اس محل کی یاد نہیں آتی جو تمہارے بنے جنت سے بڑھ کر ہے ۔ ؟ آتی ہوگی مگر تم خود آنا نہیں چاہتے ۔۔ کوئی موقع دیکھو اور وقت ملے تو چار آٹھ دن کے لئے ہی چلے آؤ ۔۔ ہوا پر آتے ہو ، ہوا پر جاتے ہو ۔۔ بھلا کیا رکاوٹ ہے تمہیں؟

انکل گرنگ ۔ جین اسموکر (افضل بھابھی) اور پھر مس ڈی کاسٹا (اف وہ تمہارے گریس سے کس قدر متاثر ہے !) سب اب کی کرسمس پر تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں ۔ اور پھر ادھر سراج آپا ۔۔ مریم آپا ۔ کلیم ، عقیل (اب کتنے ساروں کے نام لوں) یہ سب چاہتے ہیں کہ تم ضرور آؤ عید تو تم کبھی ہمارے ساتھ کرتے ہی نہیں ۔ شمو کی کن چھیدن کی تقریب ہی سہی ۔۔ (کوئی تو ہنگامہ ہو آخر) تو میں انتظار دیکھوں تمہارا ۔۔۔ ؟

ساری تفصیل تو میں نے اوپر ہی لکھ دی ہے ۔ ایک بات ابھی ابھی یاد آئی ہے ۔ شاہجے نے بی ۔ اے کر لیا ہے اور ہاں اب تو وہ مزے میں شاعری بھی کرنے لگا ہے ۔ تم آؤ تو اس سے نظمیں سنیں گے ۔۔ مزا رہے گا ۔۔ بگلا رات رات بھر حوض کے کنارے بیٹھا بیٹھا شعر کہا کرتا ہے ۔

تم کوئی اچھی کتاب پڑھو تو مجھے بھی لکھنا ۔ یا خود ہی لیتے آنا ۔۔ تمہارا ذوق شوق دیکھ دیکھ کر میری بھی حرص بڑھتی ہے ۔ پریڈ کی کوئی اچھی سی نظم اور بھی بھجوانا ۔

اور ہاں تم یہ کیوں سمجھتے ہو بھئی کہ میں تم سے ناراض ہوں ۔۔ یا ہو بھی سکتی ہوں ۔۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہ سکوں ۔

ایک بات اور ۔۔ وہ تم نے اپنے پچھلے سے پچھلے خط میں ذکر کیا تھا کہ تم فیض کو خط لکھنے والے ہو ۔ ۔۔ پھر لکھ دیا ۔۔ ؟

سراج آپا بیچاری کا بُرا حال ہے۔ انھیں آج تک کسی نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔"

"یہ فیض صاحب تو کیا جواب دیں گے۔ بس کھٹ سے ایک خط لکھ دیتے ہیں عصمت چغتائی کو۔" قلم کاغذ سنبھال کر جگنو مستعد ہو گیا۔

"لیکن عصمت چغتائی کے متعلق آپ کو اتنی خوش فہمی کیوں ہے۔؟"

دیکھو شہابی تم تو سمجھتیں نہیں یہاں معاملہ ذرا Opposite Se کا آجاتا ہے نا۔ اب اگر تم کرشن چندر کو لکھو تو وہ کھٹ سے جواب دے مارے گا۔"

"اور پھر بیچاری سراج آپا اور وہ کلیم صاحب۔" مجھے خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے۔

"اُف کلیم صاحب کے خط نہ پوچھو۔ انھوں نے محترمہ "عصمت آپا" کے بعد اپنی خیریت لکھی، ان کی خیریت پوچھی اور پھر اکرم بوریت شروع کر دی۔

رنگوں میں آپ کو کون سا رنگ پسند ہے۔ کھانے میں کون سی ڈش زیادہ لائک کرتی ہیں۔ لباس کون سا۔"

جگنو تم خواہ مخواہ بے چارے کو Defame کر رہے ہو۔ جانے دو یہ تو بتاؤ تم کیا لکھو گے۔؟

"بس یہی کہ آپ بڑی اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ آپ کو دیکھنے کی بڑی تمنّا ہے۔"

"بالکل تمنّا نہیں ہے۔ اُن کی تصویر تو جناب دیکھ ہی چکے ہیں ستّر بار۔"

"اور اپنی تصویر بھی بھیجئے اور آٹوگراف اور۔"

"اور۔ اور۔ اور۔ سب بکواس۔ جوبات شاعروں کو خط لکھنے میں ہے وہ ادیبوں کو لکھنے میں نہیں۔ ہم تو لکھیں گے جناب جوش کو۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو!"

"اور ہم تو بولتیں کر خطاں لکھو نہ تیراں، بیٹھ کو ذرا بیت بازی کریں گے۔

"اخاہ سراج آپا۔" جگنو جوش سے چلایا۔ "کیوں جین اسمو کر سے چھٹی مل گئی آپکو؟

"اُنے خواہ مخواہ بدنام ہے بے چاری ۔ کیا تو بھی برائی ہوئی گی اس میں کہ کبھی مذاق بنا لیتیں اس کا ۔"

"تازہ ترین انگلش فلموں پر تبصرے شاید ختم ہو گئے ۔ اسی لئے آپ ادھر رجوع ہو گئیں ۔"

"تم لوگاں ایسے بے ایمانے کہیں کے ۔ ہم مر کو گئیں کہ کبھی تو تمہارے ساتھ دو گھڑی بیٹھیں گے ۔ پن تمہارے مزاجاں کاں ملتیں ۔ اجاڑ چار، آٹھ دن رہیں گے پھر اپن بھلے اپنا لندن بھلا ۔"

" فرصت تو آپ کو ہے نہیں جناب اور باتیں ہمیں سنا رہی ہیں ۔ آپ کے کرتے دوپٹے سِل گئے ۔ ؟؟ "

" وہ لیو اور باتاں سنو ۔ میں کیا کر رہا تھا ۔ خالی اپنی اوڑھنی پر ذرا بانکڑی ٹانکنے کو بیٹھا کر تمہارے کمرے سے ہنسی کا غل غباڑہ آیا ۔ اور ادھر چلی آگیا ۔

مریم آپا کو بھی شکایت سوجھی ۔

" جب سے یہ جگنو میاں لندن سے لوٹیں کتی بار میں ان سے بولا کر چلو ادھر اُدھر ذرا گھومیں گے ۔ پن ان کو تو کمرہ ایسا بھایا کہ چھوڑنے کا نام نہیں لیتے ۔ ایسا بھی کیا کو راپن ۔"

جگنو شہابی سے مخاطب ہو کر بولا ۔

" میں سمجھ رہا تھا کہ اتنے دنوں بعد لوٹوں گا تو ان لوگوں کی بات چیت، لب و لہجے اور پہناوے میں نمایاں فرق پاؤں گا ۔ مگر اب تک وہی حال ہے ۔ ۔ حیرت ہے ۔

" انگلینڈ جا کر تم نے کیوں سمجھ لیا تھا کہ یہاں کے لوگ بھی بدل جائیں گے ۔ جس طرح تم بدل گئے ہو نا ۔ ؟ "

وہ ہنسا ۔ " اچھا ۔ میں بدل گیا ہوں ۔ بھلا کیسے بدل گیا ہوں ۔ ؟ "

" آدھے تو بدل ہی چکے ہو ۔ ابھی تو پھر انگلینڈ جانا ہے ۔ چار چھ سال بعد لوٹو گے تو پورے بدل چکے ہو گے (اب کے بسے تو آ جاتا ہوں ۔ مگر اب آئندہ نہیں آؤں گا ۔ پڑھائی کا بہت لوس ہوتا ہے ۔ بس تعلیم مکمل کر کے ہی لوٹوں گا ۔) پھر سب کچھ بھول جاؤ گے کون

کیا تھا۔ شہابی کون تھی ۔ جسے میں پیار سے شوبی کہتا تھا۔"

میں نے آنکھیں جھکائیں ۔

بات کا موضوع عقیل نے بدل دیا ۔

"کیوں جگنو بھائی کچھ نئے شعر ان یاد کرے کیا نہیں ۔ آپ کو تو بڑا شوق ہے نا، شاعری کا ۔"

"جی ہاں وہ برائیڈ کی نظم مجھے شہابی نے سنائی تھی Remember Me بہت خوب ہے اور آپ کا ذوقِ انتخاب بھی ۔"

شاجے جگنو سے ملنے آیا تھا ۔ پہلے تو پردے کے پاس کھڑا رہا پھر دھیرے سے آکر ایک صوفے پر ٹک گیا ۔

"اخاہ ۔ جگنو مڑ کر بولا ۔ آپ ہیں ۔ بھئی خوب ۔ آپ سے ملنے کو بُری طرح جی چاہ رہا تھا ۔ شوبی نے مجھے اطلاع دی تھی کہ آپ بڑے اچھے شاعر ہو گئے ہیں ۔"

شاجے صرف ہنس کر رہ گیا ۔

کرسیوں، صوفوں، اور مونڈھوں پر اب کہیں جگہ باقی نہ رہی تھی ۔ دور سے آنے والوں میں کتنی کشش ہوتی ہے ۔ وہ کتنے پیارے لگتے ہیں ۔ (کاش وہ بھی ہم سے اسی طرح پیار کریں ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"ارے بیت بازی نہ کرو بھائی ۔ یہاں شاہ جہاں بیٹھے ہیں بھلا کس کو جیتنے دیں گے ۔ ؟"

شاجے نے جھینپتے ہوئے جگنو کی طرف دیکھا ۔ ایسی بھی کیا بات ہے ۔ یہ کوئی ضرور نہیں ہے کہ میں جیت ہی جاؤں ۔"

جگنو نے اس کے کسرتی بدن کی طرف دیکھا ۔ ہنس دیا ۔ "ارے صاحب بیت بازی کی کیا بات ہے! آپ تو ہر بازی جیت جائیں گے ۔ کیوں آپ بہت پابندی سے

ورزش کرتے ہیں ۔"

میں مونڈھے میں دھنسی ہوئی ہوں ۔ ڈرائنگ روم میں ہوں مگر نہیں ہوں ۔ میرے ذہن میں بس یہ خیال باقی ہے کہ پھر جگنو چلا جائے گا۔ خوشی کے لمحے اتنے کم کیوں ہوتے ہیں ۔ کیوں ہوتے ہیں؟ جوان گرم سانسوں کی مہک کہاں باقی رہے گی ۔ کھڑکیوں میں سر ڈال کر کون انگلش ٹیون پر وسل بجایا کرے گا ۔ سی ۔ سی ۔

" ہوا کے دوش پر اڑنے والے جہاز جسموں ہی کو نہیں پیار کرنے والے دلوں کو بھی اڑا لے جاتے ہیں ۔ سی ۔ سی ۔ سی ۔

" ہم کیسے سوئیں گے ۔ ہمیں تو آنسو بھری بڑی بڑی آنکھوں نے خدا حافظ کہا ہے ۔ سی ۔ سی ۔ سی ۔ خدا حافظ ۔ تمہارا خدا حافظ جگنو ......

" ایو ۔ ختم بھی کرو یہ گیان ۔ اجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ ۔ پھر ہمارے ماسٹراں آجائیں گے "

" کچھ سیکھتی بھی ہیں ماسٹروں سے ۔" جگنو ہنس پڑا ۔

" نکو رے بھائی اپن تو معافی مانگتیں ۔ بھلا جگنو میاں کے مقابلے پر کون بیت بازی کرے "

" اچھا تو مریم آپا آپ میری طرف ہو جائیے ۔"

" تمہیں بہت شعراں یاد ہیں کیا ۔" منیر آپا سہم کر جگنو سے بولیں ۔

" اور کیا ۔ اب تو جگنو میاں جھٹ پٹ فی البدیہہ شعراں بھی گھڑ لیتیں ۔" عظیم سگرٹ کی راکھ جھاڑتے جھاڑتے بولا ۔ (محل کے سارے جوان لڑکوں کو سگریٹ پینے کی سخت بری عادت پڑ گئی ہے ۔ لونگ لو مسز افضل !)

" تو پھر ہو جائے چھوٹے نواب ایک بازی ۔" اختر شہ دے کر بولا ۔

" تو چلیں تم سے ۔ ہے نا ۔" جگنو نے ادھر ادھر دیکھا ۔ "چلو بھائیو ۔ کھٹا کھٹ تازہ مال حاضر ہے ۔ (ذرا ذہن پر زور ڈال کر ۔)

مرغیاں ہی مرغیاں ......

(پھر کچھ سوچ کر ۔) ۔۔۔ مرغیاں ہی مرغیاں ہیں ...

(اچھل کر) ہاں، ہاں ۔بس جم گیا شعر

مرغیاں ہی مرغیاں ہیں جس طرف ڈالو نظر

ہائے ان میں ایک بھی مُرغا نہیں ۔

" بہت خوب ۔" شلبھ ہنسنے لگا ۔

"ایوّ ہٹو ۔ تم بھی الٹا ایسے اوندھے شعر کی تعریف کر رہے ہو۔ ایک مصرع چھوٹا ایک بڑا۔ ایسے بھی کہیں شعر ہوتے ہیں دنیا میں ۔"

" بس یہی تو خرابی ہے ۔ کوئی مانتا ہی نہیں کہ صاحب ہم بھی شاعر ہیں ۔"

"یہ تو ڈیڑھ مصرعی شعر ہو گیا جناب ۔ آدھا مصرع غائب ہے۔ پورا شعر پڑھیئے ۔۔ ایسے لمبے چھوٹے مصرعے نہیں چلیں گے ۔" روشن ہنسا

" اچھا تو ذرا سی ترمیم سہی ۔

مرغیاں ہی مرغیاں ہیں ہر طرف !

ہائے ان میں ایک بھی مرغا نہیں

"مگر صاحب ہم اس کو شعر مانتے ہی نہیں ۔ شاعری نہیں بکواس ہے یہ ۔" طاہر پاشا کو میر اور اقبال کے بہت سارے شعر ازبر ہیں ۔

"اب بھلا ایسی بھی کیا کج بحثی ۔ پہلے گاڑی ذرا بڑھ تو لے ۔"

نہ مانوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

پانچ شعر ادھر اُدھر والوں نے پڑھے ۔ پھر جگنو کی طرف "م" ہی آیا ۔ وہ تیزی سے بولا ۔

مرغیوں کی میتیں ہیں ہر طرف

ہائے ان میں ایک بھی زندہ نہیں

" آج جب تک انھیں مرغ مسلّم نہ ملے یہ مرغیوں کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں ۔"

روشن کی جھلاّہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے جگنو بولا ۔" وہ جو کچھ بھی ہو مگر آپ کو

شعر تو دے دیا ہم نے ۔"

اب کے جگنو کی طرف "اُ کا شعر آیا ۔ دو چار آوازیں اُٹھیں ۔

"ایو ہم کو تو بولنے دیو جی ۔ خود ہی بولتے جارئیں ۔"

مگر جگنو کو بہت آمد ہو رہی تھی ۔ اکدم بولا ۔

آدمی ہی آدمی ہیں ہر طرف
ہائے ان میں ایک بھی عورت نہیں

"خسم خدا کی ۔ حد ہے کوئی ۔ یہ بے دے کے وہی شعر کو گھما پھرا کے بولتے جارئیں اور ہم ہیں کہ اُن کے پیچھے بنے سُنتے جارئیں ۔" اختر سیخ پا ہو گیا ۔

"واہ صاحب واہ ۔ حد کر دی آپ نے بھی ۔ بھلا سوچئے تو کہاں مرغیاں، کہاں مرغیوں کی میتیں اور کہاں آدمی ہی آدمی کہ جن میں ایک بھی عورت نہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا ۔ آپ لوگوں کو شاعری سمجھتی کیوں نہیں ۔؟

سراج آپا کی پارٹی پرزن کا شعر چھوڑ کر ادھر جگنو شاہجے سے مخاطب ہو گیا ۔

"اب فرمائیے جناب ۔ بیکاری میں کیا مشغلہ ہے آپ کا ۔؟

"جی بیکار تو نہیں ہوں ۔ ام ۔ اے پریویس میں داخلہ لیا ہے ۔ یوں فرسٹ ایر کو آپ رسٹ کہہ لیجئے ۔"

"ارے صاحب کمال کرتے ہیں آپ بھی ۔ ام ۔ اے کا فرسٹ ایر تو کم از کم Rest Yr نہیں کہلایا جا سکتا ۔"

جگنو ہنسا ۔ "ویسے آپ نے کمال کر دکھایا جناب !"

شاہجے نے جلدی سے بات کا رخ پھیر دیا ۔ "آج کل زیادہ تر وقت پامسٹری کی کتابیں پڑھنے پر صرف کر رہا ہوں ۔ کیرو آج کل زیر مطالعہ ہے ۔"

"اچھا ۔" جگنو اکدم سنجیدہ ہو گیا ۔ "آپ کو پامسٹری آتی ہے ۔؟ یعنی آپ میرا ہاتھ دیکھ سکتے ہیں ۔"

"جی ہاں — دیکھ تو لوں مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ سب باتیں سچ ہی بتا سکوں گا۔ کیونکہ، ابھی میری ریڈنگ اتنی مکمل نہیں ہو سکی ہے۔"

"پھر بھی دیکھئے تو —"

جگنو نے اپنا ہاتھ شاجے کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ شاجے نے غور سے ہتھیلی کو دیکھا۔ اور پھر جگنو کے چہرے کو۔ 'دیکھئے —' وہ رک رک کر بولنے لگا۔

ہتھیلی میں اتنی ساری چھوٹی چھوٹی لکیریں ہوتی ہیں — مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی نہیں بلکہ طول طویل شاہراہیں ہیں۔ ان پر چلنے والے سدا ہی چلتے رہتے ہیں — بھٹکتے رہتے ہیں! منزل کسی کو نہیں ملتی — کوئی ہندوستان میں بھٹکتا ہے اور کوئی انگلستان میں۔

"چھوڑو ان باتوں کو" — میں اپنے دل سے کہتی ہوں — "آؤ اکیلے میں اپنے سکون کے لئے کوئی گوشہ تلاش کریں!"

یہ حیدرآباد دکن ہے — امیروں کی، رئیسوں کی بستی — نوابوں کی بستی — کوٹھیوں کی محلوں کی بستی — ان محلوں میں بسنے والے ہم نواب لوگ بھلا کون سے گوشے کو ڈھونڈیں کہ سکون ملے۔ کیا ہمیں بھی کسی گوشے کی تلاش ہو سکتی ہے۔ ہمیں کون سے غم ہیں کہ ان سے فرار ڈھونڈیں؟ کہاں چلیں؟؟ اوں؟

اندر محل میں تو بڑی سہمی دبی سرگوشیاں ہیں — شاید — تایا میاں نے کوئی اور ناممکن بات کہہ دی ہے۔ جو ضرور پوری ہوگی۔ کیونکہ تایا میاں کی کہی ہوئی بات غلط نہیں ہوتی — ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر ہر لفظ پورا ہو جاتا ہے — یا پھر کوئی دوسری بات ہوگی۔ کسی ضدی لڑکی نے ضد کی ہوگی۔

"میں تو اسکول میں پڑھنے جاؤں گا۔ جاؤں گا۔ اوں۔ اوں۔ جاؤں گا۔"

دادی اماں گاؤں سے آئی ہوئی ہیں — اپنے ساتھ ڈھیروں الجھنیں لئے — ڈھیر سارے بکھیڑے — ہزاروں رشتے — اس کی شادی اُس کے ساتھ — اُس کی شادی اس کے ساتھ۔ دادی اماں کے ہاتھوں تقدیریں بنیں گی اور بگڑیں گی — یہ ایک معبد ہے جہاں سب کو ماتھا ٹیکنا ہی پڑتا ہے۔ کس کی مجال ہے جو چون چرا بھی کر سکے۔ قصر دلپذیر بہت اونچا ہے۔ بہت بڑا —

اس کی روایتیں بھی بڑی اونچی ہیں اور بڑی بڑی ہیں۔ اب قصر میں منگنیوں اور شادیوں کی دھوم مچے گی۔ باجے بجیں گے۔ اندھیرے اجالے لونڈیوں کی باندیوں کی پکڑ دھکڑ ہوگی۔ اور اس گہما گہمی میں چار چار چھ چھ بچوں والے باپ بھی نئے سرے سے دولھے بنیں گے۔

فادر گریگ۔ مس ڈی کاسٹا اور مسز افضل چین اسمو کر پاپا کو مبارکباد دیں گے۔

پھر خود ہی پاپا کو ترجمہ سنائیں گے

May heaven's choicest blessings
be showered on young couple

"اری چھنال۔ گورے پاشا کو تو نے دوائی پلائی کہ نئیں۔؟"

دادی اماں کی تیز چبھتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔

"ہو پاشا ابھی پلاتیوں۔" یہ نٹیا ما کی آواز ہے۔

آؤ اکیلے میں اپنے سکون کے لئے کوئی گوشہ تلاش کریں۔

میں دل کو لئے لئے ادھر آ بیٹھی ہوں۔ خدا پاپا کو اچھا کر دے۔ وہی اس گھر کے اس محل کے بڑے ہیں۔ وہ نہ رہیں (میرے منہ میں خاک) تو یہ قصر دلپذیر کیا سے کیا ہو جائے

"علی بخش کو بولی تھی میں لاکے دیو۔ پن حرام کا بھول گیا۔ کلیچ تو حکیم صاحب کی چھٹی آئی تھی۔ انون بولے کہ سونف اور سوکھے آلو لے کوٹ کر کپڑ چھان کرو اور پانی کے سنگات پلاؤ۔ شکر کی بیماری اکدم ختم ہو جائے گی۔ پن اس کے منہ میں مٹی پڑ د بھول گیا۔ اب پھر بولتیوں۔" یہ ذیابیطس بڑی نکمی بیماری ہے۔ جس کی جان کو چمٹ جائے چھوڑتی نہیں۔ لوٹ لوٹ کر پھر آتی ہے۔ اب بھلا پاپا کو ہی یہ بیماری ہونی تھی۔؟ بیچارے کھانے کے اتنے شوقین ہیں۔ مگر میٹھے کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ کتنے کمزور ہو رہے ہیں وہ۔

"ہو پاشا۔ اپنے نواب کی بیٹی" میں آج کل کونسی چھوکری ہے۔

اف۔ دادی اماں کیوں اپنے آس پاس ان کمین عورتوں کو بٹھائے رکھتی ہیں

میں خیالات کے سلسلے کو پھر ملا رہی ہوں۔ پاپا ایک تو یوں ہی بیمار۔ اوپر سے بیماری ایسی کہ کھانے دلانے پر پابندی۔ کیا حالت ہو رہی ہے۔ چلنا دوبھر ہے۔

"کتنے کمزور ہوگئیں پاشا بے چارے نواب صاحب ۔"

"اور پھر اوپر سے لت بھی تو نہیں چھوٹتی ۔ جسم تو دیکھو موا الا جا رہا ہے ۔" دادی اماں نے اچانک لہجہ دھیما کر لیا ہے۔ انھوں نے پاپا کی زندگی سے متعلق (خدا نخواستہ) کوئی بری بات تو نہیں کہہ دی ہے۔ ؟ پھر یہ آوازیں خاموش کیوں ہوگئیں۔

تایا میاں کے پاس جاؤں ۔ ؟

گھر کی سب لڑکیوں کو سختی سے ممانعت ہے کہ تایا میاں کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ وہ مارتے ٹھوکتے تو ہیں نہیں مگر جو جی میں آئے بک دیتے ہیں۔

گل باجی ایسے ہی انار کی کلیاں اتارنے گئیں تھیں۔ سامنے ہی تایا میاں بیٹھے تھے ۔ ان کے ساتھ سوسن بھی تھی جو انار کی کلیاں جھولیا میں جمع کرتی جا رہی تھی۔

تایا میاں نے بڑے پیار سے گل باجی کو پکارا۔ یوں جیسے پاگل ہی نہ ہوں۔

"گل بٹیا ۔ گل بٹیا ۔!"

"جی تایا میاں !" گل باجی ذرا سراسیمہ ہو کر بولیں۔

"تو تو بس اپنی پسند سے شادی کرے گی ۔ ہاں اپنی مرضی سے دولہا چنے گی ۔ چنے گی نا، ہاں ۔" وہ سر جھٹک کر بولے ۔ "گو اس میں تکلیف بھی بہت ہوگی ۔"

گل باجی کا منہ سوکھ گیا ۔ انار کی کلیاں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گریں ۔ اور آفاق بھائی کا خط ان کی آنکھوں میں پھڑ پھڑانے لگا۔

"اس محل کی دیواریں تو بہت اونچی ہیں گل ۔ یہاں تو ہم گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔ لیکن جب میرے بازوؤں میں دم ہے ۔ اور تمہاری محبت میں مٹ جانے کا عزم ہے تو کیوں نہ اس فرسودہ روایت کو توڑ دیں ۔ تمہارا اور رؤف کا کوئی جوڑ ہے ۔ ؟ کیوں نہ ہم بہتر راستہ اختیار کریں ۔ اس محل کی کیا حقیقت ہے۔ ایسی اونچی دیواریں تو ہماری راہ میں بہت آئیں گی مگر ہم سب کو گرا دیں گے ۔"

کتنی مشکل سے گل باجی نے اردو پڑھنی سیکھی تھی ۔ اور پھر مولوی رحیم خان سے فارسی

(اور ڈی کا سٹانے تو خیر سب کو ٹوٹے پھوٹے جملوں میں طاق کر دیا تھا) صرف اس لئے کہ ان فارسی اشعار کا مطلب سمجھ سکیں جو آفاق بھائی لکھ لکھ کر بھیجتے تھے۔

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود

— یا پھر — بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم

جمال ہم نشیں بر من اثر کرد

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

چھوٹی پھوپھی کے ہاتھ وہ سارے خط پڑ گئے جو انھوں نے بڑی پھوپھی تک پہنچا دیئے — اور پھر سوسن نے تو پہلے ہی تایا میاں کی پیش گوئی جا سنائی تھی۔

" شادی کروں گی تو آفاق سے ورنہ کنویں میں چھلانگ لگا دوں گی۔"

"اری تو کیا لگائے گی — میں خود تیرا بند و بست کر دوں گی۔"

بھلا کسی نے سوچا ہوگا کہ محل والی لڑکیاں ٹھیکرے کی مانگ کو توڑنے کے بارے میں (خواہ وہ دل ہی دل میں ہو) سوچ بھی سکیں — پھر گل باجی تو منہ پھوڑ پھوڑ کر کہہ رہی تھیں دماغ پھر گیا ہو گا بے چاری کا۔

رول ہول میں حکیم دادا بلوائے گئے مگر ان کے آتے آتے تک وہاں بے جان جسم کے سوا کیا دھرا تھا۔ پھوپھی اماں آنکھیں پونچھ پونچھ کر بولتی تھیں۔

" اتنے بار منع کی پوسنی نہیں کہ کنویں کی باڑ کنے مت جایا کرو — مولی میرے مجھے طاقت دے صبر کی —"

اور گل باجی کی کیا بات ہے — کسی نہ کسی کو دیکھ کر ان کی زبان حرکت میں آ ہی جاتی اور تایا میاں بولے بغیر نہ رہتے۔ ایک بار آمنہ آپا کو دیکھ کر بولے۔

" جاؤ نا بی بی تمہاری سیج سج رہی ہے اور تم یہاں گھوم رہی ہو —"

کوئی تیاری تھی نہ ارادہ تھا۔ مگر جاگیر پر سے ماموں آئے تو خبر لائے کہ ممانی بی کی حالت اب تب ہو رہی ہے۔ کیسا بھی کر کے ان کو بہو کی صورت دکھا دو — دادی اماں نے رو رو کی میں

ڈھا ڈھم باجے بجوا دیئے۔ اور چلو آمنہ آپا کی سیج سج گئی۔

میں اگر تایا میاں کے پاس جاؤں تو وہ کیا بولیں گے۔ کیا کہیں گے۔

"تو سدا ایک زخمی دل لئے یونہی اکیلی گھومتی رہے گی۔"

اگر انھوں نے ایسا کہہ دیا تو ___ مطلب یہ کہ میں عمر بھر یوں ہی بے کل بے کل اپنے دل ناتواں پر اپنی ناکام حسرتوں کا بوجھ لئے لئے پھرتی رہوں گی۔ گھومتی رہوں گی۔ وحشی ہرنی میرے دل پر یہ گھاؤ کیسے ہیں۔ مجھے کہاں سے مرہم ملے گا۔؟ مگر جانے وہ کیا کہیں کون جانے ___ کون جانے۔ مستقبل کا حال کس نے جانا ہے۔ غیب کا حال کون بتلائے کیسی تڑپا دینے والی اداسی ہے ___ خدا وندا۔ شاید میں جگنو کو بری طرح Miss کر رہی ہوں۔ کتنی جلد وہ دن بیت گئے ___ آیا بھی ___ گیا بھی۔

اب کب آؤ گے جگنو ___ تمہارا ارادہ تو بی۔ اے کے بعد ام۔ اے اور پھر لا کرنے کا ہے بیرسٹری۔ اُف۔ بہت دن لگ جائیں گے۔ بابا کل پھر مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

"کیوں بٹیا جگنو میاں کے ابھی کتنے سال باقی ہیں ___ ؟؟"

آؤ اکیلے میں اپنے سکون کے لئے کوئی گوشہ تلاش کریں۔ اے دل کہیں مجھے محبت کی تو تلاش نہیں ___ ؟)

جگنو اپنے ساتھ دو چار کتابیں لایا تھا۔ تھامس ہڈ کی یہ کتاب شاید وہ بھول کر چلا گیا ہے۔

کیا بھول جاؤں۔ کیا یاد کروں ___ خدایا۔

When the white cloud reclines
On the verge of the sea
I fancy the white cliffs
And dream upon thee;

But the cold spreads its wings
To the blue heaven and flies
Whenever shall meet love
Except in the skies.

اب ہم کہاں ملیں گے - کہاں - آسمانوں میں - ؟
کیسی غمگین کر دینے والی بات ہے - کیسی اُداس کر دینے والی رات ہے - ہش ! میں ایسی نظموں کو پھاڑ پھینکوں گی جو حسرت و اندوہ سے بھری ہیں - نہیں - میں یوں کیوں نہ کروں کہ یہ کتابیں سمیٹ کر رکھ دوں - جگنو آئے گا تو دے دوں گی - ورنہ روشن کے ہاتھ دوں گی کہ جگنو کو دے دے - وہ دو سال کے لئے لندن جا رہا ہے -

(۵)

"چلو محبت کو ڈھونڈیں"

آج کئی زمانوں بعد میں نے جگنو کو صرف ایک جملے پر مشتمل ایک خط لکھا ہے -
"مگر یہ تو بتا دُگڑیا محبت کا پیمانہ خط کہاں سے ہو گئے ؟ خط بند کرتے میں ایک آنسو لفظ محبت پر لڑھکا - اور اُسے مٹاتا ہوا نیچے بہہ گیا -

"ہمارے ماں باپ نے ہماری تقدیریں ایک دوسرے کے ساتھ ضرور جوڑ دی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت بھی ہے -"
میں ڈر رہی ہوں جگنو اس قسم کا اوٹ پٹانگ سا جواب نہ دے دے - مگر وہ قلم ہاتھ میں پکڑے تب نا - ؟ اس نے تو خط نہ لکھنے کی جیسے قسم کھا رکھی ہے -
آؤ اکیلے میں اپنے سکون کے لئے کوئی گوشہ تلاش کریں -
دل نے چپکے سے میرا ہاتھ تھاما - اور میرے قدموں کے نیچے سرخ سرخ بجری کچر کچر بجنے لگی -

سنبھل کے - سنبھل کے - تمہارے نرم و نازک پیروں کو تو مخمل پر چلنے کی عادت ہے ،

اور یہ بجری ہے ۔"

"پیروں میں جوتے جو ہیں ؟ میں اچھی ہوں تم فکر نہ کرو ۔"

"تمہارے جوتے بھی تمہارے پیروں سے کم نازک نہیں۔ ان کا نرم و نازک جگر چھلنی نہ ہو جائے ۔"

"طعنہ ۔۔؟"

"اوہ شہابی میں تمہیں طعنہ دوں گا ۔ تنہائیوں میں میں نے تمہارا ساتھ دیا ہے ۔۔ تم روئی ہو تو میں نے سمجھایا ہے ۔۔ ہنسی ہو تو میں کھکھلا اٹھا ہوں ۔۔ میں اور طعنہ دوں ۔؟ مجھے تو اپنا سچا ساتھی سمجھو ۔۔ تم جو بھی قدم اٹھاؤ گی میں تمہارا ساتھ دوں گا ۔ چلو چلو کسی گوشے کی تلاش میں ۔

I remember I remember
The house where I was born
The little window where the sun
Came peeping in at morn.

"یہ شاہجے کس گھر کو یاد کر رہا ہے ۔؟"

"بھول گئیں ۔ باتیں نہیں تایا میاں نے کیسی زندگی گزاری ہے ۔ بھلا یاد تو کرو شاہجے کا جنم کہاں ہوا تھا ۔؟"

بھلا ان قید خانے جیسی اونچی اونچی دیواروں سے گھرے محل میں اس کا جنم ہوا ۔

I remember I remember
The roses red and white
The violets and the lily cups
Those flowers made of light.

کون سا دیش ہے وہ ۔۔ جہاں روشنیوں کے پھول کھلتے ہیں۔ جہاں سورج دن چڑھے

آتا ہے ۔ اور چوری چوری کمرے میں جھانکتا ہے ۔

My spirit flew in feathers then
that is so heavy now
And summer pools could hardly cool
The fene on my brow.

کون سے دیش کی یہ باتیں ہیں جہاں روحیں سبک پر لگا کر اڑتی ہیں ۔ کون سا دیش ہے ۔۔ کون سا ۔۔

I remember I remember
The rare trees dark and high
I used to think their slender tops
were close against the sky.
It was a childish ignorance
But now 'tis little joy
To know I9 I'am farther off from heaven
Than when I was a boy.

شولو بی بی خوش ہو جاؤ ۔ خوش ہو جاؤ ۔ اس دنیا میں صرف تمہی ایک غمگین نہیں سبھی اس گوشے کی تلاش میں ہیں، جہاں سکون مل سکے ۔ گھر کی یادیں ۔ بچپن کی یادیں ۔۔۔ پھولوں سے محبت ۔ سفید گلابوں سے محبت ۔ کہیں یادوں کی تلاش ہے کہیں محبوب کی ۔ محبت کی، کہیں زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں کی تلاش ہے ۔ اور کہیں ان کھڑکیوں کی جہاں سے سورج ہر روز صبح خوشی خوشی آ کے جھانکا کرتا تھا ۔ سبھی خوشیوں کی جنت سے دور ہیں ۔ تم سب ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہو ۔ تم سب اندھیرے راستوں پر بھٹکتے ہوئے خوشیوں کی تلاش میں بڑھے جا رہے ہو ۔"

تلاش کئے جاؤ ۔ کئے جاؤ ۔ کئے جاؤ!"

شاہجے اکدم گھبرا کر کھڑا ہو گیا ۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس تھا ۔ ہونٹوں پر خاموش آوازیں مچل رہی تھیں ۔ قمیص دل کے پاس اُڑی جا رہی تھی ۔ وہ بہکے بہکے بولا ۔

"بیٹھو شابی ۔ بیٹھو نا ۔ کیسے آئیں ادھر ۔ ؟"

میں نے اپنی چھوٹی سی ہتھیلی اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی ۔

یہ چھوٹی سی ہتھیلی جس میں بے شمار ننھی ننھی لکیریں ہیں ۔ اتنی ساری پگڈنڈیاں ۔ ان گنت راستے ۔ چلتے چلتے ہم کدھر سے کدھر نکل جاتے ہیں ۔ کہاں جانا ہے ۔ کون جانے کہاں چلے جائیں ۔ بتاؤ ۔ بتاؤ یہ راستہ کدھر جاتا ہے ۔ انگلیوں کے اُبھاروں کے پاس سے ۔ کلمے کی انگلی کے بیچ سے یہ جو بل کھاتا ہوا راستہ ہے وہ کس دیش کو جاتا ہے ۔؟ کہکشاں ایسی چمکتی ہوئی رہگذر کون سے آسمان کو جاتی ہے ۔ کھارے کھارے نیلے پانیوں سے پرے کون سا دیش ہے ۔ وہاں پہنچتے پہنچتے یہ راستہ کھو تو نہیں جاتا ۔ یہ کہکشاں مدھم تو نہیں پڑ جاتی ۔ ستارے بجھ تو نہیں جاتے ۔ بتا دو ۔ بتا دو ۔ نا ؟"

اب شاہجے نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے ۔ ویران آنکھوں سے وہ اس جگمگاتی رہ گذر کو تلاش کر رہا ہے جہاں ستارے جل رہے ہیں ۔ مگر پھر بھی اندھیرا ہے ۔

"تمہارے ہاتھ میں تو سمندری سفر ہے شابی ۔"

"ہوں ۔" میں ہنس رہی ہوں ۔ "تم جانتے ہو نا میری شادی جگنو سے ہونے والی ہے ۔ کوئی تو دن آئے گا کہ ہم دونوں ہنی مون منانے سوئٹزرلینڈ جائیں گے ۔ بس لگا دی گپ ۔ بھلا جھوٹ کہہ رہی ہوں ۔؟"

شاہجے گھبرا رہا ہے ۔ اس گھبراہٹ میں اس کا چہرہ کتنا بھلا ۔ کتنا پیارا لگ رہا ہے (مگر تمہاری انگلیوں کا یہ مقدر نہیں کہ وہ ان گھنگھور لٹوں کو سنوار سکیں جو اس بلند و بالا پیشانی پر جھک آئی ہیں ۔ جگنو لندن میں بیرسٹری پڑھنے گیا ہے اور ہر سال فیل ہو رہا ہے ۔)

"کیسی باتیں کر رہی ہو شابی ۔" وہ بُری طرح گھبرا رہا ہے ۔ پیشانی پر پسینے کے شبنمی قطرے اُبھر آئے ہیں ۔ لٹیں اور نیچے جھکی چلی آ رہی ہیں ۔۔۔ میں جانتی ہوں وہ کیوں اتنا سراسیمہ ہے ۔ میں اتنی بے تکلفی سے اپنی شادی کے بارے میں پوچھ جو رہی ہوں ۔ بھلا کنواریاں ۔۔۔ اور پھر قصر دلپذیر کی کنواریاں ایسی باتیں کرتی ہیں ۔ یہاں تو شادی اور سسرال کا نام سنتے ہی آنچلوں میں منہ چھپا لینے کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ پھر یہ سب ۔۔ ؟

شابے ان لٹوں کو خود ہی سنبھال لو ۔ مجھے ڈر ہے ۔ مجھے خوف ہے کہ ......

ہم سب خوشیوں کی جنت سے دور ہیں ۔ چل اے دل تنہائی میں ۔

آج چاند کیسا مدھم مدھم ہے ۔ اور آسمان بھی سہما سہما چپ چاپ سا نظر آ رہا ہے بس ستارے ہیں جو لپکے پڑ رہے ہیں ۔ بس یوں جیسے نیچے اُتر آنے کے لئے بری طرح بیقرار ہوں ۔

مجھے یقین ہے اگر ستارے نیچے اُتر آنے میں کامیاب ہو سکے تو انھیں پناہ بس میری ہی آنکھوں میں ملے گی ۔ کسی بے گھرے کو پناہ دینا کتنے ظرف کی بات ہے ۔ ؟ شاید ستارے نیچے اتر آئے ہیں ۔ تبھی تو میری سیاہ آنکھوں میں یکایک چراغ جل اُٹھے ہیں ۔ روشنی پھیل گئی ہے ۔ میں خود پر مغرور ہو رہی ہوں ۔ نازاں ہو رہی ہوں ۔ میری آنکھوں میں جھل مل جھلمل ستارے کانپ رہے ہیں ۔

ارے ۔ یہ تو آنسو ہیں ۔

مجھے تو کبھی ان آنسوؤں کا پتہ بھی نہ چلتا اگر بارش کے پہلے پہل گرم ۔ نیم گرم سے قطروں کی طرح یہ روشنی میرے گالوں پر نہ ٹپک پڑتی ۔

روشنی بہہ رہی ہے ۔۔۔ چراغ بہ رہے ہیں ۔ صرف میری آنکھیں اپنی جگہ سہمی ہوئی ٹھہری ہوئی ہیں ۔ اور ان لفظوں پر جم کر رہ گئی ہیں ۔ جنھیں جگنو کے مضبوط ہاتھوں نے لکھا ہے ۔

جگنو اب مجھے خط نہیں لکھتا — مارے ندامت کے مجھے مخاطب ہی نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے پاپا کے نام خط بھیجا ہے اور شرمائے شرمائے سے الفاظ خود اپنے منہ سے کہہ رہے ہیں "چچا میاں —!

میں ایم۔اے۔میں فیل ہوگیا ہوں — ایک سال پھر مارا گیا۔ شائد اگلے سال تک میک — اپ کرلوں۔ دراصل مجھے آپ سب لوگوں کی اس قدر یاد آتی ہے کہ پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا۔ عجیب ویران ویران سا محسوس ہوتا ہے۔"

دل کی نگری تو وہ نگری ہے جگنو کہ سو مرتبہ لوٹی جائے پھر آباد ہوجاتی ہے۔ اور تمہارا ایسا دل — تم کون سے ویرانوں کی بات کرتے ہو میرے پردیسی، —

دشو بی باجی — میں نے آپ کی دی ہوئی کتابیں جگنو بھیا کو دے دی تھیں — مجھے ایسی بات اتنی دور سے آپ کو سنانی تو نہیں چاہیئے۔ مگر ہوا یوں کہ آپ نے جو رومالوں کا سیٹ جگنو بھیا کے لئے دیا تھا۔ وہ انھوں نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی ایک گرل فرینڈ کو دے دیا جس نے رومال دیکھ کر محض دو حروف کہے تھے۔ ہاؤ ونڈرفل

ہاؤ ونڈرفل - ایسے محبت بھرے تحفے یوں کیسے اپنا مقام کھو دیتے ہیں — ان تحفوں کا مقام کہاں تھا۔ ہ نیلے پیلے پھولوں کے درمیان وہ حروف کیسے قندیلیں بن بن کر چمکتے تھے۔ **Remember Me** رممبری - رممبری - رممبری

کوئی بات نہیں جگنو — اگلے سال ہی سہی مگر پاس تو ہو جاؤ۔ پھر ہم ان قندیلوں کو بجھا دیں گے — ممبری" - ہم اپنے راستوں میں ستارے جلالیں گے۔ جھل مل جھل مل — فارگٹ می ناٹ - فارگٹ می ناٹ — بھول مت جانا جگنو - کبھی بھی۔

اپریل کا صاف دھلا دھلایا آسمان میرے سر پر یوں تنا ہے۔ جیسے بس میرے ہی لئے ہو۔ کس قدر نیلاہٹ بھری پڑی ہے ان پردوں میں — کہیں کہیں پر دور دور ٹمٹماتے ہوئے ستارے اور ان سب کے بیچ روشن چاند،

ہوا میں کس قدر خنکی ہے — پھولوں کی خوشبو سے ہوا بوجھل سی ہو رہی ہے — یوں جیسے کسی نے پھولوں کا رس بہتی ہوا کے چہرے پر مل دیا ہو — آج کی رات کیا نیند مجھ سے روٹھی ہی رہے گی — اسے شب کی دلہن — اپنی مہندی لگی نازک پوریں میری جلتی جلتی پلکوں پر رکھ دے۔ میں سو جانا چاہتی ہوں —

چاند کی جلتی شمع لئے ہوا دھیرے دھیرے میرے قدموں کو سہلا رہی ہے۔

"میں بھول جانا چاہتی ہوں —" میں اپنے آپ کو سنا رہی ہوں —

چاند میرے ماتھے پر جھک آیا — "کیسے بھولو گی۔ کیسے بھولو گی —؟"

اب چاند میری آنکھوں میں اتر رہا ہے۔

چاند بڑھتا چلا آتا ہے۔ بڑھتا ہی چلا آتا ہے

اس قدر قریب کہ چھونا چاہوں تو چھو بھی سکوں —

ہاتھ بڑھتے ہیں مگر چھو نہیں سکتے اس کو —

پھر یہ سراب کیوں دیتا ہے مجھ کو —؟

کبھی قریب کبھی دور

کبھی وفائیں کبھی جفائیں۔

دل چاہتا ہے — ہاں دل چاہتا ہے —

ایک دن تو اس کے قریب جاؤں یا اسی کو قریب بلا لوں)

اور پوچھوں

او بے وفا — یوں ہنس ہنس کر دور بھاگنے میں کیا مزا ہے؟

آج لیٹے لیٹے میں نے چاند کو دیکھا تو مجھے شاجے کی وہی نظم یاد آگئی جو میں نے سرخ بجری پر چھپ کر کھڑے کھڑے سنی تھی — اسی کے منہ سے۔ وہ بڑے کرب ناک انداز سے گنگنا رہا تھا۔ شعر میرے ذہن سے اتر گئے ہیں مگر ان کا مطلب یاد رہ گیا ہے۔

ایک دن اس کے قریب جاؤں (یا اسی کو قریب بلا لوں)

اور پوچھوں

او بے وفایوں ہنس ہنس کر دور بھاگنے میں کیا مزا ہے۔

جگنو تو مجھ سے اتنی دور ہے کہ اس قسم کا تصور بھی (یا اس کو قریب بلالوں) مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے ۔ ہاں جو مل جائے تو اس کا دامن پکڑ کر پوچھوں

او بے وفا

او بے مہر

دادی اماں غم و غصے سے چیخ رہی تھیں۔ ہوا یوں تھا کہ بی شہابی جو نکہ اٹھارہ انیس سے بھی گزر چکی تھیں اور اب تک کنواری ہی تھیں۔ (اور اُدھر جگنو میاں تھے کہ دھڑا دھڑ فیل ہو رہے تھے ۔) اس لئے شہر ہی کے ایک بصالت جنگ نے (کہ آصف الدولہ کے یہاں اپنا رشتہ طے پا جانا عین خوش قسمتی ہے !) بی شہابی کو اپنے بیٹے کا پیغام بھجوا دیا۔ ظہیر یار جنگ پورے اپنے باپ آصف الدولہ کے نقش قدم پر تھے کہ غصہ آئے تو صفا شربت جان کر پی جائیں ۔ انھوں نے تو منہ سے کچھ نہ کہا مگر دادی حضرت کا کوئی کیا کرتا ۔ ایک منہ سو گالی دے رہی تھیں۔

"اجاڑوں کے منہ میٹھی پڑو ۔ جیتے جی کیڑے کھاؤ ۔ کیا بچپنے کی نسبت یونہی توڑ پھینکتیں ۔ اُنے کیا نہنے ہے معلوم نہیں بچہ سات سمندر پار گیا۔"

وہ تو اچھا ہوا کہ مردانے ہی میں پھول آئے تھے۔ جو کہیں وضع دار بیبیاں پیغام لے کر پہنچتیں تو بڑی سرکار جوتیوں سے ہی تواضع کرتیں۔

اس رات ظہیر یار جنگ بہت اداس تھے ۔ نو بہار اُن کے پیر دابتی ۔ کبھی سر دابتی ۔ رہ رہ کر منہ پر جھکتی ۔

"ایو صدقے گئی حضور ایسے کائے کو پڑ گئیں ۔؟"

کچھ نہیں بہار ۔ ہم اکثر سوچتیں کہ ہمارا کیا تو بھی خصور ہوئیں گا ۔ اللہ میاں ہمارے کو تڑاتڑ غم دے رہا ۔ ہمیچ ایک رہ گئے کیا غم کھانے کو ۔"

"ایوّ ! جی کائے کو چھوٹا کرتیں حضور ۔ منی باشا کے واسطے جی کڑھا لے رئیں نا؟

اللہ میاں جلدیچ سہرے کے پھولاں کھلائیں گا۔"

"مگر اُنے کمبخت تو دھڑا دھڑ فیل ہو ریا - اور باپ ہیں کی ڈھیل دے کو رکھیں - ہم ادھر خبر میں جالنے کو ہو رئیں اور جوان بیٹی ہے کی گھر میں بیٹھی ہے۔ باپ تو یہی سمجھتیں کی اون چھوٹے ہیں تو کوئی فکر ہی نہیں ــ جیسے کوئی حج ہی نئیں ــ آخر ہماری بیٹی کے چچا بھی تو ہوتا اون ــ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھتیں ذرا کہ ایسا پہاڑ دھرا ہو تو جی کیسا کیسا جلتا ہے ــ"

"ہیں یو رر رئی نا حضور چھوٹے پاشا جلدیچ واپس ہوئیں گے ــ ایسی بھی کیا بڑی عمر ہو گئی منی پاشا کی، ــ ابھی ابھی تو میں ان کی ساری گڑیاں گڈے سمیٹ کو رکھی ہوں ــ آپ جی نکو میلا کرو پھر زیادہ تشکر آتی نئیں تو ــ اب تو خدا خدا کر کے جی ذرا سنبھلا ہے ــ ذرا جی کو سنبھالے تو اُنے بھی سنبھلتا ــ نئیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا ــ"

نئیں بہار تو نئیں سمجھتی ــ ہمارے دل کو تو پورا یقین ہے کہ یہ ابا حضور کے کرتوتاں ہیں جو ہمارے سامنے آ رئیں ــ بھلا کیا بات تھی کہ لے کے تلجے میاں کو عاخ کر دیا ــ اب بچارے اون پاگل ہو کر اپنی زندگی گزار رئیں ــ وہ اکیلا بچ بے چارہ شا ہے ــ آگے پیچھے کوئی تو نئیں ہمارا اللہ جانتا کہ ہم اس کو الگ نہیں سمجھتے ــ اب تو ہی دیکھ اسے پڑھایا لکھایا کہ نئیں ــ؟ بے چارہ نوکر خانے میں اُدھرچ کوٹھریا میں پڑا رہتا ہے ــ ہم تو کبھی الگ بھی نہ کرتے پن وہ اماں کا مزاج معلوم ہے ــ اپن کو تو اچھے سے معلوم ہے کہ یہ ساری فکراں یہ مصیبتاں اسی مار سے ہیں ــ اللہ نے روپیہ پیسہ اِتّا دیا کہ چاہے تو کھندلتے پھر دین یہ فکراں کیا کم ہیں اللہ ہر ایک کے نصیب میں ایک نہ ایک دکھ ضرور رکھتا ہے ــ کسی کی خسمت کانٹے پر اتری ہے نہ اتریں گی ــ"

"پن حضور یوں جلتیں کیوں آپ ــ کڑھنے سے منی پاشا کی شادی ہو جارئی کیا ــ؟"

"ہم کو غصہ تو اس بات پر آتا ہے کہ یہ چھوٹے میاں اپنے بیٹے جگنو میاں کے رنگ ڈھنگ پر دھیان کیوں نئیں دیتیں ــ کتے برساں ہو گئیں کہ اُنے انگلینڈ میں پڑا سڑ رہا ہے ــ ایسا کیا علم حاصل کرنے گیا اُن ــ؟ اتنے دنوں میں تو ہماری شہابی چھ دفعہ بیرسٹری پاس کر کے

اے۔ ام۔ اے

پاس کروا لیتیں ورنہ بی۔ اے

آجاتی ـــ وہ تو اماں بی کے کہنے پر خود ہم نے اس کو اٹھا لئیں

"اتو کما لاں کرتیں آپ بھی ـــ ایسے اوندھے سیدھے باتاں نکو سوچو آپ ـــ اب چپ

کرنے کو بھی اُن کم نہ تھی ـــ"

چاپ سوجاؤ آپ میں پیراں دبا دیتی ـــ"

آنکھیں موند کر بابا نے بڑے ہی دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

خسم خدا کی ـــ ہمارا دل تو آج یہی چاہا کہ بس بصالت یار جنگ کے یہاں نسبت ہی کردیتے

پر ہماری کیا چلتی ـــ اور ہماری ہمت بھی کیا ہے کہ نوابوں کے بندھے ٹکے اصولاں توڑ دیتیں ـــ

بیٹی کے باپ ہو کر ہم میں اتی ہمت نہیں کہ اپنا داماد ڈھونڈ لیتیں ـــ ہم تو پیروں سے لے کر گلے

تک رسوں روایتوں میں جکڑ بند ہیں ـــ"

سچ ہماری یہ بندھی ٹکی رسمیں روایتیں ـــ انھوں نے تو ہمارے لئے تباہی کے بیج بوئے

ہیں۔ ہمیں اپاہج اور بزدل بنا دیا ہے۔ کتنی دُکھ دینے والی بات ہے کہ پھول سی گل باجی کو خود ان

کی اتی کنویں میں لوٹ دیں۔ محض اتنی سی بات پر کہ ان کو وہ سگائی پسند نہ تھی۔ جو ان کے بزرگوں نے

لگائی تھی۔

میں پوچھتی ہوں یہ شادی لڑکیوں کی ہوتی ہے یا ماؤں، باپوں کی ـــ ہش !

جب مسجد سے اذان کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اور نیلے آسمان پر اکّے دُکّے تارے

ٹمٹماتے ہیں اس وقت دادی اماں، روزہ افطار کرتی ہیں ـــ پانی کا کٹورا ہاتھ میں لئے وہ ہونٹ

بڑبڑاتی ہیں ـــ

"لڑکیوں ! ہاتھاں اوپر اُٹھاؤ ـــ مغرب کا وخت قبول دعا کا وخت ہے۔ رمضان

میں مغرب کے وخت مانگی ہوئی ہر دعا قبول ہوتی ہے ـــ"

میں نے ان اندھیارے اجیارے لمحوں سے سسک سسک کر بھیک مانگی ہے ـــ

دادی اماں دعائیں کہاں قبول ہوتی ہیں ـــ فادر گریگ اب میں کرسمس کے دن دعا مانگوں گی!

نئے سال کے اولین لمحوں سے دعا مانگوں گی -

رات کے پراسرار سناٹے میں حب بڑا گجر بارہ کے گھنٹے بجائے گا. حب پرانا سال رخصت ہو جائے گا. نیا سال اپنی باہیں پھیلائے ہمیں آغوش میں لے لیگا. اس لمحے میں سفید ریشم کا خوشبودار لباس پہنے — لوبان اور اگر کے دھوئیں میں چھپی چھپی کسی ان دیکھی طاقت کے آگے جھک جاؤں گی.

"اے آسمانی باپ ہماری روحوں پر رحم فرما."

اس رات آسمان پر چمکنے والے ہر ستارے کو میں اپنا رازدار بنا لوں گی - ان کے قدم چھوکر خوشامد کروں گی.

"میری پکار ان کانوں تک پہنچا دو— میرا درد ان آنکھوں کو بتلا دو— وہ تو تمہارے پاس ہے - تمہارے ساتھ ہے - اس ان دیکھی ہستی کو تم نے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی — کبھی تو اپنے دل کی دھڑکن کو غور سے سنو — وہ تم سے کس قدر قریب ہے. کس قدر........"

فادر گرنیگ میرے سر کو تھپ تھپا رہے ہیں.

"تم ایک دکھی روح ہو بے بی — میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں، — مگر رو نہیں —— تلاش کرو —تلاش - وہ ہر جگہ ہے —"

ٹپ — ٹپ — ٹپ - آج اماوس کی سی اندھیری رات ہے — مگر میرے آس پاس ڈھیروں ستارے جگمگا رہے ہیں - جھلملا رہے ہیں - —

کچھ دن اور گزرے ہیں

تصویروں میں نئے نئے رنگ بھر گئے ہیں. (رنگدار تصویروں سے خوشنما رنگ پونچھ لئے گئے ہیں.)

۱۹۴۷ء — پھر ۱۹۴۸ء — ہماری زندگیوں میں نئے نئے موڑ آرہے ہیں -

ایک بات بھول رہی ہوں — کچھ دنوں پہلے کی بات ہے. پاپا دالان میں سے گزرے

تو تایا میاں نے سرخ سرخ آنکھیں کھول کر انھیں دیکھا۔

سفید سفید سورج ایسی چمکتی دیوار سے ناخن سے چونا اکھیڑا۔ اور سرگوشی کے لہجے میں بولے۔

"دیواریں گر رہی ہیں — ہاں دیواریں نیچے آ رہی ہیں۔ سمجھتے ہو کچھ —؟؟"

(۶)

I can dream, Sir
I eat well and sleep well.
The Mad Lover

میں تیر کی طرح نکلی اور سیدھی شاہجے کے کمرے میں جا پہنچی۔ دھڑکتے دل، اور، پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بیقراری سے ہتھیلی بڑھا کر بولی۔

"غیب کا حال جاننے والے۔ مجھے بتاؤ میری قسمت میں کیا ہے۔؟"

شاہجے ایک لمحے کو ساکت رہ گیا، پھر ہمت کر کے بولا۔

"نہیں نہیں شابی — یہ بری بات ہے — ایسا نہیں کہا کرتے۔ غیب کا حال تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا — یوں خود کو گنہگار نہ بناؤ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا — صرف شوق کی خاطر پامسٹری پڑھ رہا تھا۔"

"اس دن تم نے کہا نہیں تھا شاہجے کہ جگنو کے ہاتھ میں تعلیم کی لکیریں بالکل مٹی مٹی اور نامکمل سی ہیں اور وہی سچ ہو رہا ہے۔"

"میری بارات کب چڑھے گی شاہجے — نحوست کے بادل ہمارے اردگرد منڈلا رہے ہیں — بابا اپنے حواس کھو رہے ہیں — بتا دو نا — ان لکیروں کو پڑھ ڈالو نا۔ — یہ انگلیاں کب مہندی سے سرخ ہوں گی —؟"

مجھے جذباتی سا دیکھ کر شاہجے متاثر ہو گیا — میرا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھوں میں لے کر

ڈوبتے سروں میں بولا۔ "تم۔ تمہارا ہاتھ ۔۔۔۔"

میں شاجے کے ہاتھ کو دیکھ رہی ہوں جس نے میرے ہاتھ کو تھام رکھا ہے۔ آج شاجے نے پھر میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ "تم بہت بڑی آرٹسٹ ہو، شابی ۔" دفعتاً وہ بڑی صاف آواز میں کہہ اُٹھا ہے۔

"آرٹسٹ ۔؟" میں حیران رہ گئی۔ "نہیں تو۔۔۔!"

"ہاں ہاں، ۔تم بہت۔ بہت بڑی آرٹسٹ ہو۔۔ دیکھو یہ تمہاری انگلیاں۔۔ کتنی لمبی کیسی مخروطی، ۔ گاؤدمی۔ کیسی اچھی۔ ایسی انگلیاں تو صرف آرٹسٹوں کی ہوتی ہیں"

"برائے خدا تم اپنا مطلب واضح کرو۔ کیا میں آگے چل کر موسیقار بنوں گی۔ یا افسانہ نگار یا مصوّر۔ یا۔ پھر۔۔۔۔"

اکدم شہابی بھاگتی ہوئی شاجے کے کمرے سے نکلی اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنی مٹھی میں ایک مڑا تڑا ڈرائنگ پیپر لئے داخل ہوئی۔ بڑی ادا سے شرماتے شرماتے اس نے میز پر وہ کاغذ پھیلا دیا ۔" دیکھو شاجے! پچھلی عید پر میں نے خود اپنے ہاتھ سے یہ عید کارڈ بنایا تھا کہ جگنو کو بھیجوں گی ۔ کیسا لگتا ہے یہ ۔ کیا تمہارا مطلب ہے۔ یہی آرٹ ہے ۔؟

شاجے آگے جھک گیا۔

شاجے کی لٹیں پیشانی پر جھک آئی تھیں ۔۔ اس نے ان جھکی ہوئی لٹوں کو جھٹکا دے کر پیچھے نہیں کیا۔ بلکہ یوں ہی بکھرا رہنے دیا۔ پھر جذبات سے عاری چہرے کو شابی کی طرف پھیر کر بولا۔

"تم نے اس میں دو ہاتھ کیوں نہ بنائے۔ ایک نرم و نازک لمبی لمبی آرٹسٹک انگلیوں والا ہاتھ۔ اور دوسرا مضبوط و توانا۔ جس کی انگلیاں سگریٹ پکڑتے پکڑتے زرد زرد سی ہو گئی ہیں۔ دونوں ہاتھ ایک دوسرے کو تھامے ہوئے ہیں ۔ عید کا مصافحہ ۔ آں ۔"

میں نے بڑے کرب سے شاجے کی طرف دیکھا

"کون جانے وہ مضبوط ہاتھ اس نرم و نازک ہاتھ کو تھامے نہ تھامے۔ یا تھام کر

چھوڑ ہی دے ــ یہ تو قصر دلپذیر کی ریت ہے شاہجے ــ یہاں عورت بیوی بھی نہیں ہوتی ــ محبوبہ بھی نہیں ہوتی اور اپنے بچوں کی ماں بھی نہیں ہوتی ــ صرف سیج سجائی جاتی ہے ــ وہ بھی محض دو ایک دن کے لئے ــ پھر تو بھونرا ہوتا ہے اور نت نئے پھول ــ پھولوں کی بھلا کیا قدر ــ وہ تو ایک دو دن میں ہی اپنا روپ کھو بیٹھتا ہے ــ زندگی گم ہو جاتی ہے۔ اور محض روایتیں ہی روایتیں باقی رہ جاتی ہیں ــ تنہا راتیں ـ تنہا دن اور تنہا دل ـ جو کتنا بھرتا ہے۔

"آؤ اکیلے ہیں اپنے سکون کے لئے جگہ تلاش کریں ــ"

اپنی بات کا جواب نہ پاکر شاہجے ذرا سکرایا ـ بائیں ہاتھ سے لاپرواہی سے کاغذ سمیٹ کر مٹھی میں دبایا اور موڑ توڑ کر پھینکتے ہوئے بولا ـ

"تو پھر اسے بیچا کیوں نہیں ــ" خود ہی بولا ــ "شائد عید گزر گئی ہوگی ــ"

"نہیں ــ" میں اس کی بات کاٹ کر بولی ــ "خوشیاں گزر گئی تھیں اور جب خوشیاں ....."

اس نے میری بات کاٹ دی ــ "مگر تم ہو واقعی آرٹسٹ ــ"

میں اسے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھتی رہی ــ

(پلکیں جھپکاتی ہوئی تم کس قدر معصوم نظر آ رہی ہو ــ !)

"آرٹسٹ سے میرا مطلب یہ نہیں کہ تم مصور ہو بلکہ تم ......" وہ چپ رہ گیا ـ

بولو ــ بولو ــ چپ کیوں رہ گئے ــ ؟

(تمہاری تو آنکھیں بھی باتیں کرتی ہیں ـ)

مجھے خاموش دیکھ کر وہ خود ہی کہنے لگا ــ "تمہارے بڑے خوبصورت ــ تندرست اور پیارے پیارے بچے ہوں گے ـ جنھیں تم ان نرم و نازک ہاتھوں سے خود ہی پالو گی ــ یہ کیا کوئی کم آرٹ ہے ــ ؟"

اب کے سے میں زور سے ہنس پڑی ـ

"اگر تمہارا یہی مطلب ہے تو ہر عورت آرٹسٹ ہوئی ــ"

"آف کورس ــ" وہ سر جھٹک کر بولا "ہر عورت آرٹسٹ ہے ــ بہت بڑی ــ

بہت بہت بڑی — میں اس کی عظمت کے آگے اپنا سر تعظیم سے جھکاتا ہوں —"

شابی حیرت سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ شاجے نیچے جھکا - اور جھکا - اور جھکا — اور اس کی آنکھیں دیدہ و دانستہ شابی کی آنکھوں میں اُتر گئیں۔ شابی کی آنکھیں اتنی بڑی تھیں کہ وہ آسانی سے ان میں سما گیا۔

میری چوٹیاں تکیئے سے نیچے لٹک رہی ہیں۔ صبح کی سنہری اور گستاخ دھوپیں بنا اجازت ہی میرے کمرے میں در آئی ہیں۔ میری آنکھیں بوجھل بوجھل سی ہو رہی ہیں۔ کاجل کی دھاریاں پھیلی پھیلی سی ہیں — کیا نیند میں میں رو تی رہی ہوں —؟

چھپر کھٹ سے نیچے میری مخملی چپلیاں دھری ہیں۔ صنوبر منتظر ہے کہ کب میں اُٹھوں اور حمام کو جاؤں — دھوپوں اور خوابوں پر کسی کی حکومت نہیں۔ ان کرنوں کو دیکھو کیسے گستاخانہ تھرکتی پھر رہی ہیں — خواب بھی تو یونہی نڈر بے دھڑک چلے آتے ہیں۔ شاجے نے کبھی تو اس کمرے میں قدم دھرنے کی جرأت نہ کی ہوگی۔ پھر اس میں اتنی نڈرتا کیسے آئی کہ جس کمرے میں کبھی قدم نہ دیا، اس کی مالکہ کی آنکھوں میں گھس آئے —؟

یہ شاعر بھی خوب ہوتے ہیں — پاگل کہیں کے۔

(۷)

"تیرگی اور بڑھی"

سنہ ۱۹۵۰ء

رات تاریک ہے۔ خاموش ہے — اندھیرے بھیانک ہو رہے ہیں — نہ کہیں چراغ جلتے ہیں۔ نہ ستاروں کی شمعیں روشن ہیں۔ کیسی بھیانک اور کیسی خوفناک تاریکی ہے؛ کیسی کالی رات ہے —؟

"رات کبھی خوفناک نہیں ہوتی شوبی بی بی — اجالوں کو اندھیروں کا نام دینے کی ادا تم

نے کس سے سیکھی ۔ تمہارے سر پا تنا بڑا تھال ایسا چاند جھلملا رہا ہے ۔ اس کی کرنوں میں نہائی ہوئی تم کیسی سنہری شہزادی لگ رہی ہو ۔ بتاؤ تو اس سنہری روشنی کو اندھیرے کا نام تم نے کیسے دیا ۔؟

قصر دلپذیر کا ذرہ ذرہ آج خاموش ہے ۔ سب سہمے سہمے دبے دبے قدموں سے چل پھر رہے ہیں ۔ گویا کسی کی لاش گھر میں پڑی ہو ۔ کسی میت کو دفنایا جانے والا ہو ۔ ہاں آج ہم نے اپنے محل میں موت کو اترتے دیکھا ہے ۔ آج ہم اپنی خوشیوں کی لاش کو دفنانے جا رہے ہیں ۔ یہ سامنے ہی تو میت دھری ہے ۔

جاگیریں چھن گئیں ۔ زمینیں چھن گئیں ۔ خوشیاں لوٹی جا رہی ہیں ۔ اب کچھ نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔ بس آنکھوں میں آنسو ہیں اور لب پر خاموش آہیں ۔

بس ایک تایا میاں خوش ہیں ۔ آج ان کی زبان پر قرآن پاک کی آیتیں ہیں ۔ آنکھوں میں خون برساتی ہوئی سرخی ۔ ان کے ہونٹوں پر معصوم مسکراہٹ ہے ۔ جیسے خواب میں بچہ مسکراتا ہو ۔ ننگا بدن لئے وہ اسی جگہ بیٹھے ہیں ۔ جہاں آج سے کچھ دن پہلے دادی اماں نے انھیں رسیوں سے بندھوا کر بٹھا دیا تھا ۔ اس دن آج سے بھی زیادہ بھیانک سناٹا تھا دن اتنا تاریک تھا کہ رات کا گمان ہو ۔ تایا میاں ۔ بڑے بے کل بے کل محسوس ہو رہے تھے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر کہہ نہ پاتے ہوں ۔ وہ بار بار اپنے جسم کا پورا زور لگاتے کہ رسیاں کھل جائیں مگر نہ کھلتیں ۔

پھر انھوں نے سرخ سرخ آنکھوں سے رسیوں کو گھورا اور رسیاں آپ ہی آپ ٹوٹ گریں ۔ آزاد ہوتے ہی انھوں نے ایک دوڑ لگائی اور سیدھے صحن کے بیچوں بیچ جا کھڑے ہوئے ۔ وہاں سے بھاگے تو پاپا کے کمرے میں پہنچ کر رک گئے ۔ سفید چاندی ایسی چمکتی دیوار کے کونے میں منہ پھیر کر وہ بڑے کرب ناک انداز میں گانے لگے ۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تایا میاں مجذوب تھے ۔ جو کہتے وہ پورا ہو جاتا ۔ میں نے شاید بتایا نہیں کہ یہ اُسی

دن کی بات ہے کہ جب ہمارے سروں پر رات کی تاریکی نے بھرپور سایہ کر لیا تھا۔

روشن لندن سے واپس آگیا ہے — اس بات کو زمانے بیت گئے ہیں۔ پرانی باتیں میں کیوں یاد کر رہی ہوں۔؟

ماضی کو دفن کردو۔ ماضی سوائے آنسوؤں کے تمھیں کچھ نہیں دیگا۔ مت سوچو — بھول جاؤ — بھول جاؤ۔

بڑی پھوپھی کس قدر خوش ہیں — روشن پہلے ہی گورا چٹا تھا، اب تو اس کے رنگ میں گلابیاں جھلک رہی ہیں۔ اور چونکہ وہ نیلے نیلے پانیوں سے اُڑتا اڑتا آیا ہے۔ اس لیئے اس کی آنکھوں میں بھی نیلے سمندر موجیں مار رہے ہیں۔ ثمینہ سے اس کی شادی ہو رہی ہے — وہ بھولی بھالی لڑکی اب مطمئن ہے — بات کرتے میں شرما جاتی ہے — گالوں میں خون جھلکنے لگتا ہے سمندر پار سے جب ہونے والے شوہر ڈگریاں لے کر لوٹتے ہیں۔ تو ان کے منگیتروں کے دل کس انداز سے دھڑکتے ہیں —؟ بہت خوشی ہوتی ہوگی۔ تندرست اور مضبوط بازو دیکھ دیکھ کر از خود ایک جذبۂ خود سپردگی طاری ہوجاتا ہوگا۔

(بھول جاؤ — بھول جاؤ) میں کیا جانوں۔ میں کیا سمجھوں — میرا ہونے والا شوہر تو ابھی وہیں نیلے نیلے پانیوں کے پرے اس دیش میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ جہاں دل چرانے کے لئے کئی کئی برف کی سی ملائم اور سفید گڑیاں ہر لمحہ آگے۔ پیچھے گھومتی رہتی ہیں۔

"اور عجیب بات یہ ہے کہ جگنو بھیا ابتک بی اے بھی پاس نہیں ہوئے ہیں — میں نے ان سے پوچھا تو ہنس کر بولے۔"

"جب تک گزرتی ہے گزرنے دو — اب تو لندن میں کچھ یوں دل لگ گیا ہے کہ دل چاہتا ہے عمر بھر فیل ہی ہوتے رہو —"

بابا نے ایک بڑی لمبی گہری سانس لی۔ (روشن تم لندن سے اتنی بڑی ڈگری لے کر آگئے مگر اتنی سی عقل نہ آسکی کہ ایک جوان اور ان بیاہی لڑکی۔ کے باپ کے سامنے ایسی بات نہیں کہتے جس کا داماد آگے ہی دکھ دے رہا ہو اور لڑکی پرانی روایتوں کو لیئے بال سفید ہونے کا انتظار دیکھ رہی

"اگر یہی رفتار رہی تو میں سمجھتا ہوں وہ عمر بھر پاس نہ ہو سکیں گے۔ انسان کسی کام میں دل ڈالے تب بات بنتی ہے۔ وہاں تو وہ ہیں اور لندن کا ہنستا بولتا حسن ۔"

اچھا روشن مان لیا کہ تم نے دو ہی سال میں پورا علم تحصیل کر لیا مگر اب زبان کو روک تو دو۔ کیا تم چاہتے ہو بوڑھے پاپا کل کے مرتے آج مرجائیں ۔ ؟ تم نے ڈاکٹر کی رپورٹ دیکھی ہے ۔ ؟ پتہ ہے شکر کا پرسن ٹیج ۶٪ ہو گیا ہے۔

"ہم مر گئے تو اچھا ہے خسم ہو لی کی اس زندگی سے تو ہم عاجز آگئیں ۔"

"ماموں میاں جلنے کڑھنے سے کیا ہو گا بھلا ۔ آپ یوں کیجئے کہ شوبی باجی کی شادی بڑے بھیا ...."

"خاموش ۔"

قصر دلپذیر میں بم جیسا کیا گرا ہے ۔ سب ادھر اُدھر بھاگ رہے ہیں ۔ دوڑ رہے ہیں ۔ آیائیں لپک رہی ہیں۔ باندیاں سراسیمہ ہو کر بھاگ رہی ہیں۔ پاپا بے ہوش ہو گئے ہیں ۔

پاپا بے ہوش ہو گئے ہیں

روشن ۔ روشن ۔ لندن جا کر کیا تم اپنی خاندانی روایات کو بھی بھول گئے ہو ۔؟

"اف یہ تنہائیاں ۔ یہ ویرانیاں ۔ کرسمس بھی گذر گئی ۔ (کتنی خوشیاں گذر گئیں؟

جین اسموکر مسز افضل ۔ (مجھے یقین ہے) ایک آدھ دن مجھے دھوئیں کے حلقے بناتے بناتے صلاح دیں گی ۔

"امریکی تیل استعمال کرو شہابی ۔ ایک دفعہ لگا لو تو چھ ماہ بال کالے ہی رہتے ہیں (گارنٹیڈ ۔ فائدہ نہ ہو تو دام واپس!)

(۸)

"سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے"

غالب کا دیوان میرے آگے کھلا پڑا ہے۔ پڑھتے پڑھتے اکتا کر میں نے دیوان بند کر کے رکھ دیا ہے اور خود سرخ سرخ بجری پر لیٹ گئی ہوں۔

"یہ بیٹھ بہت نرم ونازک ہے ۔ آبلے نہ پڑ جائیں گے؟"

"معصوم دوست ۔ پیٹھ کے آبلوں کا ذکر کرتے ہو اور اس مجروح روح کو بھول جاتے ہو جہاں چپے چپے پر تیر کھبے ہوئے ہیں ۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ قسّام ازل سے میں ایک نازک بدن مگر سخت جان لائی تھی ۔"

سب آوازیں خاموش ہیں صرف ذہن میں ایک گونج باقی رہ گئی ہے

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج!

اب لگتا ہے کہ ہر مشکل آسان ہوگئی ۔ اب تو پاپا کی حلقوں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھے لرزے پڑتے ہیں نہ دادی اماں کو اختلاج میں مبتلا دیکھ کر میرا دل کانپتا ہے۔ ہاں صنوبر کا انتظار اب بھی کرتی ہوں۔ جو چاندی کی تھالی میں ہرے ہرے چپلیے لفافے لاتی ہے ۔ مگر نیلا لفافہ نہیں لاتی ۔ نیلا لفافہ ۔ نیلا خط۔ نیلا آسمان ۔ میری مسرتوں کا آسمان ۔

جانے دل کو کیسا سکون مل گیا ہے ۔ نیلا نیلا آسمان مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے امی نے میرے لئے نیلی اوڑھنی بنائی ہو ۔ اور چمکدار سنہری اشرفیاں اس پر ٹانک دی ہوں کہ یہ میری شہابی پہنے گی۔

یہ بہتی بہتی خنک ہوائیں اب مجھے دل چھیدتی محسوس نہیں ہوتیں بلکہ لگتا ہے کہ میری روح اتنی ہلکی ہوگئی ہے کہ پردوں کی مانند ہواؤں میں اڑی جا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے قصر دلپذیر کی کوئی کنواری کبھی اتنی مطمئن نہ رہی ہوگی۔

سرخ سرخ بجری میں پڑی پڑی میں اپنے آپ کو کتنی مطمئن ۔ کتنی آسودہ نظر آ رہی ہوں

مجھے اپنے آس پاس روشنیاں سی جھلملاتی نظر آ رہی ہیں ۔ یہ کون ہے جو میرے دل پر چھا رہا ہے۔ یہ کیسی تسلی ہے ۔ کیسی آواز ہے ۔

سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے ۔

نہ گھبرائے ۔ نہ گھبرائے ۔ نہ نہ

نہ گھبرا اے دل ۔ چل کسی گوشے میں اپنے لئے سکون تلاش کریں ۔ دائمی سکون ۔ ہاں مجھے اور کسی کا نہیں بس تیرا ہی سہارا ہے ۔ تیری ہی ہمت ہے ۔ چل میرا ساتھ دے

سحر قریب ہے ۔ سحر قریب ہے

نہ گھبرا ۔ نہ گھبرا ۔ دل سے کہو نہ گھبرائے

چلو چلو ۔ جلدی جلدی ۔ سکون تلاش کریں ۔ گوشۂ عافیت تلاش کریں ۔ دائمی سکون ۔ سحر قریب ہے دل سے کہو ۔ کہو ۔ کہو

شاید گنگنا رہا ہے ۔

موت ۔ جو دوست کو دوست سے چھڑا دیتی ہے ۔

موت ۔ جو بھائی کو بھائی سے چھین لیتی ہے ۔

آؤ ہم تم اپنے دل ایک دوسرے سے جوڑ لیں ۔

اور قریب ۔ اور قریب ۔

پھر اپنے راستے پر چلتے چلتے جب کبھی اس سے ملیں

تو ہمارے ہاتھ آپس میں ملے ہوئے ہوں

موت ۔ جو دوست کو دوست سے چھڑا دیتی ہے ۔

ہمیں نہیں چھڑا سکتی ۔ نہیں ۔

کمرے کے اندر سے یہ کیسی آواز آ رہی ہے ۔ یقیناً ہمارے دلوں میں کوئی چور دروازہ ہوتا ہے ورنہ یہ شاعر کیسے ہمارے دلوں کی بات اندر گھسے بغیر جان سکتے ہیں ۔

اب یہ آواز اونچی ہوتی جا رہی ہے ۔

اپنے راستے پر چلتے چلتے جب کبھی اس سے ملیں

تو ہمارے ہاتھ آپس میں ملے ہوئے ہوں ۔

خنک چاندنی میں گلاب اور موگرے کے پھول کھل رہے ہیں ۔ پھولوں کے ہیالے لرز رہے ہیں ۔ بڑی پیاری مدہوش کن خوشبو فضاؤں میں گھل رہی ہے ۔

تو ہمارے ہاتھ ....

" شابجے !" قصرِ دلپذیر کا پتہ پتہ چپہ چپہ میری باریک مگر تیز چیخ سے سہم اٹھا ۔ میرے ہونٹ ساکت تھے ۔ شابجے گھبرا کر سرخ بجری پر اتر آیا ۔ کیا اس نے میری سرگوشی سن لی؟ اس کے بالوں کی لٹیں آج بھی آوارہ تھیں ۔ دل کے پاس ان ہی اس کی قمیص اُڑ رہی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں آج بھی وہی میری آنکھوں میں اترنے کی سی بیتابی تھی ۔ اس کے بے چین ہونٹوں پر آج بھی وہی بے چین دعا مچل رہی تھی — میں تمہارا ہوں ۔ میں تمہارا ہوں ۔ میں ....

"شابجے ۔ شابجے ۔" میں تیزی سے بڑھی ۔ "ذرا اُدھر ہٹو شابجے ۔ اُدھر ہٹو ۔"

"کیا ہے شابی — ؟" وہ اور بھی گھبرا گیا ۔ "کیا کہہ رہی تم ۔ کدھر ہٹوں — ؟ میں تو خود ہی تم سے دور دور ہوں —" وہ آنسوؤں میں ڈوبتے ہوئے بولا

جذباتی ہیروئن نے ایک لمحے کے لئے ہیرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔ دوسرے ہی لمحے میں بڑے عزم سے کہہ رہی تھی

" نہیں شابجے ذرا اپنے پاؤں تو ہٹاؤ — تمہارے ان قدموں کے نیچے میرے سہاگ کی افشاں جگمگا رہی ہے ۔"

شابجے چونکا

" میرے شاعر ۔ میں جانتی تھی میرے سہاگ کی افشاں اور کہیں نہیں ۔ یہیں کہیں اسی کنج میں ہے — اسی جگہ —"

میں نے اس کے سفید سفید مومیائی پیروں کے نیچے سے سرخ سرخ بجری اٹھائی اور اپنی مانگ بھر لی ۔

شلبجے منہ سے کچھ نہ کہہ سکا — اس کی زندگی کا سارا کرب — ساری خوشیاں سارے جذبات — اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے — اس نے غیرارادی طور پر ان میناروں اور کلسوں کو دیکھا، جن کی ہیبت ناک بلندی میرے قدموں میں رُل رہی تھی۔

میں اپنے شاعر کے اور قریب ہوگئی — "تم تو شاعر ہونا شلبجے — تمہیں تو ان قید خانوں کے خلاف آواز اُٹھانی چاہیئے ناکہ......"

شلبجے نے وہاں سے نگاہیں ہٹالیں — اور میری آنکھوں میں چپ چاپ اترتا چلا گیا

(۹)

دیارِ حبیب

اس رات جب میں مضبوط اور ہم آہنگ قدموں سے چلتی چلتی اپنے کمرے کو جانے لگی تو حوض کی منڈیر پر تایا میاں کو بیٹھا دیکھا — جو پانی میں تیرتے ہوئے چاند کو دیکھ کر ہنس رہے تھے — میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ بغیر مڑے، خوشیوں بھری آواز میں بولے

"میری "بیٹی تو آج دیارِ حبیب سے ہوکر آئی ہے۔"

میرے گالوں پر افشاں بکھر گئی — آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے — میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ کھڑی چاند کو تکتی رہی جو آج بن بلائے ہی میرے دل میں اُتر رہا تھا۔

"میری بیٹی تو دیارِ حبیب سے ہوکر آئی ہے..."

چھلانگیں مارتے وہ باغ کی روشوں میں گم ہوگئے — میں نے چاندنی میں چمکتے اس دیار کی طرف دیکھا — جہاں میرا حبیب تھا۔ محبت اور غرور سے میں نے اپنا سر جھکا دیا۔

آسمان سے کہکشاں ٹوٹی اور میرے قدموں میں آبچھی — میرے گالوں پر —— میرے ہاتھوں پر —— میرے پیروں پر — ستارے ہی ستارے کانپ رہے تھے۔ چمکدار اور گرم گرم —

آنسو بھی تو گرم ہی ہوتے ہیں نا — اور چمکدار بھی —!!

مسعود میاں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے

ابھی صبح کا ملگجا ملگجا اندھیارا دور نہیں ہوا تھا — دالان میں تو آنگن کے مقابلے میں یونہی زیادہ اندھیرا تھا۔ ساری چیزیں مٹی مٹی اور غیر واضح تھیں — مگر روشنی کی کمی کے باوجود مسعود میاں نے دیکھ لیا کہ ان کا بستر آج پھر گیلا گیلا سا تھا —! سانس روک کر اَدھ کھُلی ادھ بند آنکھوں کو مَل مَل کر انھوں نے سر نیچے جھکا دیا۔ ان کا شبہ یقین سے بدل گیا۔ آج پھر وہی واردات ہو گئی تھی —!!

انھوں نے آہستہ سے رضائی اٹھا کر پلنگ کے نیچے دھر دی — مگر ان کی مایوسی اور گھبراہٹ دوچند ہو گئی جب انھوں نے دیکھا کہ رضائی کا ایک کونہ بھی گیلا ہو رہا تھا۔ چادر سے لے کر توشک۔ بلکہ شطرنجی تک اس نامرادی کے اثرات پہنچ چکے تھے۔ ان کا جی دھک دھک کرنے لگا۔ اندھیرے میں انھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دوسرے پلنگوں پر نظر دوڑانی شروع

کی ۔" کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے ۔؟"

بازو کے پلنگ پر اماں سوئی تھیں ۔ساتھ والے پلنگ پر ابا جان ۔ پھر تین پلنگوں پر انور میاں ، اخلاق میاں اور عظیم میاں ۔ سب کے سب صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھاتے مزے سے خرخر کر رہے تھے ۔ انھوں نے تشکر سے سانس لی ۔ اگر تینوں بھائیوں میں سے کوئی بھی دیکھ لیتا تو ان کی شرمندگی کی انتہا نہ رہتی ۔ منہ سے تو بھلا کیا کہتے مگر ان کی آنکھیں ؟ اچھا ہی تھا جو تینوں سو رہے تھے ۔

ابھی تو کسی کے اُٹھنے کا امکان نہ تھا ۔ ان کے چہرے پر خوشی سی چھا گئی ۔ اپنی چوری ڈھانکنے کا ایک واحد حل انھیں یہی نظر آتا تھا کہ چپکے سے بستر کی گونڈی بنا کر اونچی گھڑونچی پر رکھ دیں ۔ پھر اماں اٹھتیں تو خود ہی خبر ہو جاتی ۔

وہ بڑی آہستگی کے ساتھ بستر سے اُترے شیطرنجی ، توشک ، چادر اور تکیئے سلیقہ سے رکھے ۔ پھر رضائی تہہ کر کے پورے بستر پر پھیلا دی اور بستر لپیٹنا شروع کر دیا ۔ بڑی نفاست اور آہستگی سے انھوں نے بستر کی گونڈی بنالی ۔ ادھر اُدھر دیکھ کر چپکے سے وہ گونڈی اٹھا کر کندھے پر دھری ۔ اور دبے پاؤں ، دالان سے ہوتے برآمدے میں آئے اور کونے میں رکھی تین پاؤں کی گھڑونچی پر وہ گونڈی بوغبن سے ڈھانک کر رکھ دی

" دودھ لے جاؤ ۔"

باہر سے دودھ والے کی تیز اور بھدی آواز آئی ۔ وہ اکدم باورچی خانے کو لپک پڑے وہاں سے لوٹا اُٹھایا اور باہر نکل گئے ۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ اِدھر دودھ والے نے پکارا ہو، اور اُدھر مسعود میاں لپکے آئے ہوں ۔ جب تک وہ جھلا جھلا کر تین چار آوازیں نہ دے لیتا یہ بستر سے ہلتے بھی نہ تھے ۔ پھر بڑی کسمساہٹ کے ساتھ کروٹ بدلتے ، آنکھیں ملتے ، منہ ہی منہ میں بدبداتے اُٹھ بیٹھتے ۔ لوٹا اٹھا کر باہر نکلتے نکلتے میں ادھر دودھ والے کا مزاج خاصا گرم ہو جاتا ۔ الجھ کر بولتا ۔

" مجھے اور بھی گھر ہیں یا بس ایک تمہارا ہی گھر رہ گیا ہے ۔" ؟

مسعود میاں نہ ہنستے نہ جھلاتے ۔ بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے لوٹا آگے بڑھا دیتے اور وہ چار پاؤ دودھ ڈال دیتا ۔ جاتے جاتے بڑبڑاجاتا ۔

"اگر کل سے جلدی دودھ نہ لیا تو میں راتب توڑ دوں گا ۔"

یہ کئی زمانے کا بندھا بندھایا معمول تھا ۔

آج مسعود میاں کو ایک ہی آواز میں موجود دیکھ کر دودھ والے کی باچھیں پھٹ پڑیں

"اتنے سبیرے سبیرے کیسے جگ پڑے آج ؟"

مسعود میاں بُری طرح کھسیائے ۔ کہیں اُسے بھی تو پتہ نہیں چل گیا! ہاں لہجے میں تو خاصا تمسخر ہے اس کے ۔ انہوں نے لوٹا پکڑے ہی پکڑے بڑی چور نگاہوں سے اپنے پاجامے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کم بخت نامرادی ۔! انھوں نے گھبرا کر نظر اُٹھائی تو دودھ والا لوٹے میں دودھ ڈال چکا تھا

"یہ ایسے کھوئے کھوئے کاہے کھڑے ہو جی میاں ۔ لوٹا پکڑو گے کہ نہیں ۔"!

انہوں نے بوکھلا کر لوٹا جو زور سے چھینا تو دودھ چھلک کر زمین پر گر پڑا ۔ وہ چلا کر بولا ۔" اور جو بی بی باتیں کریں گی کہ دودھ کم دیا تھا تو میں صفا بول دوں گا ، میاں نے چھلکا دیا تھا ہاں!" ۔ اور وہ بڑے بڑے قدم اُٹھاتا آگے بڑھ گیا ۔

گھر میں ابھی تک سوتا پڑا تھا ۔ اب صبح کی ہلکی ہلکی روشنی سارے گھر میں پھیل رہی تھی ابھی اماں اُٹھیں گی ۔ بھائی لوگ اُٹھیں گے ۔ پھر ابا جان ۔ اور ۔ اور ۔ وہ اس سے آگے سوچنا نہیں چاہتے تھے ۔ مارے شرم اور ندامت کے ان کا دماغ بوجھل ہونے لگا ۔ وہ لوٹا باورچی خانے میں رکھ ، جلدی سے حمام میں گھس گئے ۔ دانتوں پر جلدی جلدی منجن گھس کر انھوں نے دو چار اُلٹی سیدھی کُلیاں کیں ۔ اور جلدی سے کپڑے اتار کر دیتی کونے میں پھینک دیئے اور خود نل کی ٹونٹی کے نیچے کھڑے ہو گئے ۔ نہا دھو کر جب صاف ستھرے کپڑے پہن کر وہ حمام سے باہر نکلے تو گو ان کے دل کو تھوڑا بہت اطمینان مل چکا تھا مگر پھر بھی وہ ذرا گھبرائے گھبرائے سے تھے ۔

باہر دالان میں سب اُٹھنے لگے تھے ۔ شرمندگی کے احساس نے پھران کا گلا دبوچ لیا ۔
انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ چپکے سے بیٹھک میں جاکر بیٹھ جائیں ۔ بیٹھک میں دادا میاں تسبیح پر پُٹ پٹ منہ ہلاتے وظیفہ پڑھ رہے تھے ۔ پوتے کو صبح ہی صبح صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس اور دُھلے دُھلائے جسم کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ آج بھی گھپلا ہو گیا ہے ۔ وہ وظیفہ پڑھتے ہی پڑھتے معنی خیز انداز میں مسکرائے ۔ جیسے بولتے ہوں ۔
" میاں بوڑھا ہوں تو کیا ہوا ، سب سمجھتا ہوں ، آخر ہم پر بھی کبھی یہ زمانہ آیا تھا ۔"
دادا کو مسکراتا دیکھ کر ان کا خون رگوں میں جم گیا ۔
اندر جو شور و شر ہو رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اب سب جاگ پڑے ہیں ۔
اماں بستر چھوڑ کر اٹھیں اور منہ ہاتھ دھو کر جب دالان میں آئیں تو ان کا ماتھا ٹھنکا ۔
" آج پھر مسعود میاں نے اپنے ہاتھوں اپنا بستر لپیٹ کر رکھ دیا ہے ۔" انھوں نے دل ہی دل میں سوچا ۔
لپکی ہوئی وہ گھڑونچی کے پاس گئیں ۔ گونڈی اتار جلدی جلدی کھولی تو دیکھا کہ جو کچھ انہوں نے سوچا تھا وہی نکلا ۔ اور یہ آج کل کی بات تو تھی نہیں ۔ جب کبھی اتفاق سے مسعود میاں کا بستر گیلا ہو جاتا ۔ وہ یونہی گھر بھر میں سب سے پہلے اُٹھ جاتے اور عیب ڈھانکنے کو اپنا بستر خود اپنے ہاتھوں لپیٹ کر رکھ دیتے ۔

اماں نے ہر چیز کا جائزہ لے ڈالا ۔ یہ چادر ، یہ لحاف ، یہ توشک ۔ اور حد تو یہ تھی کہ وہ نمی سرکتی سرکتی شطرنجی تک پہنچ گئی تھی ۔ ان کا جی کھول اُٹھا ۔ انہوں نے زور سے پکار کر کہ میاں بھی سن لیں کہا ۔
" اجی دیکھتے ہیں ۔ اس کم بخت نے آج پھر بستر میں پیشاب کر دیا ہے ۔"
" ابا جان جو دانتوں پر مسواک ملتے بیٹھے تھے ۔ ہڑبڑا کر بولے ۔
"کیا کہا ۔ ؟"

اماں جھلا کر بولیں ۔" کہنا کیا تھا ، یہی کہ صاحب زادے نے پیشاب کر دیا ہے ، بھلے

خاصے نئے بستر ہیں ۔"

"پیشاب کر دیا !" وہ ناقابل یقین انداز سے بولے۔

"اور کیا کہہ رہی ہوں پھر ۔" وہ الجھ گئیں ۔ اس مہینے میں تو یہ چوتھی بار ہے ۔ اور جا لاکی تو دیکھو موئے کی ، صبح ہی صبح بستر لپیٹ کر رکھ دیتا ہے ۔ اور نہا دھو کر یوں تیار ہو جاتا ہے جیسے عید گاہ جانا ہو ۔"

میاں نے مسواک منہ میں پکڑے پکڑے :"ہوں ، ہوں" کی ۔ اور اس انداز میں ہاتھ سے بی بی کو دلاسہ دیا جیسے "ٹھہرو ابھی کمبخت کی خبر لیتا ہوں ۔"

کلی کر کے انھوں نے زوردار آواز سے پکارا ۔ "مسعود !" اس صور اسرافیل کے مسعود میاں بہت دیر سے منتظر تھے جیسے سن کر ان کا دم ہی نکل جاتا ۔

"جی ۔" انہوں نے دور سے مہم کر آواز دی اور قریب آ گئے ۔

اباجان نے حسب عادت اور حسب معمول وہی گھسا پٹا اور پرانا سوال دہرایا ۔

"میاں تم کس تاریخ کو پیدا ہوئے تھے ؟"

"جی سولہ دسمبر کو ۔" انہوں نے منمناتی آواز سے کہا

"اس حساب سے تمہاری کتنی عمر ہوئی ؟"

"جی گیارہ برس میں ایک ہفتہ کم ۔" انہوں نے انگلیوں پر حساب جوڑ کر نتیجہ سنایا ۔

"پھر یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ تم گیارہ برس کے ہو کر بھی روزانہ بستروں میں موت دیتے ہو ۔" انھوں نے خاصے عبرت انگیز لہجے میں غیرت دلانی چاہی ۔

انہوں نے رک رک کر کہا ۔ "اباجان روزانہ تو کبھی نہیں کیا ، اس سے پہلے مجھے یاد ہے کوئی پندرہ دن پہلے غلطی ہو گئی تھی ۔"

"نامعقول ۔ خاموش رہو ۔" اباجان اُدھر سے اماں کی لال لال شکل دیکھ کر پھر سے اُبل پڑے ۔" پندھرواڑے کے پندھرواڑے موتنا بھی کیا بڑی اچھی بات ہے ؟ تمہارے تین چھوٹے چھوٹے بھائی بھی تو ہیں کیا وہ کبھی ایسی واہیات حرکت کرتے ہیں ۔؟"

"جی میں خود تھوڑی ہی کرتا ہوں ۔ وہ تو آپ ہی آپ غلطی سے نکل جاتا ہے۔"
ابا جان گرج کر بولے ۔" اور جو کبھی آگے ایسی غلطی ہوئی تو یاد رکھو بچو جی ختنے کروادونگا"
حالانکہ آج سے زمانہ پہلے ،جب وہ چھلے کے اندر ہی تھے ۔ تبھی ان کے ختنے ہو چکے تھے ۔ مگر ڈانٹ میں رنگ بھرنے کے لئے اس سے اچھی بات اور کوئی نہ مل سکتی تھی ۔ کیونکہ مسعود میاں کے ہوش وحواس کے عالم میں جب عظیم میاں کے ختنے ہوئے تھے تو وہ مارے گھبراہٹ اور پریشانی کے دو دن تک نہیں سو سکے تھے ۔

مسعود میاں اپنے باپ کی سب سے پہلی اولاد تھے ۔ پھر ان کے بعد تین بیٹے اور ہوئے سب سے چھوٹے عظیم میاں کوئی دو ڈھائی برس کے ہوں گے ۔ مسعود میاں سب میں بڑے تھے اور اس بڑے پن کے ناطے ان کے سر اتنی ساری ذمہ داریاں تھیں کہ اگر ان کا ایک قدم بھی غلط پڑتا تو بھائی چیختے ہی چیختے ، ماں باپ بلکہ دادا میاں تک بلبلا اُٹھتے ۔ اگر کبھی گلی ڈنڈا کھیلنے میدان میں اتر آتے تو وہ کھیل بھی بڑے پن کی نذر ہو جاتا ۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ بڑے ہونے کے باوجود چھوٹے بھائیوں سے داؤں نہیں لے سکتے ! اماں اور ابا جان کا حکم تھا کہ اگر گلی ہاتھ میں آتی بھی ہو تو جان بوجھ کر اسے چھوڑ دو ۔ نشانہ ٹیڑھا کر کے باندھو تاکہ جیتنے کا امکان باقی نہ رہ جائے
" میاں بڑے ہو ۔ آخر چھوٹے بھائیوں سے بڑوں کا سا سلوک کیا کرو ۔"
گھر میں ابھی سب سوتے ہی ہوتے کہ دروازے پر دودھ والا پکار جاتا ۔ یہ کام مسعود میاں کا ہی تھا کہ صبح سویرے نیند کو توڑ کر دودھ لینے دروازے پر جائیں ۔ بھلا اولاد اور کون دن کے لئے ہوتی ہے کہ وہ ان کے کام کاج کا بار ہلکا کریں ۔ بھلا چھوٹے بھائی کہاں ایسے کام سنبھال سکتے ہیں ۔۔ ؟"

دودھ والے سے دودھ لینے کے بعد کاموں کا سلسلہ جو شروع ہوتا تو پھر سوتی رات تک ختم ہونے میں نہ آتا ۔ دودھ سے نپٹنے کے بعد وہ مرغیوں کا ڈربہ کھولتے ۔ انھیں کھول کر بطخوں کی کابک کی خبر لیتے ۔ رات کو اگر بطخوں نے انڈے دیئے ہوتے تو انھیں دھو دھلا کر الماری میں

لاکر رکھتے، پھر باورچی خانے میں جاکر پیپے میں سے جواری نکالتے۔ ہاون دستے میں دھمک دھمک کر اُسے چورا کرتے۔ اور پھر آنگن بیچ کھڑے ہوکر چلاتے۔ آ۔ آ۔ آ۔

مرغیاں اور بطخیں ان کی مانوس آواز "آ۔ آ" سنتے ہی لپکی چلی آتیں۔ کوئی ان کے ہاتھ کو نوچتا کوئی پیر سے لپٹ جاتا۔ وہ جلدی جلدی اپنے آس پاس پھیلے ہوئے دلنے بکھیر دیتے مرغیاں، بطخیں ادھر دانہ چگنے میں مصروف رہتیں تو یہ بالٹی میں پانی لے، جھاڑو اٹھا ڈربوں کے پاس پہنچ جاتے۔ اینٹ کا ٹکڑا لیکر رات بھر کی جمی ہوئی گندگی کھرچتے اور پھر پانی ڈال ڈال کے جھاڑو سے خوب صاف دھو ڈالتے۔ اتنے میں اماں چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتیں۔

"میری آنکھیں پھوٹی جارہی ہیں نامراد۔ لکڑیاں تو دیکھو ایسی گیلی گیلی ہیں کہ آنکھوں سے بارش ہوئی جارہی ہے۔"

جاڑے ہوں کہ برسات۔ گرمی ہو کہ سردی، اماں کے ہاں لکڑیاں سدا گیلی ہی ہوا کرتیں۔ وہ ہاتھ کی جھاڑو چھوڑ جلدی سے کرتے کے دامن سے ہاتھ صاف کرتے اماں کی طرف لپک جاتے۔

"جی کیا کہا؟"

"کہا تمہارا سر۔ دکھتا نہیں ماں کی آنکھوں سے دن بدن کم دکھائی دینے لگا ہے۔ اور اولاد دن بھر مستیاں مچاتی پھرتی ہے۔"

وہ سعادت مندی سے سر جھکا کر کچھ کہنا ہی چاہتے کہ اماں کی نظر ان کے ہاتھوں پر پڑ جاتی۔

"اے ہے۔ کم بخت مارے۔ ساری قمیص گندی کردی۔ ارے کلمو ہے۔ کوئی یوں کرتے سے گو موت کے ہاتھ پونچھتا ہے۔ اب بولوں تیرے دادا کو۔"

اک دم ڈر کر ہاتھ نیچے چھوڑ دیتے اور کونے میں پڑی ٹوکری اٹھا باہر کو بھاگ جاتے۔ لکڑی کا ٹال گھر سے تین قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ ٹوکری سامنے ڈال کر وہ بولتے۔

"آنتے بھر کی کلھیاں تو دے دو۔"

لکڑی والا حد درجہ منہ پھٹ تھا۔ اس کے منہ کے ساتھ ہی اس کا کاروبار بھی چلتا تھا ہنس کر بولتا، "کیوں جورو کا مردہ جلانا ہے کیا۔؟"

مسعود میاں بغیر کوئی نوٹس لئے دھیرے سے بولتے۔

"جلدی سے دے دو بھائی، ورنہ اماں پٹائی کریں گی۔"

لکڑیاں لے کر آتے آتے یہاں دوسرے کام ان کے منتظر رہتے۔ کبھی کبھار وہ گھگھیا کر اخلاق یا انو سے کوئی کام بولتے، تو اماں ابا۔ یا دادا کوئی نہ کوئی جھگھار لگا جاتے۔

ایسا کون کام تمہارے سر آ پڑا ہے کہ چھوٹے بھائیوں کو بھی سا جھے دار بنانے پہ تلے ہوئے ہو۔" وہ ذرا منمناتے تو دادا میاں بولتے۔ "ارے میاں چھوٹے بھائی ذرا بڑے ہو لیں پھر خود ہی تمہیں آرام مل جائے گا۔"

مگر اتنے زمانے سے کسی بات میں ذرا بھی تو فرق نہیں پڑا تھا۔ وہی روز مرہ کا معمول تھا۔ ناشتہ ہو چکتا تو دادا میاں سارے پوتوں کو عربی کی تعلیم دینے بیٹھ جاتے۔ آدھے وقت سوتے، آدھے وقت جاگتے، غلط پڑھنے پر معاف کر دیتے۔ اور صحیح پڑھنے پر چپت جما دیتے۔

"نامعقول ع کی آواز حلق سے نکالو۔" پھر اعوذ باللہ کا ع اس قدر زور سے حلق سے ادا کرتے کہ لگتا دو چار بکرے ذبح ہو رہے ہیں۔

ابا جان شام کو واپس ہوتے تو پھر دھائیں دھائیں مچ جاتی۔ ۔ اماں سر پہ پلو رکھے ادھر ادھر ٹپک رہی ہیں۔ چولھے پر چھنن منن ہو رہی ہے۔ چائے بن رہی ہے گوشت اُبل رہا ہے۔ بچے صحن میں دوڑ رہے ہیں۔ ایسے میں مسعود میاں ہر کام نبیڑ لیتے۔ ان کا جی آرام کو اور پیار بھری نگاہ کو ترس ترس جاتا گھر میں دل نہ لگتا۔ جی چاہتا گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں، مگر بھاگیں کہاں۔؟ اتنا ذرا سا تو محلہ تھا۔ اور پھر اس پر بھی اماں، ابا جان، اور دادا میاں کی تاکید کہ گھر سے باہر نہ جاؤ محلے کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلو۔ دو کوڑی کے ہو جاؤ گے۔ اور محلے میں بچے بھی کتنے تھے۔؟

چار چھ گھروں پر مشتمل تو تھا وہ محلہ۔ بازو والے گھر میں ایک خالہ رہتی تھیں۔ ان کے کل اولاد کوئی نہ تھی، دن بھر میں کوئی چار چھ مرتبہ چارپائی دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے وہ اس پر چڑھ جاتیں اور اماں سے پوچھتیں۔

"بہن کیا پکایا ہے — ؟"

اماں کو بڑا ارمان تھا کہ ان کی منہ بولی بہن کی گود بھر جائے ۔ اسی لئے اتنے چاؤ سے انہیں "بہن کیا پکایا ہے ؟" پوچھتا دیکھ کر ان کا دل کھل اٹھتا ۔ اور وہ بڑے پیار سے پوچھتیں ۔

"کیوں بہن رہ گیا کیا — ؟"

وہ ذرا ہنس کر، ذرا آزردہ ہو کر، بولتیں ۔ "ناں بہن ایسے ہی پوچھ رہی تھی ۔"

"نئیں میں سمجھی شاید بچے کا دل کسی چیز پر للچا رہا ہوگا ۔"

ان سے ہٹ کر ایک اور گھر تھا ۔ وہاں دو لڑکے تھے، دونوں ہی سدا اماں کی گود میں ٹھنسے رہتے ۔ کبھی گھر میں ایسا ہوا آٹا ختم ہو جاتا، یا مہینے سے پہلے تیل ختم ہو جاتا تو ایسے آپا کا گھر یاد آتا ۔ ڈول لئے لئے مسعود میاں دوڑ جاتے ۔

"جی ۔ جی ۔" وہ اٹک اٹک کر بولتے ۔ "اماں نے کہا ہے جی وہ آٹا ختم ہو گیا — آپ کے پاس ہو تو دے دیں ۔ ہمارا اناج پس کر آئے گا تو دے دیں گے ۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھتیں ۔ "کیا بات ہوئی لے جاؤ جب آئے دے دینا ۔"

پھر اس سے لگ کر ایک منحنی آنکھوں والے مولوی صاحب رہتے تھے ۔ مسجد والے پیش امام کی طبیعت اگر کبھی بوجہ زکام یا کھانسی خراب ہو جاتی تو جماعت سے نماز یہی پڑھواتے ۔ ان کے گھر میں بال بچہ کوئی نہ تھا ۔ ایک سوکھی ماری بڈھی نقی جوان کے کھانے دانے کا انتظام کر دیا کرتی ۔

ان کے بازو ایک چھوٹا سا پکا مکان تھا ۔ یہاں کرائے کی دکان والے سلیمان خان رہتے ان کی بیوی کا انتقال آج سے کئی سال پہلے ہو گیا تھا ۔ تب سے اب تک انہوں نے کوئی شادی نہ کی ۔ مسعود میاں کی عمر کا ایک بچہ تھا ۔ جو سدا اپنی اکڑ میں رہتا ۔ سفید ہرک کے کھڑکھڑاتے پاجامے اور اونچی کالر کی سلکن قمیص پہنے وہ دن بھر المونیم کے بکھر والی غلیل سے (جو اس کے والد شہر سے لائے تھے) گرگٹ اور چڑیاں مارا کرتا ۔

سارے محلے میں ملا کر بمشکل دس بارہ لڑکے تھے ۔ دوپہر کو جب سارے ماں باپ سو جاتے تو یہ مرغے گھر سے نکل آتے اور لڑ لڑ کر برا حال کر لیتے ۔ سہ پہر کو دھوپ اپنا رخ بدل دیتی

اور تیز دھوپوں میں ہوا کے جھونکوں کی لپک بھی آنے لگتی تو یہ لڑتے بھڑتے اپنے اپنے ڈربوں میں چلے جاتے، مگر مسعود میاں کا دل شاہ آڑ بورڈ میں اکیلا اکیلا ہی رہتا۔

"کوئی مجھے پیار نہیں کرتا —" رہ رہ کے یہی دکھ ان کے جی کو کھائے جاتا۔ دل بہلنے کا کوئی سامان نہ تھا۔

ایک دن نیم کی ٹھنڈی چھایا تلے سب کھیل کود رہے تھے۔ مسعود میاں چنو سے باتیں کرنے لگے، چنو نے باتیں کرتے کرتے غور سے ان کی طرف دیکھا اور بے تکے پن سے بولا۔

"ارے یار یہ تمہاری انگلیوں کو کیا ہوا —؟"

انھوں نے شرما کر قمیص میں اپنے ہاتھ چھپا لینے چاہے۔ مگر تب تک وہ پوری طرح انگلیوں کا جائزہ لے چکا تھا۔ اب سوائے سچ بول دینے کے انھیں کچھ نہ سوجھا۔

"مرغیوں کا ڈربہ صاف کر رہا تھا کہ چھل گئیں۔!"

"ہات، تمہاری کی —" وہ ہنس کر بولا۔ "مہتروں کی طرح مرغی کے ڈربے صاف کرتے ہو۔ شو۔ ہی، ہی۔ ہی۔" وہ اونچے اونچے ہنسنے لگا۔

"کیوں تم نہیں کرتے —؟" وہ حیرت سے بولے۔ ان کے لئے تو بڑے تعجب کا مقام تھا کہ لڑکے یونہی بیٹھے رہا کریں۔

"ایسے کام اپن نہیں کرتے۔ بھئی اماں آخر کس لئے ہیں؟"

"اماں —؟" وہ اچک کر بولے۔ "اماں ڈربے صاف کریں گی بھلا —؟"

"ارے واہ یہ کام ہوتے ہیں عورتوں کے۔ ہم تو جناب مزے سے بیٹھے رہتے ہیں پڑھنے کو گئے، وہاں سے آئے کھیلا کودا۔ اور مزے سے لمبی تان دی۔ معاملہ ختم۔"

"پڑھنے کو کہاں جاتے ہو؟" انہوں نے بڑی لگن سے پوچھا۔

"وہ اسکول ہے کہ نہیں ...."

مسعود میاں خود ہی بول اٹھے۔ باپ رے۔ اتّی دور۔!"

"تو کیا ہوا۔؟ ابا کہتے ہیں ورزش ہو جاتی ہے۔ وہاں مزے سے پڑھتے ہیں شام ہوئی

گھر واپس ۔"

"کیا پڑھتے ہو ۔؟" انھوں نے ذرا اشتیاق سے پوچھا ۔" عربی ۔؟"

"عربی ۔ ہاں عربی بھی ، اردو بھی اور انگریزی بھی ۔"

"انگریزی کیا ۔؟" وہ حیرت سے بولے

"بھئی ہوتی ہے ایک چیز ۔ اب جیسے کتا ہے نا ۔ تو ہم اسے کتا کہتے ہیں ۔مگر انگریزی میں اسے ڈوگ بولتے ہیں ۔"

"اور بلی کو ۔؟" وہ خوشی اور قدرے حیرت سے بولے ۔

"کیٹ ۔"

اور بکری کو ۔؟

"گوٹ ۔"

"اور مجھے ؟"

"بوائے ۔"

اور تمھیں ۔؟"

"مجھے بھی بوائے !"

ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں ۔ واہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو تم وہ میں ۔ دیکھو تو بھلا تمہاری صورت الگ ، تمہارے کپڑے الگ اور میں تو تم سے بالکل ہی مختلف ہوں"

چنو اکتا سا گیا ۔ ٹالنے کے انداز میں بولا ۔"یار ایسے ہی انگریزی جاننے کا شوق ہے تو ۔ اسکول میں داخلہ کیوں نہیں لے لیتے ۔؟

مسعود میاں کے جی کو بات لگ گئی ۔ شام کو باپ لوٹے تو انہوں نے بڑی ہمت کرکے کہا ۔" ابا جان ! ہمیں اسکول میں بھٹوا دیجئے نا ۔"

"کوئی ضرورت نہیں ۔" وہ حسب عادت اسی تیزی اور تندی سے بولے ۔" اسکول جاکر کمین لڑکوں کی صحبت میں ڈیڑھ کوڑی کے ہو جاؤ گے ۔ ایسا ہی شوق ہے تو ہم پڑھا دیں گے

انگریزی ۔ عربی اور اردو تو دادا میاں پڑھاتے ہی ہیں ۔"

ابا جان سے فرمائش کرنا ہی مصیبت ہو گیا ۔ اب وہ ہر شام انھیں لے کر بیٹھ جاتے اور سر کی مرمت شروع کر دیتے ۔ اے، بی، سی، ڈی، کی وہ رٹ لگتی کہ ان کا دماغ چکرا جاتا ۔ کس کمبخت کو انگریزی پڑھنے کی ایسی دُھن تھی، وہ تو فرار کی ایک راہ تھی مگر بری طرح پھنسے ۔ اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی کوئی کیا کرتا ۔

ابا، اماں، دادا میاں، بس سارا دن، ساری رات یہی لوگ دماغ پر چھائے رہتے ۔ تینوں چھوٹے بھائی بھی تو تھے، اتنا کام وہ بھی کر دیتے ۔ مگر مسعود میاں کی سی بُری قسمت ان کی کہاں تھی ۔ ؟ ایک دن انھوں نے دادا میاں سے بڑے دوستانہ انداز سے پوچھا ۔

"کیا بات ہے دادا میاں آپ لوگ مجھے اتنا پیار نہیں کرتے جتنا اخلاق، انور اور راجو کو کرتے ہیں ۔"

"تمہاری سمجھ کا پھیر ہے میاں ۔ بھلا اپنی اولا[illegible] سکتا ہے ۔ ؟ ۔ تمہارا خیال ہی خیال ہے بس ۔ در اصل تم بڑے ہو نا، تمہارے ماں باپ بھی بڑا سمجھتے ہیں ۔ تم ماشاء اللہ ذرا سمجھدار ہو ۔ اس لئے تم پر ذرا زیادہ ذمہ داری ہے ۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ۔ اور ایسی باتیں سوچا بھی نہ کرو ۔"

"جنو بھی تو منو سے بڑا ہے مگر اس کے باپ تو اس کے ساتھ ایسے ہی رہتے ہیں جیسے منو کے ساتھ ۔" انہوں نے بڑا واضح ثبوت پیش کیا ۔

"وہ جنو ۔ ارے نمبر ایک نامعقول ہے ۔ دیکھ لینا بڑا ہو کر باپ کی پگڑی اچھالے گا ۔ تمہاری سی بات کہاں ؟"

دادا میاں یوں منہ کے منہ پر تعریف کر رہے تھے کہ انھیں خوش ہوتے ہی بن پڑی ۔

"مگر دادا میاں کیا بات ہے اتنا کام کرتا ہوں پھر بھی اماں اور ابا جان جھڑکتے ہی رہتے ہیں ۔ انہیں ایسا تو نہیں کرنا چاہیئے نا ۔"

دادا میاں نے غور سے ان کی طرف دیکھا ۔

"تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتے ہیں میاں ۔ پیار بھی ماں باپ ہی کرتے ہیں اور غصہ بھی وہی کرتے ہیں ۔"

انھوں نے ذرا غیر یقینی انداز میں داد کی طرف دیکھا ۔

"ہاں بھئی خوش ہونے کے موقعے پر وہ خوش بھی ہوتے ہیں ۔ اور غصے کے موقعے پر ذرا ڈانٹ بھی دیتے ہیں، تو تم خواہ مخواہ دل بُرا کر لیتے ہو ۔"

مسعود میاں ہلکے پھلکے بدن کے آدمی تھے ۔ جھاڑوں پر چڑھ جانا، بندروں کی طرح لٹک جانا، دروازوں اور کھٹکوں کا سہارا لیتے لیتے روشندانوں تک پہنچ جانا، ان کے بائیں ہاتھ کے کرتب تھے ۔ ابا جان کو جالوں، کچروں، گھونسلوں سے سخت نفرت اور عین ان کے بستر کے اوپر چھت میں چڑیوں نے گھونسلہ بنا لیا ۔ جب دیکھو تب چڑ چڑ چوں چوں جاری ہے ۔ اب لاکھ لاکھ اماں صفائی کرتیں مگر بستر میں گھانس کے تنکے اور کاچر کوچر موجود ۔

مسعود میاں کو پتہ چلا کہ ابا جان یوں پریشان ہیں ۔ اس دن دوپہر کو جب ان کے دیکھتے چڑیا پھُر سے اپنے گھونسلے سے اڑ کے باہر گئی تو وہ پھدکتے پھدکاتے چھت پر جا بیٹھے ۔ روشندان سے لگ کے ہی گھونسلہ تھا ۔ بڑی احتیاط سے گھونسلے میں ہاتھ ڈالا ۔ ننھے منے سفید انڈے جیب میں رکھ لئے اور گھانس پھونس کو کھرچ کھرچا کر نیچے گرا دیا ۔

شام کو ابا جان آئے تو بڑی خوشی خوشی پاس گئے اور بولے ۔ "دیکھا ابا جان کمبختوں نے چوں چوں کر کے آپ کا دماغ الگ کھا رکھا تھا ۔ اور گھانس پھونس سے بستر الگ گندہ کرتی تھیں میں نے چڑھ کر قصہ ہی پاک کر دیا ۔" اور ثبوت کے طور پر انھوں نے چڑیا کے انڈے نکال کر بتائے

باپ نے ایک نظر انڈوں کو دیکھا اور پھر چھت پر نظر ڈالی ۔ سپاٹ لہجے میں بولے ۔

"اونہہ خواہ مخواہ اتنی اوپر چڑھے ۔ بانس سے بھی قصہ پاک ہو سکتا تھا ۔ ایسی فضول حماقتیں نہ کیا کرو ۔ اگر گر پڑتے اور ہاتھ پیر ٹوٹ جاتے تو ۔۔؟"

"کیوں دادا میاں ۔ آپ کی نظر میں یہ کوئی اچھا کام تھا یا بُرا ۔" ؟ مسعود میاں کی شنوائی

دادامیاں کی عدالت میں ہی ہو سکتی تھی۔

" میاں یہ بھی تو محبت ہی ہے، کتنے پیار سے انھوں نے کہا کہ اگر ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی تو۔ محبت نہ ہوتی تو ایسا کیوں بولتے بھلا۔ ؟"

کام کاج سے فارغ ہو کر وہ یونہی بدھوؤں کی طرح بیٹھے رہتے۔ کبھی گھونسلوں سے چڑیوں کے انڈے اتارتے تو کبھی چھت پر جا کر پتنگ اڑاتے، کہیں اماں کی نظر پڑ جاتی تو وہ جھڑک کر نیچے بُلا لیتیں۔

"کیسی مصیبت ہے۔" وہ تینوں بھائیوں کے، بلکہ محلے کے ہر لڑکے کے مقابل خود کو بے حد بدنصیب محسوس کرتے۔ بڑا ہونا ایسا بھی کیا جرم ہے کہ ساری مصیبتیں اپنے ہی سر۔ اب یوں اخلاق اور مسعود میاں کا کون بڑا فرق تھا۔ مگر کبھی اخلاق میاں بستر میں پیشاب کر دیتے تو یہ کہہ کر ٹال دیئے جاتے۔

" اونہہ۔ ابھی بچہ ہی تو ہے۔"

اور جو کبھی مسعود میاں کا بستر بھیگا ہوا ملتا تو یوں ناک سے رگڑائے جاتے! پہلی اولاد تو ماں باپ کو اتنی پیاری ہوتی ہے۔ مگر مسعود میاں یہی سوچتے کہ آخر ان کے ساتھ یہ سوتیلا برتاؤ کیوں۔ ان کے نصیب میں پیار کی اتنی کمی کیوں ہے۔

انھوں نے بے بس ہو کر دل بہلانے کی خاطر مولوی صاحب کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا بڑھی ماما بڑی باتونی تھی۔ کئی کہانیاں یاد ۔۔۔ انھوں نے ہفتے بھر میں کئی کہانیاں یاد کر لیں۔ اور پھر دل بہلائی کے لئے آ کر تینوں بھائیوں کو سنایا کرتے۔

" ایک تھا چوہا۔۔ وہ پھرتا آڑی، باڑی۔۔" یہ کہانی وہ بار بار رانو، اخلاق اور راجو کو سنا چکے تھے۔ پھر اس دوسرے چوہے کی کہانی ۔۔ " ایک تھا چوہا۔ اس نے پایا ایک رنگین ریشمی ٹکڑا۔ وہ پہنچا درزی کے پاس۔ درزی دادا، درزی دادا مجھے ایک رنگین ٹوپی سی دو۔ پھر ٹوپی سل جاتی، پہنی جاتی۔ چوری بھی ہو جاتی، اور مسعود میاں تیسری کہانی شروع کر دیتے۔۔

ایک تھا چڑا۔ ایک تھی چڑی، چڑا لایا چاول کا دانہ، چڑی لائی مونگ کا دانہ۔ کھچڑی،

ابھی بک بھی نہ پاتی کہ مسعود میاں کو احساس ہوتا کہ یہ سب دل بہلاوے ہیں۔ ان کا خاک بھی جی نہیں لگتا ایسی بے تکی باتوں اور بے ہودی کہانیوں میں ۔ پھر کیا کرتے ۔؛

شرارت سے تو اماں کو باپ مارے کا بیر تھا۔ کبھی وہ چھت چھتاری پر دھتیا مچانے جاتے بھی تو فوراً چاروں کے چاروں بھائی کان پکڑ کر نیچے بلا لئے جاتے ۔ ایک دن ایسے ہی حلوہ چرا کر کھلانے پر وہ چار چوٹوں کی مار پڑی کہ بس دن کو تارے نظر آنے لگے ۔ اب اس حلوہ کھانے میں چوری کی نیت کو اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ بس شرارت کا۔ مگر باپ رے وہ تو گھمسان کا رن جیسے پڑ گیا۔ اماں باوا دونوں کو ہی تربیت کا وہ نادر قمع ملا کہ بس یاد ہی رہ گیا۔

سنسان دوپہر میں وہ کام کاج سے نبٹ کر ڈھائیں ڈھائیں پھرا کرتے ۔

اس دن محلے میں کوئی مداری آنکلا۔ ایک بندر ۔ ایک بندریا۔ ڈگ ، ڈگ ، ڈگ ڈگ ۔ ڈگڈگی بجی اور محلے بھر کے سارے بچے اس کے پیچھے ہو لئے ۔ مداری نے سیر بھر اناج میں بندریا کا تماشا دکھلانے کی پیش کش کی ۔ ساروں کی صلاح ہوئی اور سب اپنے اپنے گھروں سے مٹھی مٹھی بھر گیہوں لے آئے ۔

پہلا سین یہ تھا کہ بندر بندریا کی شادی ہو رہی ہے ۔ بندریا بی سر جھکائے بیٹھ گئیں ۔ مداری قاضی بنا اور اعلان سا کر دیا کہ بس شادی ہو گئی ۔ اب دلہا میاں بی دلہن کے پاس آئے اور لگے گھونگٹ کھینچنے ۔ وہ جتنا گھونگٹ کھینچتے یہ اتنا ہی دور ، دور بھاگتیں ۔ بڑی مشکلوں سے نوشہ میاں گھونگٹ اٹھا پائے تو وہ اپنے ہاتھوں میں منہ گھسیٹ کر بیٹھ گئیں ۔ پھر سین بدلا کہ شادی کو دن گزر گئے ہیں ۔ اور بی بندریا بچہ جننے والی ہیں ۔ کبھی سی رہی ہیں کبھی بن رہی ہیں ۔ کبھی زچگی کی تیاری کے لئے میوہ چن رہی ہیں ۔ اناج صاف کر رہی ہیں ۔ اور بندر میاں ہیں کہ آگے پیچھے ہوئے جا رہے ہیں ۔ پھر بچہ بھی ہو گیا ۔ لکڑی کا چھوٹا سا بلم بطور بچہ سنبھالے ، بی بندریا اسے گودی چھاتی کر رہی ہیں ۔ اور بندر میاں اچک اچک کر بچے کو پیار کر رہے ہیں ۔ سین پر سین بدلتے گئے ۔ مسعود میاں کھیل کہاں دیکھ رہے تھے ۔ بچوں نے تالیاں پیٹیں اور مداری اناج سمیٹ ڈگڈگی بجاتا چلنے لگا تو جیسے یہ جاگ پڑے ۔

"بندر پالنا چاہیئے خوب دل بہلے گا —" مداری کے پیچھے دور تک چلتے ہی گئے۔ بہت دور جاکر اس سے بڑے سہمے سہمے پوچھا

"اے بھائی — یہ بندر کہاں سے لائے تم؟"

"خریدے تھے —" وہ چل چلاؤ کے انداز سے بولا۔

"کتنے کو —؟" وہ ذرا آگے بڑھ آئے

"یہاں نہیں ملنے کے، جنگل سے پکڑ کر لاتے ہیں، تب بیچتے ہیں لوگ —" وہ دم لینے کو یوں ہی نیم تلے رک گیا۔

"تم نے انھیں اتنا سارا کھیل سکھایا ہے —؟" وہ بڑی ہمت کر کے ایک ایک کر کے ساری باتیں پوچھ لینا چاہ رہے تھے۔

"گریب جنور ہوتا ہے۔ تھوڑے دنوں میں سب کچھ سیکھ جاتا ہے۔ بس محنت چاہیئے بندر تو پھر بندر رہے انسان سکھانے کو بیٹھے تو کتے بلی تک سدھ جاتے ہیں۔"

مسعود میاں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"کتے —؟"

"ہاں میاں — میرے پاس ایک کتا بھی ہے۔ سلام تو اس ڈھب سے کرتا ہے کہ پوچھو مت"

واپسی میں وہ بیبن خالہ کے یہاں ہوتے ہوئے آئے اور انہیں نیوتہ دینا نہ بھولے کہ آپ کی کتیا پلّے جنے تو ایک مجھے بھی دیجیئے گا۔

"اور تمہارے اماں باوا جھڑ جھڑ کریں گے تو ....؟"

یہ بات انہوں نے سوچی ہی نہ تھی۔ ایک منٹ رک کر بولے

"اس کی فکر آپ نہ کریں میں کیسے بھی لے تو جاؤں گا۔"

پندرہ دنوں بعد بیبن خالہ کی کتیا نے پیارے پیارے چار پلّے جنے۔ مسعود میاں روزانہ خیریت پوچھنے جاتے تھے۔ اس دن خالہ نے مژدہ سنایا۔

"میاں کتیا نے چار پلّے جنے ہیں۔"

"چار !" ان کا منہ فق ہو گیا۔ خوشی کے مارے ان کے ہاتھ پیر کانپ گئے۔ "کہاں ہیں؟
وہ حیرت اور خوشی سے بولے۔

"جھاڑ کے پیچھے مٹی کا ڈھیر پڑا ہے اس کی آڑ میں۔"

"میں اُٹھا لوں ایک۔" وہ ذرا ہچکچا کر بولے۔

"اوئی میاں ابھی سے۔؟ ابھی آٹھ چار دن ذرا دودھ پی لیں اپنی ماں کا پھر لے جانا۔
بس اپنی بات سے پھرتی تھوڑی ہی ہوں۔"

پندرہ دنوں بعد جب مسعود میاں پلّہ لے کر آئے چاروں میں بوم ہو گئی۔ اماں تو باورچی خانے
میں تھیں، ابا جان کام پر،۔ دادا میاں اپنے کمرے میں۔ بس چاروں بھائی تھے اور کتے کا پلّہ۔

"دیکھو اماں، ابا جان، یا دادا میاں سے بولو گے تو نہیں۔؟"

انھوں نے سب نے ہی گواہی لی۔ سب کسمسانے لگے، یوں جیسے راضی نہ ہوں۔

"ارے دیکھو تو اتنا پیارا ہے۔ اگر بڑوں نے پھنکوا دیا تو بے چارہ کدھر جائے گا۔ مر جائے گا
بالکل مر جائے گا۔ اور سارا عذاب ہم پر پڑے گا۔ وہ دادا میاں نے برسوں بتایا نہیں کہ کسی جاندار
کو بلا وجہ مار ڈالنا بڑے سخت گناہ کی بات ہے۔"

پہلے کھس کھس ہوئی۔ پھر پھُس پھُس۔ پھر زور سے سب بولے

"اچھا نئیں بولیں گے۔"

"ام بی نئیں بولیں گے۔" اجو میاں فخر سے چلّائے۔

مسعود میاں کو ان پر اتنا لاڈ آیا کہ پکڑ کر ان کے گال چوم لئے۔ موٹے موٹے گال۔

"تم بہت اچھے ہو اجو۔" وہ پیار کے نشے میں سرشار ہو کر بولے۔

"مگر بھائی اس کو رکھیں گے کہاں۔؟ یہ یوں چیں چیں کر رہا ہے تو کیا اماں، ابا اور
دادا میاں کو آواز نہ آئے گی۔؟" انور نے بڑے پتے کی بات کہی۔

"ہاں ابا اور اماں جان کا سوال ہے اب۔"

"اگر وہ دونوں بھی بہرے ہوتے تو کیا اچھا تھا۔" اخلاق میاں نے حد درجہ بداخلاقی کی

بات کی۔

"مگراب تو نہیں ہیں۔" انور بے بسی سے بولا۔

اکدم مسعود میاں اُچھل پڑے۔ "ارے دادا میاں بہرے ہیں نا؟"

"ہاں ہیں تو۔" دونوں حیرت سے بولے۔ مگر ان کے یوں اچھل پڑنے کا سبب ان کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔

"تو بس وہ دادا میاں کے کمرے کے پیچھے ایک کونا ہے نا۔ مہندی کا جھاڑ ہے جہاں۔"

"ہاں، ہاں ہے تو۔" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

اس سے ہٹ کر نیم کا بڑا والا جھاڑ ہے کہ نہیں، تو بس اس کونے میں نیم کے تنے سے رسی باندھ کر رکھا کریں گے۔ وہ چلائے گا بھی تو دادا میاں کہاں سن پائیں گے۔؟"

"بات تو ٹھیک ہے۔" سب کی عقل میں آ گئی۔

انہوں نے ایک بار تہدیدی انداز میں اور بھی سب سے پوچھ لیا۔ "دیکھو بھئی کسی سے کہو گے تو نہیں۔؟

"نہیں بھئی۔"

نہیں بھئی۔"

"نہیں بھئی۔"

تینوں چاروں دبے پاؤں گئے۔ مہندی کی نچلی والی ٹہنی سے رسی باندھ دی جسے کتے کے پلے کے گلے میں اٹکا دیا گیا۔ چاروں نے بڑے سوچ بچار کے بعد ہیرا نام دے دیا۔

دادا میاں کا کمرہ گھر کے سب سے آخری کونے پر تھا۔ بے چارے اونچا سنتے تھے، کتے کا پلّہ رات کو چیاؤں چیاؤں کرتا بھی تو سن نہ پاتے پندرہ دنوں کے پلے کی جان ہی کتنی اور آواز ہی کیا؟ وہیں کے وہیں چلائے جاتا اور یوں اماں اور ابا جان کے کانوں کان پتہ بھی نہ چلا کہ گھر میں پلّہ پل رہا ہے۔

اب مسعود میاں کا وقت اچھی طرح گذر جاتا۔ گو جی میں یہی کشمکش لگی رہتی کہ کہیں اماں نہ

دیکھ لیں، دادا میاں نہ دیکھ لیں۔ پھر بھی اپنے جی کو کتے کے پلے میں پھنسائے رکھتے۔ پیالیوں کی بچی ہوئی ساری چائے وہ چوری چوری ایک الگ سی پیالی میں انڈیلتے جاتے، اور جب اماں اِدھر اُدھر ہو جائیں تو ہیرا کو پلا آتے۔ دستر جب سمیٹا جاتا تو یہ کچرے کے ڈبے میں دستر تو جھٹک دیتے مگر بعد میں ساری ہڈیاں، چاول، بھجوٹن کے ٹکڑے سمیٹ لیتے۔ بڑی آہستگی سے چلتے نیم تلے تک جاتے اور ہیرا کو کھلا آتے۔ اگر مسعود میاں اپنے کام کاج میں اِدھر اُدھر ہو جاتے تو پھر تینوں بھائی اس کی خیر خبر لیتے۔ اپنے حصّے میں آنے والی مٹھائی، روٹی، حلوے سب کا حصّہ دار ہیرا ضرور بنتا۔

دادا میاں بہرے تھے۔ کتے کا پلّہ اتنا بڑا ہو گیا۔ رات بے رات، سردی، گرمی کبھی جو بلبلا کر ییوں ییوں کرتا تو صحن میں شور مچ جاتا، مگر آواز ان کے کانوں تک نہ جاتی۔ اماں کبھی تو کان اونچے کر کے سنتیں اور پھر کام میں الجھ کر بولتیں۔

"جانے کدھر موئے کتّے کے پلّے رو رہے ہیں۔ خدا خیر کرے بڑا ہول آتا ہے۔"

بیبن خالہ کا گھر ان کے اپنے گھر سے خاصہ قریب تھا۔ ان کے بلّوں کے پردے میں ہیرا کی آواز کی لاج رہ جاتی، اور یوں عیب ڈھک جاتا۔

کام کاج سے آ کر جہاں اِدھر اُدھر سے موقع ملا بس مسعود میاں چلے ہیرا کی سیوا کرنے اب اکثر یوں ہوتا کہ مسعود میاں اماں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تو پہلے پہل تو یہ ہوتا کہ اماں نے دھیان نہ دیا۔ مگر پھر بھی دھیان دیتے ہی بنی۔ یوں کہ بار بار آوازیں دینے پر بھی ان کا جواب نہ ملتا

"کہاں تھے میاں۔" اماں پوچھتیں

"ایسے ہی۔"

"ایسے ہی۔ کیا مطلب؟"

"وہیں باہر بیٹھا تھا۔"

"کیوں بیٹھنے کے لئے گھر نہیں دیا اللہ نے؟"

"گھر ہی میں تو بیٹھا تھا مگر ذرا باہر کی طرف تھا۔"

"کیوں کمرے نہیں ہیں ؟"

مسعود میاں سٹ پٹا جاتے ۔ پھر ایک آدھ بار بوم مچتی ۔ ابا جان بیر پٹخنے آتے اور چلا چلا کر پکارتے ۔

"مسعود میاں ۔ مسعود میاں ۔"

بڑی دیر بعد مسعود میاں کسی کونے کھدرے سے برآمد ہوتے ، تو اس ہیئت کے ساتھ کر انگلیوں میں روئی کے ذرے لگے ہوئے ہیں ۔ یا پھر کپڑوں پر چا اگری ہوئی ہے ۔

"کہاں تھے صاحب زادے ؟" وہ گرم ہو کر بولتے

"یہیں تو تھا ۔"

"اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے ۔ یہ اتنے گندے کیوں ہو رہے ہو ؟"

مسعود میاں جھٹ سے اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لیتے ،

دادا میاں کو ایک آدھ بار ادبدا کر پوتے کی یاد آجاتی تو گھر بھر میں ان کی بوڑھی مگر کراری آواز گونج جاتی ۔

"کہاں تھے عزیزم ؟"

عزیزم سٹ پٹا کر رکتے رکتے بولتے ۔

"جی ۔ جی سبق پڑھ رہے تھے ۔

"کون سا سبق ؟"

وہ مرمر کر یاد کرتے کہ سبق یاد آجائے ، مگر وہ بھی عین موقع پر دھوکا دے جاتا ۔ بات بنا کر بولتے ۔

"جی ۔ جی وہ میں اکیلے میں کوشش کر رہا تھا کہ عین کو حلق سے کیسے ادا کیا جائے ۔"

مفتا مفتی میں یہ سپاٹے میں آجاتے اور دادا میاں شاگرد کو لے کر بیٹھ جاتے ۔

"ہاں پڑھو ۔ اعوذ باللہ ...."

ہیرا مالک کے رنگ میں رنگ رہا تھا ۔ چھوٹی چھوٹی کئی باتیں سہہ کر سلا رکی

دھن میں تھا ۔ ننھا مالک اب کہیں جاکر مسکرانا سیکھا تھا ۔ پھر بھی وہ ننھا دل، ڈرا، ڈرا سہما

سہما دل، کسی طوفان کا منتظر رہتا ۔

ان کی ویرانیٔ دل کا وہی زمانہ پھر لوٹ آیا ۔ ابھی وہ نامکمل مسکراہٹ اتنی وسیع بھی نہ ہوئی تھی کہ پورے چہرے پر احاطہ کرلیتی کہ وہ سہارا بھی جاتا رہا ۔

ہیرا کو باندھ کر نہ رکھنے کی عادت تھی ۔ پتہ نہیں چاروں بھائیوں میں سے کس کی غلطی تھی کہ ایک دن ہیرا کھلا رہ گیا ۔۔ پہلے تو یونہی اپنی جگہ بیٹھا رہا ۔ پھر ذرا گھومنے کی جی میں سمائی اپنا کھونٹا چھوڑ کر اٹھے تو پہلے ابا جان کے کمرے کی طرف ۔ وہ نوکری پر گئے ہوئے تھے ۔ گھوم پھر کر باہر نکلے تو دالان سے ہوتے ہوئے دادا میاں کے کمرے کو چلے ، وہاں مسجد کا سا حال تھا جانماز، قرآن شریف، تسبیح ۔ بھنبھوڑے ۔ وہ نامراد وہاں گیا ہی تھا کہ دادا میاں نے یہ سمجھ کر کہ گلی کا کتا آگیا ہوگا ۔ اپنی کراری آواز سے اس زور سے دھت کہی کہ وہ الٹے پیروں واپس ہو گیا بعد میں بڑی شان سے دُم ہلاتے نکلے تو اماں کے کمرے میں ذرا کی جھانک کر باورچی خانے میں پہنچ گئے ۔ وہاں تو ایک سے ایک نعمت رکھی تھی ۔ چاروں بھائیوں کا کیا تھا ۔ جب کھلایا جھوٹا ہی کھلایا ۔ یہاں تو سب مال سانچا ۔ بڑی بے جگری سے ادھر ادھر منہ مارنے لگے ۔

اماں ہیں ہیں کرتی لپکیں ۔

" ارے یہ کم بخت کدھر سے گھس آیا ۔ نکالو ۔"

ہیرا میاں یوں آسانی سے کیا ٹلنے والے تھے ، یونہی منہ مارتے رہے ۔ اماں نے تلملا کر چمٹا اُٹھایا اور تڑ سے کمر پر دے مارا ۔ ہیرا کی کمر اور مسعود میاں کا دل الگ الگ کہاں تھے ۔ للک کر بولے ۔

"ہائے اماں جی ۔ غضب کرتی ہیں ، مر جائے گا بے چارا ۔"

" مر جائے گا تو اپنی جان سے جائے گا ۔ ہمارا کیا بگڑے گا ۔"

ادھورے ادھورے لفظ ان کے منہ تک آئے مگر نکل نہ پائے

اماں نے دھتکار بتائی تو بھی ہیرا وہیں کھڑا رہا ۔ اماں ابھی پھکنی اُٹھانی سے اس کی تواضع

کرتی ہی تھیں کہ مسعود میاں نے چمکار کر پاس بلا لیا۔

"ہیرا ۔ ہیرا ۔ چ ۔ چ ۔ چ ۔"

کھانے کا لالچ تھا ۔ مگر تھا تو سدھایا ہوا ۔ مالک کی آواز سنتے ہی دوڑا آیا اور پیروں پر دم گھسٹ پنجے چاٹنے لگا ۔ اماں پہلے تو یہ راز سمجھ ہی نہ سکیں ۔ پھر تو اک دم ان کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا ۔

"ہوں ۔ تو یوں کہو نا کہ تمہارا پلا ہے یہ ۔"

"جی ۔ جی ۔ نہیں تو ۔" وہ ہکلا کر رہ گئے ۔

"نہیں تو ۔ پھر یہ تمہارے بلانے پر کیسے آیا ۔ ؟ ۔ غضب خدا کا ، دیکھو تو نجس جانور یوں جسم پر لوٹیں لگا رہا ہے ۔ اور میاں کھڑے ہیں ، جاؤ جاؤ کپڑے بدلو ۔ اور میں اس گندگی کی پوٹ کو ابھی پھنکواتی ہوں ۔"

"نہیں نہیں ۔" وہ تڑپ کر بولے ۔ "ایسا نہ کیجئے اماں یہ سچ مچ ہمارے بغیر مر جائے گا ۔

"مر جائے ۔"

"ایسا مت کہئے اماں ۔ سچ دیکھئے تو اتنا چھوٹا سا تو ہے ۔ اس کو کون روٹی پانی دے گا ۔ کون اس کو ہڈی ڈالے گا ۔ اور پھر میں اس کو کیسے بھولوں گا ۔"

"ہونہہ ۔" اماں نے زوردار ہونہہ کے ساتھ پلو سر پر ڈالا ۔ اور ہیرا کے گلے سے بندھی رسی سے اسے گھسیٹتی چلی گئیں ۔

دو دن تک تو مسعود میاں کو یہی پتہ نہ چلا کہ رات کب ہوتی ہے اور دن کب نکل آتا ہے بس بستر تھا اور یہ تھے یا پھر آنسو ۔ تکئے میں منہ چھپا چھپا کر پھس پھس روئے جاتے ۔ اماں نے جو کہا وہ کر کے بتا بھی دیا ۔

مسعود میاں نے کہیں سن رکھا تھا کہ کتا کبھی اپنا گھر نہیں بھولتا ۔ بارہ مہینے بھی باہر رہے تو کبھی نہ کبھی لوٹ آتا ہے ۔ اب ان کا یہ حال تھا کہ روزانہ صبح سے لے کر شام تک کوئی سو مرتبہ

دروازے میں جھانک آتے کہ شاید ہیرا چپکے سے آکر نیم کے تنے سے لگ کر بیٹھ گیا ہو گا۔ کتنے ہی دن گزر گئے مگر ہیرا کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ اماں نے ایسی جگہ اسے بھنکوایا تھا کہ کبھی تو نہ پلٹا مسعود میاں ہلکے پتنگ ایسے ہو کر رہ گئے۔ ہیرا کا دھیان جی سے نہ جاتا۔

اماں سے ان کی حالت چھپی ڈھکی تو تھی نہیں۔ دیکھتی تو وہ بھی تھیں کہ دن رات ہر پہر اُلو کی سی صورت بنائے، دیدے سجائے، کھڑے راہ دیکھ رہے ہیں۔ "مَس مارے جانور کے لئے اتنا جوکھم۔؟" انھیں وہ تڑک کر غصّہ آیا کہ بیٹے سے بول چال ہی چھوڑ دی۔ کتّے کا غم تو ایک طرف رہا۔ اب یہ دوسرا غم چمٹ گیا کہ اماں نے رخ دے کر بات کرنی ہی چھوڑ دی۔ اتنی ساری مصیبتیں تھیں مگر ماں کی محبت سے کبھی نہ روٹھے تھے۔ رہ رہ کے ان کا جی کانپ اٹھتا۔ پھر پھر پھڑ پھڑ کرتی تھیں تو کیا ہوا۔ بات چیت تو بند نہ تھی۔

سردی کے دنوں میں ایک بار اماں نہا کے اٹھیں تو ہوا لگ گئی یا جانے کیا ہوا کہ پلنگ پر پڑ گئیں۔ ان کا جی کھویا کھویا تو تھا ہی۔ دل بہلانے کا اب کون جتن کریں؟ "کیوں نہ اماں کا دل جیت لوں کہ ساری زندگی کا چین مل جائے۔" یہ خیال دل میں آیا تو مسعود میاں پر زندگی کا نیا دروازہ کھل گیا۔

اماں لیٹی ہوئی تھیں کہ چپکے سے گئے اور پائنتی بیٹھ کر پاؤں دبانے لگے۔ اماں نے گرم گرم آنکھیں کھول کر دیکھا تو مسعود میاں تھے۔ وہیں لیٹے لیٹے کھینچا اور گلے لگا لیا۔

زندگی اب نئے ڈھرے پر چلنے لگی۔

اب مسعود میاں کا اماں کے بغیر پتہ بھی نہ ہلتا۔ صبح ہوتے ہی وہ اماں کی سربراہی میں جُتتے تو پھر رات آجاتی مگر ان کے کام نہ سرتے۔ صبح اماں کے منہ دھونے کے لئے بدھنے میں پانی اور منجن کی ڈبیا لا کر چوکی کے پاس رکھ دیتے۔ اماں منہ دھو کر اٹھتیں تو خود ہی چولہے کے پاس دوڑ جاتے۔ عورتوں کی طرح لپ جھپ ہاتھ مارتے، لکڑیاں جمع کرتے، کچرا کاڑی ڈھونڈ لاتے اور پھونکیں مار مار چولہا سلگا دیتے۔ اگر چولہا جلد نہ سلگتا تو تھوڑا سا جلانے کا تیل انڈیل دیتے۔ دھڑ دھڑ آنچ جلتی تو اماں کی طرف فخر سے دیکھتے۔ ناشتہ چائے تیار کرنے میں اماں کی مدد یوں کرتے جیسے

بازو برابر کی بیٹیاں کیا کرتی ہیں ۔ ابھی برتن کھنگال رہے ہیں کہ ابھی آٹا گوندھنے لپک پڑے ۔ ابھی دال کی ہانڈی میں ڈوئی ہلا رہے ہیں کہ ابھی کے ابھی گوشت دھونے بیٹھ گئے ۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی اماں صبح کے کام سے تھکی ماندی مریل مریل ہاتھوں سے کام کرتیں تو یہ پھرکی بنے گھوم جاتے ۔ خود ہی سب کام کرنے کو تیار۔

" اماں میں تو کر رہا ہوں آپ رہنے دیجئے ۔"

" ارے اماں آٹا آپ نہ گوندھئے ۔ مکی لگانے میں زور پڑتا ہے ۔ میں جو گوندھ رہا ہوں بھلا"

" اماں آپ یوں پھونکئے تو نہیں ، پھونکنے سے سینہ درد کرنے لگتا ہے ۔"

" اماں آپ ذرا دور ہٹ کر بیٹھئے ۔ دھوئیں سے آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں ۔"

" اماں آپ اتنی دیر تک چولھے کے پاس نہ بیٹھئے ، پیر اکڑ کر رہ جائیں گے ۔"

اماں تو بس اب صرف چولھے میں ڈوئی ہلانے کی روادار رہ گئی تھیں ۔ بن داموں جیسے ماما مل گئی تھی کاہے کی فکر ۔؟

ابا جان تو اسکول میں پڑھانے کے سخت خلاف تھے ایک تو وہ خود ہی اتنے پڑھے لکھے تھے کہ اچھی طرح اپنے بچوں کو پڑھا سکتے تھے ۔ دوسرے ذرا پیسے کا بھی سوال تھا ۔ اور جب گھر میں ہی تعلیم ہو سکتی ہے تو پھر فضول ادھر ادھر لڑکوں کو کیوں بھجوایا جائے کہ حد درجہ بگڑیل ہو جائیں ۔ سو مسعود میاں کے پاس وقت کی خوب فراوانی تھی ۔ سبزی ترکاری لانے لے جانے کا سوال تو یوں پیدا نہ ہوتا تھا کہ پھیری والا چھابڑی لگائے ، گھر گھر گھومتا اور ہر گھر میں بیٹھے بٹھائے سبزی پہنچ جاتی ۔ ادھر ادھر کے پھیرے بھی نہ تھے ۔ اناج پسوانا ہوتا تو ابا جان خود شام کو تھیلی میں اناج بھر کے لے جاتے اور آٹا پسوا لاتے ۔ ایسے میں مسعود میاں کو ایسے کون سے باہر کے کام لگے تھے کہ فرصت کی کمی کا رونا ہوتا ۔ دن بھر گھر کے کام کاج اور اماں کی خدمت میں گزر جاتا ۔

دوپہر کو اماں کمر سیدھی کرنے کو لیٹیں تو یہ خود حالانکہ تھکے ماندے ہوتے تھے مگر بچھنے بچھے جاتے

" اماں آپ لیٹ جائیے ۔ میں آپ کے پاؤں دبا دوں ۔"

رات کو بھی وہی معمول تھا ۔ تھوڑے ہی دنوں میں مسعود میاں بھلے خاصے باورچی بن گئے

اب تو وہ مزے میں ہانڈی بھون کر اتار سکتے تھے۔ ماش کی دال اورک کا مسالہ دے کر وہ مزے کی پکاتے کہ ابا جان حیران رہ جاتے کہ بی بی نے پکائی ہے کہ بیٹے نے۔ چاول یوں پھریرے پکالیتے کہ باورچی بھی کیا پکائے۔ پھلکے پتلے پتلے گول گول۔ اور تو اور انہوں نے اُلٹے توے کی لکھنوی چپاتیاں بھی سیکھ لیں۔ گھی کا بگھار دے کر تورکی دال ایسی سوندھی سوندھی بگھارتے کہ مولوی صاحب کے گھر سے بھی پرے خوشبو اُڑ جاتی۔ اور آپا چارپائی کھڑی کر جھانک کر پوچھنے پر مجبور ہو جاتیں۔

"اے بہن، کیا پکایا ہے آج۔؟"

اماں باورچی خانے ہی سے جواب دیتیں۔"مسعود نے دال بگھاری ہے۔"

آپا کے منہ پر حیرت چھا جاتی۔"دولہن بہن، نظر سے اللہ بچائے، تمہارے مسعود میاں کیا سلیقے کے ہیں۔"

آپا کا کیا تھا، مسعود میاں کے سلیقے قرینے کے تو خود اماں اور ابا جان بھی اس قدر قائل ہو چکے تھے کہ کبھی کوئی دعوت ہوتی تو اماں مچھلی، مرغے کے لئے انہی سے پوچھتیں:"اے میاں دو مرغیوں کے لئے اتنا مسالہ کافی ہو جائے گا!

کھویا کھویا پن تو اب بھی محسوس ہوتا ہی تھا۔ مگر دل کو اطمینان تھا کہ اب شائد کسی بات میں گنایا جاؤں گا۔ دل بہلنے کے لئے بھی کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔

ایک دن صبح ہی صبح روز کی طرح دودھ والے کی آواز سن کر مسعود میاں نے اُٹھنا چاہا تو ہاتھ پیروں میں اس قدر سخت درد ہو رہا تھا کہ ہل نہ سکے۔ ماتھے کو چھوا تو گرم گرم سا پایا۔"شاید مجھے بخار ہو رہا ہے۔" انھوں نے دل ہی دل میں سوچا۔

دودھ والا دو چار آوازیں دے کر جھلا گیا مگر یہ بستر سے ہل تک نہ سکے، اماں نے ناگواری سے انھیں کسمساکر دیکھا۔ الجھ کر بولیں۔ اینڈتے پڑے ہو۔ کیا غیر مرد سے میں جا کر دودھ لوں"

یہ پھر بھی نہ اُٹھ سکے، گھگھیا کر بولے۔"اماں ہاتھ پیروں میں بہت درد ہو رہا ہے، ورنہ اُٹھ نہ جاتا۔"

اماں خود ہی اُٹھیں۔ تنا کے کے ساتھ لوٹا اُٹھایا اور دیوار کی آڑ سے دودھ لے کر آگئیں۔

صبح ہوئی دن نکلا ۔ چولہے کے پاس گڑبڑ مچی ۔ مگر مسعود میاں اپنے بستر میں ہی پڑے رہے ۔ اماں کو ہر کام آج ایسا ابھاگا ابھاگا لگ رہا تھا ۔ اتنے دنوں سے بیٹے نے ہر کام میں ہاتھ بٹا بٹا کر انہیں آرام طلب بنا دیا تھا ۔ جب دیکھا کہ یہ اُٹھتے ہی نہیں تو وہیں سے چلا کر بولیں دن چڑھ آیا ۔ دھوپیں نکل گئیں ۔ اور میاں ہیں کہ لمبی تانے پڑے ہیں ۔ اب پراٹھوں کے لئے آٹا کون گوندھے گا ۔

مسعود میاں کا دل اندر ہی اندر کہیں ڈوب گیا ۔ یوں کہ اتنی دوری اور گہرائی سے اس کی دھڑکن بھی معدوم سی ہوگئی ۔ بجائے اس کے کہ اماں پیار کرتیں دلار کرتیں ۔ یوں ان کی خدمت گزاری سے خوش ہو کر انہیں پیار دیتیں ، وہ الٹے کام لینے کی ایسی عادی ہوگئیں کہ اب ایک دن ان کے بیمار پڑ جانے پر یوں طعنے دے رہی تھیں "آٹا کون گوندھے گا ؟ ؟"

بڑی دیر بعد ان کا دل دھڑکا ۔ دل کو بہلانے کی یہ تمنا بھی کتنی عجیب تھی ۔

مسعود میاں کا دل اکدم زندگی سے اُچاٹ اُچاٹ ہو گیا ۔ ایسی زندگی سے موت کیا بُری ہے کہ کوئی پیار کی ایک نگاہ بھی نہیں دے سکتا ۔ وہ دس گیارہ برس کے ننھے منے سے آدمی بڑی شدت سے یہی سوچتے رہتے کہ زندگی کی مسرت کا راز کاہے میں پوشیدہ ہے ، موت میں ۔ صرف موت میں ۔ اور وہ طرح طرح سے مرنے کی ترکیبیں سوچنے لگتے ۔

زندگی ۔ یوں چیونٹی کی چال گزر رہی تھی ، اگر جلدی جلدی ہاتھی کے پیروں چلتی گزر جاتی تو کیا بگڑتا اس کا ۔ مگر وہ تو ہر قدم پر جلاتی کڑھاتی بڑھتی تھی ۔ دماغ پر اتنا زور ڈال ڈال کر سوچنے کے باوجود ، مرنے کی کوئی آسان سی صورت دکھائی نہ دی ۔ اس دن اسی دھن میں کھوئے کھوئے سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ بے خیالی میں دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگ گئے ۔ جسم جھونک کھا گیا ۔ اور یوں لڑھکتے لڑھکتے عین زینے کے نیچے آکر رک گئے ۔ ایک ہلکی سی چیخ ان کے منہ سے نکل کر سارے گھر میں گونج گئی ـــ اِدھر اُدھر سے سب دوڑے آئے ۔ اماں نے لپک کر گود میں اُٹھا لیا ۔ ابا جان نے بازو تھام لیا ۔ دادا میاں کچھ سن نہیں پا رہے تھے ۔ مگر چلا چلا کر پوچھ رہے تھے "کیا ہوا ۔ ارے کیا ہوا بھئی ـــ ؟"

گھٹنوں پر، کہنیوں پہ، گالوں پہ، ہاتھوں پہ۔ یہاں وہاں زخم ہی زخم لگ گئے۔

ٹنکچر آیوڈین لگاؤ جلدی سے ــ ارے کوئی دوڑو ــ لاؤ ــ جلدی۔ ابا جان اس قدر بے کل ہو رہے تھے۔ اماں کی گود سے، ابا جان نے اپنی گود میں لے لیا۔ اور دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر کمرے میں لا بستر پر لٹا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسعود میاں اچھے خاصے بیمار بن گئے۔ ابا جان نے روئی کے پھائے کو ٹنکچر میں ڈبویا اور دھیرے دھیرے زخموں پر لگانے لگ گئے۔ ہلکی ہلکی چرچراہٹ ہو رہی تھی پھر وہ بڑھتی گئی۔ اور جان سی نکلنے لگی۔ مگر مسعود میاں یوں خوش خوش تھے۔ اماں بولائی بولائی پھر رہی تھیں اور اونچا سننے والے دادا میاں پوچھ رہے تھے۔

"میاں درد تو نہیں ہو رہا ـ جلن تو نہیں ہو رہی!"

"بیمار ہونا اس قدر اچھا ہے ـ !!" مسعود میاں نے آج تک نہ سوچا تھا اگر ایسے ہی آگے سے پتہ ہوتا کہ یوں دل جیتے جا سکتے ہیں۔ تو آج سے دلوں پہلے وہ زینے سے لڑھک چکے ہوتے زخموں میں تو ٹیس تھی مگر دل کو کیسی ٹھنڈک مل گئی تھی ــ اب نہ وہ بھڑ بھڑ بھڑ بھڑ تھی، نہ وہ کام کاج کی بھرمار، صبح ہی صبح دودھ والا آتا تو، اماں، یا اُلّو یا بھرا خلاق دودھ لانے دوڑ جاتے۔ کبھی کبھار تو ابا جان بھی چلے جاتے ــ یوں مسعود میاں ہتھیلی کے چھالے بن گئے۔

ابا جان باہر سے آتے تو موسمی اور دوسرے پھل لے آتے ـ دادا میاں تسبیحوں پر تسبیحیں پڑھتے اور آکر چھاتی پر دم کرتے۔ اماں اللہ کا شکر بجا لاتیں کہ خیر ہوئی جو ہڈی پسلی نہ ٹوٹی ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اور عمر بھر کو معذور ہو جاتے وہ الگ، ــ دونوں تینوں بھائی کچھ تو محبت کے مارے اور کچھ پھلوں کے لالچ میں آگے پیچھے گھوما کرتے، زندگی کا رخ اکدم بدل گیا۔ کام دھام کی فکر تو دور ہی اُٹھے بیٹھے بٹھائے ایک سے ایک مقوی غذا اور پھلوں کا عرق، مربے حلوے ملتے، مسعود میاں جو اس قدر دبلے پتلے تھے، پیلے پڑ چکے تھے تو اب بھی ویسے ہی مگر بیماری میں بھی وہ تندرست سے دکھائی دیتے۔ اور گالوں پر کئی بار تو گلابیاں بھی دوڑ جاتیں ــ اب وہ بڑے ہونے کے باوجود بڑے نہ گنائے جاتے، ــ نہ کام کرنے کی تنبیہہ نہ جلدی اُٹھنے کی تاکید ــ مزے میں پڑے پھل چوسا کرتے، ابا جان روز زخموں پر ٹنکچر لگاتے اور پیار سے بولتے جاتے۔

"دیکھو بیٹے یہ دوا کہیں منہ میں نہ چلی جائے۔ زہریلی ہوتی ہے۔ اس سے انسان مرجاتا ہے۔"

پھر زخم ملنے لگے تو دوسری دوا آگئی۔ ڈاکٹر تو اب بھی ابا جان ہی تھے۔ کبھی کبھار اماں یا دادا میاں بھی ڈاکٹری جتانے پر تل جاتے۔ مگر معصوم مسرت کا یہ چراغ بھی ہوا کے جھونکے سے بجھ کر رہ گیا۔ مسعود میاں کو بستر پر پڑے پڑے کئی دن ہو چکے تھے۔ اب تو اُٹھ کر بیٹھتے تھے۔ اور چار چھ قدم چل بھی لیتے تھے۔ گھر والوں سے ان کی کیفیت بھلا کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ اس دن جب انھوں نے پڑے پڑے اُوں سے پانی مانگا تو اماں پچھلے دنوں کی طرح جھلا کر بولیں۔

"اب یہ مکر گانٹھے کب تک پڑے رہوگے۔ بس ہو گئے صحت مند اُٹھ کر پی لو۔"

مسعود میاں کے دل کو صدمہ تو بہت ہوا، مگر پھر بھی وہ اُٹھے اور مٹکے کے پاس پہنچے پہنچے تک جان بوجھ کر لڑکھڑا کر گر پڑے۔

اماں نے دیکھا تو ہاتھ کا کام چھوڑ کر لپکی آئیں۔ اور بستر پر لے جا کر لٹا دیا۔ مسعود میاں خوش ہو گئے کہ چلو حربہ کارگر ہو گیا۔

مگر اس دن کے بعد سے یہ ہونے لگا کہ ان کی بیماری پہلے کی طرح نظروں میں چڑھی چڑھی نہ رہی۔ یوں بیمار بچہ ماں باپ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ مگر جب بیماری مستقل ہو جاتی ہے تو وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور اگلی سی بات نہیں رہ جاتی۔

اب تو یہ ہوتا تھا کہ جب دیکھو تب مسعود میاں بستر پر پڑے ہیں مگر کوئی توجہ نہیں دیتا پھل پھلاری سب چھوٹ گئے۔ وہ حلوے پراٹھے بھی سب ختم ہو گئے، اور وہ پھر گھورے پر کے دھنورے بن گئے۔ ان کے دل میں غم کی دھیمی دھیمی آگ دھیرے دھیرے ہر پل سلگتی رہتی۔ جب بات نہ بن سکی تو مسعود میاں نے خود ہی بستر چھوڑ دیا۔

ٹنکچر آیوڈین کی بڑی سی بوتل ابا جان کے کمرے میں رہتی تھی۔ سرخ سرخ سی، جس کے کاگ پر ڈھبی بھی نہ بندھی رہتی تھی۔ زندگی کا خاتمہ کر لینا ایسی کوئی مشکل بات بھی نہیں کہ انسان پہروں سوچتا ہی رہے اور کوئی حل ہی نہ ملے وہ بھی اس صورت میں کہ ابا جان روز روز جتاونی دیتے تھے کہ دیکھو کہیں دوا منہ میں نہ چلی جائے اس سے انسان مرجاتا ہے۔ انھوں نے بشاشت سے سوچا۔

زخموں کے باعث پیروں میں ہلکا سا لنگ آگیا تھا اور چلتے میں وہ ڈگمگا جایا کرتے ۔۔

۔ اور پھر ابا جان کی الماری تو اتنی اونچی تھی ۔ پھر بھی یہ خیال تھا کہ اگر کوئی پوچھ لے کہ میاں یہ ٹنکچر کا کیا کرنے چلے ہو تو ۔۔ تو کیا کہتے ۔ پھر خود ہی سوچ لیا ۔۔ اونہہ ، کہہ دوں گا ۔ زخموں پر لگا رہا ہوں ۔۔

میلے میلے اُجالے میں وہ ڈولتے ڈولتے ابا جان کی الماری کے پاس پہنچ ہی گئے اوپری خانے سے بھی اوپر ۔ چھت پر ٹنکچر کی بوتل رکھی ہوئی تھی ۔ کرسی اور میز کا سہارا لیتے لیتے وہ منزل مقصود تک پہنچ ہی گئے ۔ بوتل ہاتھ میں آگئی تو ان کا جی اتنی زور سے دھڑکا کہ ایک بار تو انہیں بھی اس کی دھڑکن سنائی دے گئی ۔ دھڑ ، دھڑ ، دھڑ ۔

مرنے سے پہلے انہیں یونہی ادھر اُدھر کے خیال آگئے ۔ واقعی اگر تھوڑے دن اور زندہ رہ جاتے تو کیا بری بات تھی ۔ مگر اب ظلم و ستم کی انتہا ہو چکی تھی ۔۔ اب کتنا صبر کیا جاتا ۔ بوتل منہ سے لگانے سے پہلے ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ۔ مگر زندگی اتنی تلخ اور کڑوی تھی کہ اب وہ ہر منزل سے گزر سکتے تھے ۔ آنکھیں بند کر کے انھوں نے ساری بوتل ختم کر ڈالی ۔ انھیں آج تک نہ معلوم تھا کہ ٹنکچر اس قدر میٹھا ہوتا ہے ۔ چلو یہ بھی خوش نصیبی ہی تھی کہ اتنی تلخ زندگی کے بدلے ایسی میٹھی موت نصیب ہوئی ۔

بوتل وہیں ٹکا کر وہ ابا جان کے پلنگ پر مرنے کے انتظار میں لیٹ گئے ۔ مرنے کا ذرا ذرا حال انھوں نے مولوی صاحب کی زبانی سن رکھا تھا کہ اک پری ہنستی گاتی ، مسکراتی پھول لئے آتی ہے ۔ پھر اچھی اچھی خوشبوئیں آتی ہیں ۔ عطر کی لپٹیں سی چلی آتی ہیں ۔ مہربان اور شفیق پری کی مسکراہٹ وسیع ہو جاتی ہے اور بس ، .... مگر اتنی دیر گزر گئی کوئی پری نہ آئی ۔ کوئی خوشبو نہ آئی ۔ پھول آئے نہ عطر کی لپٹیں ۔۔

البتہ مہربان پری کی بجائے نامہربان ابا جان کمرے میں وارد ہو گئے ۔ انہوں نے بیٹے پر اجنبی سی نظر ڈال کر ادھر ادھر آنکھیں بھٹکانی شروع کر دیں ۔ مسعود میاں کا جی غم سے پھٹ کر رہ گیا " مرتے مرتے بھی کوئی میرا پرسان حال نہیں خدایا ۔۔"

اک دم ابا جان پلٹے اور پوچھا ۔" میاں یہاں کی بوتل کیا ہوئی تم نے دیکھی ،؟"

مسعود میاں نے سوچا اب اعلان کر دینا ہی ٹھیک ہے ۔ بڑے کرب سے دکھی لہجے میں

بولے ۔" اباجان وہ زہر تو میں نے پی لیا اور اب عنقریب مرنے والا ہوں ۔ "

اباجان کو ان کی شرارت ایک آنکھ نہ بھائی اور ان کی بیماری کا لحاظ کئے بغیر، دھن دھن دھنک ڈالا ۔ روئی دھنکنے کی آواز سن کر اماں دوڑی آئیں ۔

" ہوا کیا ۔۔ ؟ نامراد یونہی تو مر رہا ہے ۔ کیوں پیٹ رہے ہیں خواہ مخواہ ۔"

" خواہ مخواہ ۔۔ اباجان بھبھک اُٹھے ۔ یہ کھانسی زکام کا زور دیکھو آج کل ۔ اس زمانے میں اصلی شہد تو ملتا نہیں ۔ اتنی مشکلوں سے جمع کیا ۔ اور یہ نامعقول اک دم سارے کا سارا پی گیا اب ہیضہ ہو جائے تو مرتا پھرے ۔ ایک دمڑی کی دوا تولا کے نہ دوں حرامزادے کو ۔"

زندگی اس سے پہلے کبھی اتنی بے رنگ نہ تھی ۔ وہی دن، وہی راتیں ۔ دادا میاں کا حقہ بھر کر رکھتے کئی بار ان کا جی چاہتا کہ انھیں اپنا سب کچھ مان لیں ۔ کیونکہ گھر بھر میں وہی ایک قابل قدر ہستی تھے ۔ مگر اماں کا قصہ یاد آجاتا کہ اس جان توڑ فرماں برداری کا کیسا کڑوا پھل ملا کہ محبت تو گئی چولھے میں ۔ اماں اس فرماں برداری سے بجائے خوش اور مہربان ہونے کے ایسی عادی ہو گئیں جیسے مسعود میاں نوکر ہی تو تھے ۔ محبت کی زبان یہ لوگ سمجھتے کیوں نہیں ۔؟"

اپنے انہی بے ہودہ کاموں سے فارغ ہو کر مسعود میاں باہر بیٹھک میں آبیٹھتے ۔ اور کچھ نہ سوجھتا تو بیٹھے دیکھتے رہتے کہ مرغیاں کیسے دانہ چگتی ہیں ۔ وہ وقت گزاری کو باری باری ہر مرغی کا جائزہ لیتے ۔" اس کے پیر بھورے ہیں ۔"

"اس کالی مرغی کی چونچ گہری کاسنی ہے ۔" لال مرغی کے پروں میں سفید سفید دھبے بھی ہیں ۔" "مرغی اور مرغیوں کے مقابل ذرا ناٹا ہے ۔" سفید مرغ کی کلغی ذرا ایک طرف کو جھکی ہوئی ہے ۔

حد درجہ اکتا کر وہ خود ہی سمجھ جاتے کہ یہ باتیں انتہائی احمقانہ ہیں ۔ اور کسی سمجھ دار انسان کا ایسی بے تکی باتوں میں جی نہیں لگ سکتا ۔ وہ کھلے آنگن میں اتر آتے اور نظریں اٹھا اٹھا کر اڑتی چیلوں اور کوؤں کو تاکنا شروع کر دیتے ۔ شام ڈھلے جب بگلے بکھیر وا اپنی اپنی دنیاؤں کو لوٹ رہے ہوتے تو وہ بڑے انہماک سے بگلوں کی اڑتی قطار پہ نگاہیں جمائے گنا کرتے ... ایک دو ۔ تین ۔ چار

پانچ ۔ چھ ۔ سات..... آٹھ ... نو ۔ دس ۔ گیارہ .... وہ گنتے رہتے اور پرا دوڑ نکل جاتا دوپہریوں میں وقت کاٹنا اور مشکل ہو جاتا ۔ وہ ادھر اُدھر جھانکتے تاکتے پھرتے کہ کہیں گھونسلہ دونسلہ نظر آجائے تو چڑیوں کے انڈے اتارلیں ۔اس فضول سے کام کی وجہ سے ان کے پاس انڈوں کا ڈھیر لگ گیا ۔ پھر خالی وقتوں میں وہ گھوم پھر کر چھپکلیاں اور گرگٹ مارا کرتے اور پھر بڑے انہماک سے کوّوں اور چیلوں کے لئے پچھواڑے میں چھوڑ آتے ۔

یہ سب کام اچھے تھے جن میں گھنٹے دو گھنٹے تو بڑی خوشی سے گزر جاتے مگر پہاڑ ایسے دن اور پہاڑ سے بھی بڑی زندگی کے گزرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ نیم کے نیچے اب بھی محلے کے چھوکرے جمع ہوتے اور رنگارنگی باتیں ہوا کرتیں ۔ مگر یہ سب کچھ ہفتہ میں ایک بار ہوتا جب اسکول سے چھٹی رہتی ۔ ورنہ ان لڑکوں کا وقت تو بڑے مزے میں کٹ جاتا ۔ تھک ہار کے انہوں نے وہی پرانی بات سوچی کہ کیسا بھی کر کے اسکول میں داخلے ہی لیں ۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا ۔؟ اگر کہتے تو وہی جواب سُننا پڑتا ــــ مگر پھر بھی انہوں نے " اپنی سی کر گزرو " والی بات سوچ ڈالی ۔کیوں نہ بیچ میں دادا میاں کو لایا جائے ۔ وہ ضرور ابا جان سے سفارش کردیں گے ــــ دادا میاں نے کمال مہربانی سے اردو لکھنی پڑھنی سکھا دی تھی ۔ اس دن انھوں نے دادا میاں کو بڑا اچھا سا خط لکھا تسلام الیکم ، اور اس کے نیچے مناسب الفاظ میں درخواست کی کہ انھیں اسکول میں داخلے کی اجازت دلوا دی جائے ۔

خط پڑھ کر جو بھی ہنگامہ ہونا تھا وہ ہو کر رہا ــــ ابا جان کا تو یہ تھا کہ جب بات کرتے جوتے کی مدد سے ، مگر دادا میاں کا کہنا بھی تو ٹھیک ہی تھا کہ میاں اسکول میں جو کچھ پیسہ دے کر پڑھایا جاتا ہے وہ تمہیں گھر بیٹھے مفت اور محبت کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے ۔ تو پھر اس میں اعتراض کی کون سی بات ہوئی ؟؟ ۔

اُداسی میں بیٹھے بیٹھے اس دن مسعود میاں نے انگلی سے زمین پر خوب آڑی ترچھی لکیریں کھینچیں بعد میں انھیں لکیروں کو غور سے دیکھ رہے تھے تو ان لکیروں میں ایک صورت اُبھر آئی ۔ ان کے

دل میں خوشی بھر گئی ۔ ارے وقت گزاری کا ایک بہترین حل یہ بھی تو ہو سکتا ہے ۔ !

اب دن بھر وہ پنسل کاغذ لئے آڑی ٹیڑھی لکیریں کھینچا کرتے اور جب اس سے ذرا اکتا جاتے تو پھر مٹی گوندھ کر مجسمے ڈھالنے بیٹھ جاتے ۔۔۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک چڑیا کا مجسمہ بنایا ۔ بنانے کے بعد خود ہی حیرت زدہ رہ گئے ۔ عین مین چھوٹی سی چڑیا ہی دیکھ لو جیسے کہ ابھی ابھی پر پھڑ پھڑا کر پھر سے اڑ پڑے گی ۔ اور مسعود میاں دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے انھوں نے شرارت سے وہ چڑیا لے جا کر میز پر رکھ دی ۔ چڑیوں کو ایک رقیب مل گیا دن رات بے چاری کے سر پر ٹھونگیں پڑا کرتیں ۔ آخر دوسرے تیسرے دن ہی وہ چڑیا ٹوٹ ٹاٹ کر برابر ہو گئی پھر تو ہر ایک کی شامت آ گئی ۔ انور میاں ، اخلاق میاں ، اجو سے لے کر دادا میاں ، اماں اور ابا جان تک کے مجسمے بن گئے ۔ ان کے اور بھائیوں کے حصے میں ایک کمرہ تھا ۔ وہ کمرہ اب مجسموں سے سج گیا ۔ وہ بڑی پھرتائی اور انہماک سے مٹی گوندھتے اور دیکھ دیکھ کر نقوش سنوارتے گھریلو مٹی تو نامراد یونہی جھڑ جھڑ جایا کرتی ۔ اب وہ لیپنے والی سے جا کر گھگھیا کر چکنی مٹی مانگتے اور ماچس کی تیلی کی مدد لے لے کر نقوش تیکھے کرتے ، تو وہ اس فن میں اتنے ماہر ہو گئے تھے کہ منٹوں میں دیکھتے ہی مجسمہ تیار ہو جاتا ۔ بھائیوں کا منہ کتے بلی کے مجسمے دے دلا کر بند کر دیا گیا ۔

بڑے شہر سے ماموں جان آئے ۔ جانے کتنے ملکوں کی انھوں نے خاک چھانی تھی ۔ ابا جان سے بات کرتے تو گٹ پٹ میں ، بھانجوں کے خاک تو پلے نہ پڑتی ، وہ بھانجوں سے بڑے تپاک سے ملے ۔ ان سے باتیں کیں ۔ ان کی ننھی منی لڑائیوں کے فیصلے کئے الٹی سیدھی رائیں دیں ۔ کبھی آپس میں لڑوا دیا ۔ کبھی ملوا دیا ۔ بھانجوں کی تعلیمی حالت سے سخت نالاں اور غیر مطمئن نظر آتے تھے ۔ ایسے ہی ایک رات کھانے کے بعد بات چل نکلی ، تو وہ بہنوئی سے بڑے اچھے لہجے میں بولے

" بھائی جان آپ نے بچوں کی تعلیم کی طرف کوئی دھیان نہ دیا ۔ یہ سخت بری بات ہے ۔ حالانکہ آس پاس دو چار اسکول بھی ہیں ۔

" بس میاں تم کیا جانو ۔ کمبختوں کے دماغ ہی نہیں چلتے ایک لفظ ہفتے ہفتے بھر یاد نہیں ہوتا ۔ اور ماموں تعلیم کی طرف دھیان دلا رہے ہیں ۔۔ " ایک دم وہ چڑ کر تینوں بڑے

"بولو تورسے کم بختو وہاٹ از یور نیم —"

تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھ دیکھ کر اور ایک دوسرے کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ — ماموں جان کو بڑا سخت افسوس ہوا — ذرا رک کر بولے —،

"اگر پڑھنے میں دماغ نہیں چلتا تو ابتدائی تعلیم کے بعد کسی ٹیکنیکل لائن میں ڈلوا دیجئے۔ یا پھر کسی فن کی طرف راغب ہوں تو یوں کہیئے — دراصل بچے کا رجحان جدھر ہو یونہی اُسے اُٹھانا چاہیئے — ہمارے بنگلے کے بازو میں ایک وکیل صاحب رہتے ہیں ان کا بچہ یونہی آڑی ٹیڑھی لکیریں کھینچا کرتا تھا، آدمی تھے سمجھدار — اسے آرٹ اسکول جوائن کرا دیا — ماشاء اللہ ایسا ہونہار نکلا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر نے دہلی میں پہلا انعام لیا ہے — اور یہ نہیں تو پھر اور بھی کئی شعبے ہوتے ہیں بھئی — کوئی گلنے کی طرف مائل، کوئی ناچنے کی طرف، کوئی کھیل کھیل میں انجن بنانے کی دھن، تو کوئی یوں ہی پتلے ڈھالتا پھرے۔ ماں باپ کو توجہ کرنی چاہیئے — مگر دھیان کون دیتا ہے — اگر مناسب توجہ دی جائے تو آگے چل کر ایسے ہونہار فنکار جنم لیتے ہیں کہ ساری دنیا میں نام مشہور ہو جائے — مگر تنگ ذہنی اور دقیانوسیت تو پیچھا چھوڑے — میری ڈکی تو میوزک سیکھ رہی ہے —"

ابا جان آنکھیں پھاڑے ان کی بات سن رہے تھے مگر مسعود میاں اور ہی کسی دنیا میں تھے — یہ ماموں جان کتنے اچھے ہیں، کتنے شفیق، کتنے مہربان ہیں — کس قدر نرم لہجے میں کیسی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں — ان کے اتنے قریب بیٹھنے کے باوجود بھی ڈر نہیں لگتا دل چاہتا ہے یہ باتیں کئے جائیں اور میں سنا ہی کروں — سچ ماموں جان آپ اس قدر اچھے ہیں — میں تو بس آپ ہی کے ساتھ چلوں گا — آپ کے گھر ہی رہوں گا — ڈکی میوزک سیکھا کرے گی — اور میں پتلے ڈھالا کروں گا — تو بس میں یقینی آپ کے ساتھ چل رہا ہوں — لے چلیں گے نا مجھے —!"

دماغ نے تو بہت سمجھایا مگر زبان ساتھ نہ دے سکی اور ماموں جان آئے بھی اور چلے بھی گئے

لیکن مسعود میاں کو جو شوق لگ گیا تھا ۔ وہ بڑھتا ہی گیا ۔ اور ان کے کمرے میں آڑے ٹیڑھے مجسموں کی دکان سی جم گئی ۔ ایک دن اماں جو کسی کام سے ادھر گئیں تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا انہوں نے غصہ میں آ کر میاں کو آواز دی ۔ ادھر سے سن گن پا کر دادا بھی دوڑے آئے ۔

" غضب خدا کا ، اپنے ہاتھوں مورتیاں بناتا ہے کم بخت ۔ ارے نامراد قیامت کے دن ان میں جان بھرنی پڑے گی ۔ " اماں ہتڑ پیٹ پیٹ کر دہائی دے رہی تھیں ۔

دادا کو عاقبت اندھیر نظر آنے لگی ۔

" ارے میاں مسلمان ہو ۔ خدا رسول کا نام لیتے ہو ، یہ کیا دھندا اٹھایا ہے ۔ اسلام میں اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں کہ خدا کے پیدا کئے ہوئے ہو کر اس کی برابری کرنا چاہتے ہو ۔ نعوذباللہ

اور ابا جان تو اس انکشاف پر حیران ہی رہ گئے ، ماموں جان ، سامنے ہوتے تو شاید ان کی ناک ہی مروڑ دیتے ۔ اماں نے گناہ سے لرز کر اس کا کفارہ ادا کرنا ضروری سمجھا ۔ اور دھڑا دھڑ مجسمے زمین پر پٹخنے شروع کر دیئے اور تھوڑی ہی دیر میں کمرے میں مٹی کا ڈھیر لگ گیا ۔ جن میں ننھی ننھی چڑیاں بھی تھیں ، ہنستے گاتے گول مٹول بچے بھی تھے ۔ انور میاں تھے ۔ اخلاق میاں تھے اجو ۔ پوپلے منہ والے دادا میاں ۔ نوکیلی مونچھوں والے ابا میاں ۔ اور تو اور اماں بھی ڈھیر ہو گئیں ۔

۔ منزل کو جاتا مسافر پھر راہ سے بھٹک گیا ۔ اب پھر مسعود میاں تھے اور بیکاری کے دن رات ۔ ساری دنیا سے جی اچاٹ سا ہو گیا ، اتنی بڑی ساری دنیا میں اب اور کون جھمیلہ تھا کہ جس میں جی اٹکایا جاتا ۔ تنگ آ کر انہوں نے سوچا کہ اب تینوں بھائیوں میں دل لگانا چاہیئے ۔ ممکن ہے کہ ان کے ساتھ کھیلتے مانتے زندگی کی اتنی بڑی راہ یوں ہنستے ہنستے ہی طے ہو جائے ! ۔

بیٹھے بٹھائے یوں مسعود میاں مہربان ہو گئے تو بھائیوں کی آنکھیں مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ یوں تو مسعود میاں سدا ہی سے نمک کا گھر تھے ، کہ کسی نے ذرا پیار سے دیکھا اور یہ بہہ نکلے مگر اب تو بالکل ہی پگھل کر رہ گئے ۔ کھانے پینے ۔ کھیلنے کودنے ، کام دھام ، اٹھنے بیٹھنے ہر ہر بات میں انہوں نے اپنے آرام اور اپنی خوشی پر بھائیوں کے آرام اور خوشی کو ترجیح دی ۔ گھر میں مٹھائی میوہ آئے اور انہیں بھی ملے تو نا ممکن تھا کہ یہ اکیلے بیٹھے بیٹھے کھا جائیں ۔ بھلا بھائیوں کو

چھوڑ کر کیسے کھایا جا سکتا ہے! حلق سے اترے تب نا! اب چھوٹے بھائیوں کے منہ پر سدا بڑے بھائی، بڑے بھائی کی رٹ رہتی ــــــــــ نیم نیچے گلی ڈنڈا کھیلنے جاتے تو بڑے بھائی جان بوجھ کر گلی گرا دیتے اور یوں خوب جان جان کر داؤ دیتے ــ لونڈ پاٹ کھیلنے کا وقت آتا تو خود ہی ایسے قریب سے گزرتے کہ دشمن پکڑ لے ۔ اور دشمن کون ــ اپنے ہی بھائی ۔ کبڈی میں جو کبڈی کبڈی بولتے ہوئے بھاگتے تو دشمن کے ہاتھ لگتے ہی سانس توڑ دیتے ــ دشمن جیت جاتا یہ ہار جاتے ۔ اس ہار میں بھی کیسا مزہ آتا ۔ ہر بھائی کی یہ کوشش ہوتی کہ کھیل میں اس کے مخالف بڑے بھائی ہی بنیں ــ بیچارے ایسے مزے سے ہار جاتے کہ اجو بھی تو کیا ہارے

کھیپڑوں میں تو جیسے دم تھا ہی نہیں کہ جہاں کسی نے ہاتھ لگایا اور سانس ختم ــ ،

الو میاں کو چڑیوں کے انڈے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا ۔ مسعود میاں نے اپنا تمام خزانہ یوں چپ چاپ ان کے حوالے کر دیا اور ان کا دل جیتے رہنے کو، دوپہر سہ پہر، دھوپ چھاؤں، بس گھومے جاتے، درختوں، چھتوں چڑھے چڑھے جاتے، جیب میں انڈے چھپائے وہ کنپٹیوں سے بہتا ریلے دار پسینہ پونچھتے ۔ سانسوں سانس نیچے اتر آتے ــ ،

" دیکھا کم بخت کو ــــ سالی بیٹھی مجھے ہی تاک رہی تھی ۔ میں بھی کیا اسے چھوڑنے والا تھا ــ" ۔ الو میاں یوں مزے سے انڈے سمیٹ لیتے جیسے انہیں حاصل کرنے میں کوئی جوکھم ہی نہ پڑا ہو ــ

میاں اجو کو کھلانے پینے سے خاصا لگاؤ تھا ــ بڑے بھائی اپنے حصے کی ساری چیزیں کھلا دیں پھر ان کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہے ۔ کھا کر خوب خوش ہوتے اور مسعود میاں انھیں کھینچ کر گلے لگا لیتے ۔ گالوں پر پیار کرتے ۔

" اجو تم ہمارے دوست ہو نا ــ" وہ بار بار تصدیق کر لینا چاہتے ۔ کہ ان کی دوستی یوں ہی کچی تو نہیں ہے ــ!

" ہاؤ ــ " وہ اپنا سر ہلا کر بھرپائی سے بولتے ۔

اجو میاں کے لئے بڑے بھائی نے چوری کی نامراد عادت بھی ڈال لی ــ اب گھر میں

بری بھلی چیز تو بکتی ہی ہے — موسم کے پھلوں کا مربہ بھی پڑتا ہے — الماری میں اماں نے ٹماٹر کی جیلی اور پچھلے دنوں آم کا مربہ بنا رکھا تھا - اجو میاں کو آم کا مربہ کس قدر پسند تھا — بس نگاہ چوکی کہ نزومازی — ادھر ادھر سے جہاں موقع ملا بڑے بھائی گھسے گودام میں — پھر ایک آدھ قاش مٹھی میں دبائے باہر نکل آتے۔ — آدھے مرتبان تو خالی ہو گئے اور آدھے — آدھوں آدھ رہ گئے — ،

اخلاق میاں کو باہر کے کھیل پسند تھے - بڑے بھائی ان کے لئے درختوں پر چڑھ کر پھاٹے توڑ لاتے اور ایک سے ایک فیشن ایبل غلیل بنا کر دیتے - ربر کے پیچھے کنکری رکھ - ایک آنکھ میچ سیدھ میں نشانہ باندھنے کی وہ تدبیریں بتاتے کہ چڑیا بیٹھی کی بیٹھی رہے اور دُم ہوا — ،

اتنے بھائیوں کی خوشی حاصل کرنی سراسر مہنگی پڑی — ادھر گھر کے کاموں میں رخنہ پڑ گیا صبح تو خیر سدا ہی سے اُٹھتے تھے اور اب بھی اٹھتے - اس لئے صبح کے کاموں کی برابری تو ہو ہی جاتی مگر دن بھر جو ادھر اُدھر ٹلّے کھاتے پھرتے تھے تو پھر کام سمیٹنے کو کون رہ جاتا تھا — ؟ ایک کام کیا کہ گتی دبے کر بھاگے ، ادھر ادھر سے آئے - دو چار منٹ پڑے کہ پھر بھاگے - اماں سے یہ چالا چھپا نہ رہ سکا - کھیل بھی وقت پر اچھا لگتا ہے - یہ نہیں کہ گھر بھر کے کام کرنے پڑے رہیں اور جت گئے پھیا چھائی میں -

چڑیوں کے انڈوں کے رسیا تو دراصل اتو میاں تھے مگر اس دن تو سب کا لٹ پٹا کے جی چاہا کہ ہمارے پاس بھی انڈے ہوں ، اور تو اور اجو میاں بھی کنمنانے لگے ، — ہوا یوں کہ مسعود میاں جو بیری پر چڑھے تو پھر سے ایک چتکبری چڑیا اڑ کر بھاگی ، انہوں نے ادھر ادھر ٹوہ لگائی ، کانٹوں سے بچتے پتوں سے الجھتے وہ آخری سرے تک پہنچ ہی گئے - اور ان کے منہ سے مارے خوشی کے ہا نکل گئی ، ایک گپھا میں چھوٹا سا گھونسلہ تھا - انہوں نے ہاتھ ڈال کر اس میں سے انڈہ برآمد کر لیا - واہ بھئی کیا کہنے ! کیا خوب صورت انڈہ — ہلکے گلابی رنگ کا - جس پر سرخ اور کالے کالے نقطے چمک رہے تھے — ان کا دل مارے خوشی کے ڈول گیا ، وہیں سے بیٹھے بٹھائے نیچے کھڑے تینوں کو انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا انڈہ دکھایا -

"یہ دیکھ رہے ہو تم لوگ —"

اتنی اوپر سے پہلے تو کچھ صاف نظر نہ آیا - پھر ان لوگوں نے دیدے پٹ پٹا کر ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا —،

"ارے واہ — بڑے بھائی کیا چیز بتا رہے ہیں آپ —"

"ارے واہ — اتنا بھی نہیں معلوم — ارے بھئی انڈہ ہے انڈہ، جس پر لال کالے نقطے ہیں — ہاں —،

تینوں ایک ساتھ بول پڑے —،

"بڑے بھائی وہ میں لوں گا —"

"نہیں میں —"

"واہ میں —"

"اوں اوں، میں —"

سب سے پیچھے اچّو میاں کہے جا رہے تھے — "ام میں لے — ام میں لے —"

ایک بار تو اوپر بیٹھے ہوئے مسعود میاں بھی اتنی کاؤں کاؤں سن کر چکرا کر رہ گئے

"یہاں تو کُل دو ہی انڈے ہیں —،

واہ چڑیوں کے انڈے ہمیں بھاتے ہیں، کیوں بڑے بھائی میرے پاس اتنے سارے ہیں کہ نہیں — ؟" اتو میاں چلاّئے —،

"اتنے سارے ہیں تو اب پھر کیا ضرورت ہے —" اخلاق میاں چڑ کر بولے —،

اتو میاں جل کر بولے — "تم تو جا کر غلیل ہی چلاؤ بس —" "ارے واہ ہمارے انڈے ہیں"

ان دونوں کو آپس لڑتا دیکھ کر اچو میاں پھک پھک رونے لگے — اوں اوں — اوں اوں

اکدم مسعود میاں کو ایک حل سوجھ گیا —،

بھئی دیکھو — اتی اتی باتوں پر یوں لڑائی سے فائدہ — آخر ادھر اُدھر اور بھی تو اتنے سارے درخت ہیں، میں ڈھونڈتا ہوں — شائد مل جائیں

سب کے غصے ٹھنڈے پڑ گئے ۔ اب ہوتا یہ تھا کہ ہر دوپہر کو جہاں دادا میاں کے منہ سے فر فر سیٹیاں نکلنے لگیں ۔ اور جہاں اماں نے دروازے بھیڑ ہاتھ کا تکیہ بنا آنکھیں موندیں ۔ چاروں بھائی دبے پاؤں، دبے قدم اُٹھاتے گھر سے باہر نکل آتے۔ ان کے لئے کڑی دھوپ اور گرمیاں کوئی معنی نہ رکھتی تھیں ۔ سردیاں بے اثر تھیں ۔ بس چلے جارہے ہیں ۔ انڈوں کی تلاش میں ۔

ڈھونڈھتے، ڈھونڈتے گھر سے خاصے دور نکل آتے، واپسی میں دھوپیں اترتی ہوتیں اور ان کے چہرے پسینے سے تر بتر، گھر میں داخل ہونے سے قبل قمیصوں کے دامنوں سے پسینہ پونچھ لیتے تھے ۔ اور چپ چاپ اپنے کمرے کو چلے جاتے، اماں کی نظر پڑتی تو وہ چنگھاڑتیں ۔

"کدھر مرے تھے حرام زادو ۔"

ایسے ہی جھاڑ کے نیچے کھیل رہے تھے اماں ۔"

"نیم کے نیچے نا ۔"

"ہاں، ہاں نیم کے نیچے ہی ۔" وہ چاروں ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہوئے صاف جھوٹ بول جاتے ۔

دادا میاں کا کہنا تھا کہ نیم کے نیچے کھیلنے سے کوئی بیماری نہیں آتی ۔ کیونکہ نیم کی کڑوی بو بیماریوں کے کیڑوں کو دور بھگا دیتی ہے ۔ اسی مارے اماں غصے میں پوچھنا نہ بھولتیں ۔ "نیم کے نیچے نا ۔؟"

مسعود میاں کی میا محبت کا اثر ہوا کہ الّو میاں کے پاس چڑیوں کے انڈوں کے ڈھیر لگ گئے ۔ اخلاق میاں کے ہاتھوں مارے گئے گرگٹ، چھپکلیاں اور لذیذ چڑیاں کھاتے کھاتے پچھواڑے کی منڈیروں پر بیٹھنے والے کوے اور منڈلانے والی چیلیں یہ موٹی موٹی ہوگئیں ۔ اور چوری کا مربّہ حلوہ کھاتے کھاتے اجّو کا پیٹ خوب بڑا ہوگیا، اس کے سوا رنگین چڑیا کے رنگین پر بھی کے پاس تھے سوائے مسعود میاں کے ۔

ایک دن مسعود میاں کی قیادت میں تینوں بھائی تیز دھوپ میں پسینہ پونچھتے، جھاڑوں کے اَلے تلے انڈوں کی ٹوہ میں پھر رہے تھے ۔ ابھی ابھی ایک گھونسلے سے ایک رنگین چڑیا پھنکتی اُڑ گئی تھی ۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے چڑیا پھر واپس آئی، چونچ میں دانہ دُنکا سمیٹے ہوئے ۔

مسعود میاں چڑیوں کی زندگی کے بارے میں اتنی معلومات رکھتے تھے کہ ہر بات جھٹ پہچان جاتے، دیکھتے ہی بولے۔

"اس گھونسلے میں یقیناً بچے ہیں ۔"

"بچے ۔؟ سب کے چہرے کھل اٹھے ۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا ۔؟"

"ارے تبھی تو وہ دانہ لائی ہے۔ اب ضرور انہیں کھلائے گی ۔"

"بڑے بھائی ہمیں بچے ۔ ہمیں بچے ۔ ہمیں ۔"

سب نے اتنی ضد شروع کی کہ کوئی چارہ نہ رہا ۔

"اچھا ذرا اس چڑیا کو پھر سے اڑ جانے دو، پھر چڑھتے ہیں ذرا ۔

کوئی دس منٹ بعد چڑیا پھر اڑی تو مسعود میاں نے پائینچے نیفے میں اڑسے، آستینیں چڑھائیں اور لپک پڑے ۔

یوں بندر کی سی پھرتائی سے چڑھتے چڑھتے وہ سیدھے جھاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے ۔ پتے اور گھانس پھونس ہٹا کر دیکھا تو چڑ چڑ چوں، چوں کرتے بچے سر اُٹھا کر آگے سرکنے کی کوشش کر رہے تھے ان پر اتنا پیار آیا مسعود میاں کو ۔ کتنے ذرا ذرا سے تھے ۔ ننھے ننھے، چیں چیں ۔ ییں ییں کرتے کیسے بھلے لگ رہے تھے ۔ وقت کی گھڑی پوچھ کر تھوڑی ہی آتی ہے، مسعود میاں خوشی میں آکر جو اُچھلے تو جسم کا تول جاتا رہا، جھوک نیچے کی طرف ہو گیا اور دھم سے زمین پر آرہے ۔

درخت سے گر جانا تو خیر ایک چھوٹا سا ہنگامہ تھا، اصل ہنگامہ تو اس وقت ہونا ٹھہرا جب ابا جان کی عدالت میں ساروں کی پیشی ہوئی ۔ اماں ہاتھ چلا چلا کر بول رہی تھیں ۔

"حرامزادوں سے ستر بار کہا کہ جھاڑ جھنڈولوں پر نہ چڑھا کرو مگر نابکار سنتے ہیں کیا ۔"

دادا میاں کراری آواز میں چلا رہے تھے ۔

" وہ تو بھلا ہوا کہ بائیں ہاتھ کی ہڈی سرکی ہے ۔ جو کبھی سیدھے ہاتھ میں نقص آجاتا تو میاں جی عمر بھر کو لولے ہو گئے تھے ۔"

سب پر باری باری بٹس پڑ رہی تھی کہ ابا جان گرج کر بولے ۔

"یہ نابکار جھاڑ پر چڑھا ہی کیوں تھا — ؟"

"یہ تو ان سے ہی پوچھئے جو خود چڑھے تھے —" اماں جل کر بولیں،

ابا جان کا سرخ چہرہ، اماں کی خون بھری آنکھیں اور دادا میاں کی کراری آواز سن کر انو اور اخلاق میاں کی سمجھ میں یہی آیا کہ صاف صاف سچ بات بول دیں۔

"ابا جان بڑے بھائی چڑیا کے رنگین انڈے اتارنے گئے تھے —" اخلاق میاں نے پھر اخلاق سے گری حرکت کی —

"چڑیا کے انڈے — ؟" ابا جان حیرت سے بولے —" وہ کس لئے — ؟"

اب انو میاں کی باری تھی —" کیونکہ بڑے بھائی کو انڈے جمع کرنے کا بہت شوق ہے"

ابا جان نے دیدے گھما گھما کر مسعود میاں کو دیکھنا شروع کیا۔

دونوں ساتھ ساتھ بولے —" ہاں ابا جان — آپ کہیں تو ہم لاکر بتائیں — ان کے صندوق میں سے نکال کر —"

انجو میاں بھی کاہے کو چپ رہتے، جدھر کا پلڑا بھکا دیکھا جھٹ ادھر جا بیٹھے —

"اول ملبا بھی تھالے تھے —" (اور مربہ بھی کھائے تھے) —

اماں تڑک کر بولیں —" وہی تو میں کہوں کہ کم بخت سارا مربہ غارت ہوگیا —" انہوں نے زہر بھری نگاہوں سے مسعود میاں کو گھورا —،

تینوں دوڑتے ہوئے گئے اور اپنے اپنے پاس کے انڈے لاکر ابا جان کے قدموں میں ڈال دیئے —

"دیکھئے ابا جان یہ اتنے سارے انڈے — بڑے بھائی روزانہ جھاڑوں پر چڑھ کر جمع کرتے ہیں —۔"

ایک خدائی چوٹ تو وہ تھی جو جھاڑ سے گرنے کی وجہ سے ان کی کہنی نے کھائی کہ جگہ چھوڑ کر ہڈی سرک گئی اور دوسری چوٹ ابا جان نے دی کہ ان کے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے مزے سے کوٹ ڈالا۔

اگر درخت سے گرکر مر بھی جاتے تو اتنی کوفت نہ ہوتی۔ مگر باپ کے ڈر سے تینوں بھائی جو اکدم بدل گئے تو ان کی آنکھوں میں دنیا ہی اندھیر ہو گئی ۔ اس سے بھلا تو یہی تھا کہ درخت سے گرتے ان کا دم نکل جاتا ۔ انہوں نے دکھ بھرے دل اور آنسو بھری آنکھوں سے باری باری تینوں بھائیوں کی طرف دیکھا ۔ دن اور رات کے کتنے قیمتی لمحے برباد کرکے، اماں باوا کی ڈانٹ سن کر انہوں نے کتنی محبت نذر کی تھی، اور پھل کیا ملا ۔؟ ان کے دل سے درد کا بگولہ سا اٹھا جو ان کے وجود پر ان کی آنکھوں پر چھا گیا۔ اور سارے میں اندھیرا چھا گیا ۔'

اس رات وہ اتنا روئے، اتنا روئے کہ آنسو جمع کئے جاتے تو چھوٹی موٹی ندی بن جاتی۔ روزانہ جراح آتا اور ان کی کہنی کی سرکی ہوئی ہڈی کو جگہ پر لانے کی کوشش میں ان کی جان نکال لے جاتا درد کی ایسی ٹیسیں اٹھتیں کہ ان کی چیخیں نکل جاتیں ۔ جسم کے سارے بال مارے تکلیف کے کھڑے ہو جاتے ۔ اب آنسو ضبط کرنے کی انھیں عادت ہو گئی تھی کہ اس تکلیف کے باوجود ہلکی سی نمی بھی ان کے آنکھوں میں نہ تیرتی ۔

وہ بستر پر پڑے پڑے اپنے آپکو اس قدر بے بس نظر آتے گھٹنوں میں الگ زخم، تلوے الگ آلودہ، کہنی سے معذور، اور دل میں کتنے سارے گھاؤ تھے ۔ جراح نے ہلنے تک سے بھی منع کر رکھا تھا ۔ اس سے پہلا زمانہ ہی کیا برا تھا ۔ دھتکار پھٹکار جو کچھ بھی تھی اپنی جگہ تھی، مگر یوں قید تو نہ تھی کہ بس ایک ہی جگہ پڑے رہو ۔ ہلو تک بھی نہیں ۔ آگے گھومنے پھرنے کی تو آزادی تھی ۔ مزے سے دوپہر میں جو نیم کے نیچے کھیلا کرتے تھے وہ مزہ بھی گیا ۔ اب تو سارا دن لیٹے رہتے، تینوں بھائی دوپہر کا کھانا کھا مزے سے کھیلنے چل دیتے ۔ اور یہ دکھ کے ساتھ دیکھتے ہی رہ جاتے ۔ خالی وقت میں چھت کی کڑیاں گنا کرتے ۔ ایک، دو ۔ تین ۔ چار ۔ ہزار بار تو گن چکے ہوں گے ۔ اب تو انھوں نے چھت کی اتنی سیر کرلی تھی کہ آنکھیں بند کر کے بھی دیکھ سکتے تھے کہ وہاں کونے میں ایک زرد چپکلی چپکی رہتی ہے ۔ کوئی کیڑا مکوڑا کھاتی ہے پھر اسی جگہ آ چپکتی ہے ۔ دیوار سے لگ کر ایک سیاہ دھبہ ہے جس میں ایک بوڑھے کی شکل بن گئی ہے (ہو بہو دادا میاں!) پوری پوری شکل تو نہیں، لیکن اگر ٹھوڑی کی جگہ سے ایک آدھ چونے کا ٹکڑا اور گر جاتا تو پھر پورا بوڑھا ہی تھا ۔ اور پھر چھت میں دو سوراخ

جس سے صبح ہی صبح سورج کی کرن جھانکتی ہے اور جیسے جیسے سورج چڑھتا ہے وہ رخ بدلتی جاتی ہے۔ اور یہاں تک کہ معدوم ہو کر رہ جاتی ہے — شمالی کونے پر ایک مکڑی کا جالا ہے جو ہوا چلنے پر بھی اپنی جگہ سے نہیں اڑتا —

زندگی کا یہ دور سب سے تاریک تھا —،

اماں دن میں تین بار پھیکا شوربہ اور تین پتلی پتلی چپاتیاں پٹخ جاتیں اور یہ آدھا کھاتے آدھا گراتے اور یوں ہی رہ جاتے — اماں جھوٹے برتن اٹھالے جاتیں تو پلنگ کے نیچے سے ایک بلی دبے پاؤں آتی اور گرے ہوئے ٹکڑے اور ہڈی کے ٹکڑے چورے کھا کر واپس لوٹ جاتی — مسعود میاں بڑی خاموشی سے اسے دیکھتے — دیکھتے رہتے — مگر اس سے پیار کرتے یوں ڈرتے کہ ان کے بدنصیب دل نے سدا زخم ہی کھائے تھے۔ کسی سے دل لگانا انہیں کبھی نہ راس آیا — مگر مسعود میاں کا دل بھی کیا دل تھا ؟ ایک دن بلی دبے پاؤں وقت مقررہ پر آئی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کیونکہ آج اماں کو صفائی کا جو بخار آیا تھا تو جھاڑو دے کر چلی گئی تھیں — بلی رہ رہ کر میاؤں میاؤں کرتی رہی اور ان کا جی کلپتا رہا۔

" ایک ٹکڑا ہی ہوتا تو اس کی بھوک مٹ جاتی ۔" انہوں نے چپکے سے سوچا — سوچ کی آواز نہیں ہوتی، پھر بھی بلی کبھی سُن گن پا جاتی تو — ؟ تو کیا وہ بھی دغا کر جاتی — ؟ پھر ان کے دل کا کیا حشر ہوتا —

دوسرے دن اماں برتن لے جانے لگیں تو انھوں نے بالکل بے دھیانی میں روٹی کا آدھا پھلکا اور ہڈی کے ٹکڑے اٹھا کر اپنی شطرنجی کے نیچے چھپا لئے — بلی آئی تو پھر کچھ نہ تھا۔ ناک اٹھا اٹھا کر اس نے ادھر ادھر کی بو سونگھنی شروع کی اور کچھ نہ پا کر بڑی ملائم سی آواز میں شکوہ شروع کر دیا — میاؤں - میاؤں — میاؤں — میاؤں —

مسعود میاں نے بڑی مسرت کے ساتھ شطرنجی کے نیچے سے روٹی نکال عین اس کی ناک کے سامنے لٹکا دی، وہ چونکی، اچھلی، اور گول گول گھومتی روٹی پر پل پڑی — مسعود میاں کو زندگی سی مل گئی — خوشی خوشی انہوں نے ہڈیاں نکالیں ۔ اور وہ بھی کھلا دیں ۔ بلی نے بڑی شکر مند نگاہوں سے

دیکھا اور دُم ہلاتی چلدی

اب روزانہ وقت مقررہ پر بلی آتی اور اپنے حصّے کا مطالبہ خاموش نگاہوں سے کرنے لگتی مسعود میاں کو اس کی لگاوٹ میں بڑا اطمینان ملتا - اب بلی ان سے اتنی مانوس ہوگئی کہ آتے ہی جھٹ پلنگ پر بیٹھ جاتی - اور مزے میں خُرخُر کرتی ان کے پنجے چاٹنے لگتی - اگر کبھی کبھار مسعود میاں ستانے کی جون میں ہوتے یا مذاق پر اُتر آتے تو وہ بھی سمجھ جاتی اور اپنے پنجوں اور زبان سے انہیں گدگداتی، اتنا ستاتی کہ وہ عاجز آجاتے، اور بے بس ہوکر روٹی اس کے منہ میں بھر دیتے — یوں خاموشی سے انجانے ہی انجانے ان کی خزاں بھری زندگی میں بہار لہرائی کہ احساس بھی نہ ہو پایا۔

اب مسعود میاں کو بیماری سے شکایت نہ تھی، ایک تو وہ یونہی رو بہ صحت تھے دوسرے بلی کی قربت نے اکیلے پن کا احساس مٹا دیا تھا - تینوں بھائی باہر کھیلتے - گھر میں آتے پھر باہر جاتے. پھر آتے، پھر جاتے، تب بھی ان کا جی نہ چاہتا کہ کسی کی ادا پر جلیں کڑھیں — اب وہ حالات سے مطمئن ہو چلے تھے اور تو اور اس دن ان کا بستر سے اُٹھنے کو بھی جی نہ چاہا - جب محلہ میں ٹانگہ چھن چھنایا - گھر کے سامنے گلی میں گھوڑے کے قدموں کی ٹاپ اُبھری اور تینوں بھائی اچھلتے کودتے گھر سے باہر بھاگ گئے - تھوڑی دیر بعد وہ چھن چھناہٹ اور ٹاپیں عین گھر کے سامنے آکر رک گئیں — اور پھر تھوڑی ہی دیر میں بازو والے گھر میں میٹھا میٹھا شور مچ گیا - اور دوسرے ہی لمحے تینوں بھائی دوڑتے ہوئے آئے - اور چلا چلا کر سب سے پہلے بولنے کی کوشش کرنے لگے۔

"اماں — اماں — بازو والے —"

"اجی اماں — وہ تانگہ آیا کہ نئیں —"

"نئیں - نئیں — وہ — وہ —"

ہر ایک کی کوشش یہ ہو رہی تھی کہ یہ اہم خبر سب سے پہلے میں ہی سناؤں - اور اس گڑبڑی میں کسی کی بات پوری نہ ہو پا رہی تھی — ابھی یہ تینوں آپس میں الجھ ہی رہے تھے کہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑکھڑائی - اور آپا کا چہرہ نمودار ہوا۔

"اے بہن کیا پکایا ہے آج" — کے گھسے پٹے جملے کی بجائے انہوں نے آج نئی بات

سنائی ــــ "اے بہن تمہارے یہاں کوئی فالتو خالی پلنگ ہوں گے ـــ؟"

"کیوں بھلا ـــ؟" اماں حیرت زدہ رہ گئیں ـ

"دلی سے آپا آئی ہیں ـ وہ ان کی لڑکی اور لڑکا ـ ہمارے ہاں تو تم جانتی ہو پلنگ نہیں ہیں ـ اب انہیں نیچے سلانے سے تو رہی ـــ"

اماں نے بڑی خوشی سے پلنگ بھجوانے کا وعدہ کرلیا ـ ان کو خوشی یوں بھی تھی کہ شہر سے مہمان آئے ہیں، تو ان سے ملنے میں خاص قسم کا مزہ آتا ہے ـ شہر کے لباس ـ نت نئے کپڑے الٹے سیدھے سمجھ میں نہ آنے والے فیشن، رنگ برنگی پہناوے (وہ کم بخت نامراد ڈگی ـ نوج ـ حیدر آبادی پہناوا ـــ اتی بڑی بٹیا اور ٹانگیں کھلی لئے ـ کیا مزے سے گھومتی تھی ـ تھو!)

یوں میل جول میں لطف آتا ہی ہے ـــ مگر اس میں مسعود میاں کو خوشی کا کوئی پہلو نظر نہ آیا ـ نہ وہ خوش ہی ہوئے ـــ "آتے رہیں مہمان ـــ یہ بچے یوں خوش ہو رہے ہیں ـ اور اماں بھی ـــ جیسے دولت ہی مل گئی ہو ـــ ہونہہ ـ

جراح کی جراحی کام آئی اور کہنی کی ہڈی جگہ پر بیٹھ گئی ـــ بستر ابھی بھی بچھا ہی ہوا تھا اور کھانا بھی وہیں پہنچ جاتا تھا ـ بلی اب بھی آتی تھی ـ اور مسعود میاں کی زندگی کا سامان کرجاتی تھی ـــ مہمان تو بازو والے گھر میں آئے تھے ـ مگر بڑ دھودھوں ان کے اپنے گھر میں مچی ہوئی تھی ـ خوشی ان کے اپنے گھر میں بکھر کر رہ گئی تھی ـ

آپا تو اب چارپائی کھڑی کرکے کبھی کبھار ہی باتیں کرتیں ـ اماں خود ہی چلی جاتیں ـ مہمان بی بی کے ساتھ ان کا بیٹا بھی آیا تھا ـ جو تینوں کا گہرا یار غار بن گیا ـــ اب سارا سارا دن چاروں ساتھ گھومتے اور مزے اڑاتے ـ مگر پھر بھی مسعود میاں کو تنہائی کا احساس نہ ہوتا ـ لوگ تو بلی کو بے وفا کہتے ہیں ـ مگر اس نے اپنی وفا سے ان کا دل بھر دیا، کوئی پلٹے نہ پلٹے وہ برابر وقت پر آجاتی ـ چوم چاٹ کے چلی جاتی ـــ دوسرے دن دُم ہلاتی پھر آتی ـ

ایک دن خلاف توقع دو گھنٹے گذر گئے ـ مگر بلی نہ آئی، مسعود میاں کا دل رہ رہ کے اُسے کھوج رہا تھا ـ انہوں نے بستر سے اُدھر اُدھر دیکھا بھی مگر اس کی ٹوہ نہ لگی ـ مرے مرے قدموں سے چلتے

وہ بستر پر آکر دھم سے بیٹھ گئے ۔ بیٹھے کیا گر گئے ۔

کوئی چار بجے کے قریب دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑکھڑائی اور آپا کا اداس چہرہ نمودار ہوا ۔
"ہاں بہن تمہیں وہ مسئلہ معلوم ہے کہ کنوئیں میں بلی مر جائے تو کتنے ڈول پانی نکالنے سے پاک ہو جاتا ہے ۔"

اماں نے چونک کر پوچھا ۔ "کیوں کیا ہوا ۔ ؟"

وہ اداسی سے بولیں ...... "گورے میاں (ان کا اشارہ مہمان بی بی کے شیطان بیٹے کی طرف تھا ۔) نے میری بلی کو شرارت سے کنوئیں میں لوٹ دیا اور کسی سے کہا بھی نہیں ۔ اب مٹھو پانی نکالنے گیا تو بلی دکھائی پڑی ۔" وہ اداسی سے بولیں ۔ "میری پالتو بلی تھی اور اب تو بچے جننے والی تھی ۔" کچھ دیر خاموش کے بعد وہ بھرے بھرے گلے سے پھر پوچھ رہی تھیں ۔
"ہاں تو بہن تمہیں معلوم ہے کتنے ڈول پانی ......"

مسعود میاں کا دل پہلو میں پر کٹے کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگا ۔ کبوتر اڑا اور ان کی آنکھوں میں آبیٹھا ۔ خون کے قطرے ایسے ان کی آنکھوں میں سے ٹپکنے لگے ۔

اس دن سے اس کی آنکھیں سدا کے لئے سو گئیں ۔ وہ ہر لمحہ کے لئے کھوئے کھوئے رہتے زندگی میں کوئی مزہ باقی نہ رہ گیا ۔ کتنی بار انھوں نے دنیا سے دل لگانا چاہا ۔ اور کتنی بار انہیں مایوسی ہوئی زندگی پھر اسی راہ پر چل پڑی ۔ اور وہ یوں بادشاہ کی طرح تاج پہنا کر بٹھائے بھی گئے جاتے ۔ ادھر بستر چھوڑا اور ادھر کام گلے سے لپٹے ۔ زندگی کا پھر وہی پرانا انداز تھا ۔ وہی اُچاٹ اُچاٹ دل ۔ وہی بےچین آرزوئیں اور ناکام تمنائیں ۔

اس دن انہوں نے بڑی سنجیدگی سے سچ مچ مرنے کے بارے میں سوچا ۔ ایک سرے سے سب کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ کس کو ان کے مرنے کا افسوس ہوگا ۔ ؟

ابا جان ۔ ؟ ارے وہ تو بتاشے بانٹیں گے سیر بھر ۔

اماں ۔ ہونہہ ۔ خوش ہو جائیں گی کہ چلو روز روز کی جھک جھک سے نجات ملی ۔ ہاں یاد کریں گی بھی تو اپنے مطلب سے کہ آٹا کون گوندھے گا ۔ (کیسے مطلبی لوگ ہیں ۔ یہ)

دادامیاں — واہ — کیا کہنے ، کون ایسا مجھ میں جی اٹکائے بیٹھے ہیں وہ — اگر اپنی پن پناتی آواز سے یاد کریں گے بھی تو بس اس لئے کہ مسعود ان کا حقہ بھرا کرتا تھا - بڑے آئے محبت والے —— بھولا تو نہیں ہوں موریتیاں کیسے تڑوائی تھیں -

اَتّو — اخلاق — اَجّو — (برادران یوسف) انہیں سچ مچ ہنسی آگئی — یہ بھائی ارے یہ بھائی تو ایسے ہیں کہ موت پر بھی خوشیاں منائیں کہ سیوم کے دن چنے اور ریوڑیاں کھانے کو ملیں گی — بڑے بھائی روز مریں کہ روز سیوم ہو -

پھر کون ہے جس کے لئے جیا جائے — ؟ مگر مرا کیسے جائے — ؟" ٹنکچر آئیوڈین کا واقعہ تو یاد تھا - کیسی جھوٹی موت تھی — بیٹھے بٹھائے پیچش میں مبتلا ہونا پڑا - اب تو مرنے کی کوئی صورت نظر بھی نہیں آتی — پھر — پھر — ؟ اکدم ذہن کے باریک گوشے میں جھم جھم سورج جگمگا اٹھا - ان کا وجود منور ہو اٹھا -

"کنوئیں میں ڈوب کر جان کیوں نہ دے دوں —— ؟ - بلی مر سکتی ہے تو انسان کیوں نہیں مر سکتا - ؟ یقیناً مر سکتا ہے —"

انہوں نے ہر ہر پہلو پر غور کر لیا - اور بالکل طے کر بس کنوئیں میں کود کر مر جانا ہی انتہائی فائدہ مند اور آسان بھی ہے — تو بس طے رہا نا — آں ؟

دوسرے دن وہ انتہائی مطمئن انداز سے بستر سے اٹھے ، اماں نے ان کے لئے عید کا جو جوڑا سلوایا تھا ، نیلی نیلی دھاریوں والی سلکن قمیص اور ہرک کا کھڑکھڑاتا پاجامہ - سرخ اور نیلے پھولوں والے جوتے —

"مر جاؤں گا تو کون پہنے گا — کیوں نہ انہی کو پہن کر مر جاؤں — ؟" انھوں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا یہ اچھا تھا کہ اماں چولھے کے پاس تھیں - انھوں نے جلدی سے صندوق کھولا اور جوڑا پہن لیا - ان کا بیمار اور پژمردہ چہرہ نیلی قمیص میں چمک اٹھا — گھر سے چلتے چلتے انھوں نے چاہا کہ اپنی پیاری چیزوں پر ایک نظر ہی ڈال لیں - مگر اس حقیقت کو جان کر ان کا جی رو اٹھا کہ اتنی بڑی دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی پیاری نہ تھی جس میں ان کا جی اٹکتا —

نپے تلے قدم اٹھاتے وہ خالہ جی کے گھر میں داخل ہو گئے ۔ کنواں گھر کے پچھواڑے تھا کوئی نہ تھا ۔ بس کنوئیں میں چرخی لگی ہوئی تھی، ڈول پاس پڑا ہوا تھا ۔ انہوں نے اندر جھانک کر کنوئیں کی گہرائی کا اندازہ لگانا چاہا ۔ خاصا گہرا تھا ۔ نیچے ہرا ہرا پانی چمک رہا تھا ۔

مرنے سے پہلے نہ چاہتے ہوئے بھی کئی خیال ان کے دماغ میں لہرا گئے ۔ دل میں کتنی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں تھیں ۔ پیار کرنے کی، پیار کئے جانے کی ۔ پھر سلسلے وار انہیں خیال آتا گیا کہ انہوں نے پیار کے کتنے سہارے ڈھونڈے تھے ۔ اماں، ابا ۔ گھر کے کام کاج ۔ کتا ۔ آڑی ٹیڑھی لکیریں ۔ بھائی، بلی ۔ کوئی اپنا تو نہ ہو سکا ۔ مٹی کے کھلونوں میں جی اٹکانا چاہا وہ بھی دور ہو گئے ۔ پھر کیا دھرا ہے دنیا میں ۔ جینے میں ۔ ؟ انہوں نے اپنے جسم کا تول دیکھا اور......

"ارے رے ۔ جھانکو نہیں ۔ گر پڑو گے ۔!" پیچھے سے یہ کیسی آواز آئی ۔ ؟

وہ گھبرا کر پلٹ پڑے ۔ گھوم کر دیکھا تو پچھواڑے کے سائبان میں کیسی روائتی پری جیسی بیٹھی تھی ۔ لال لال کپڑے پہنے ۔ ادا سے سر پہ پلو ٹکائے ۔ لال فرغل کے جھول دار گھیر دار دامنوں کے خیمے میں مسکراتی، ہنستی ۔

وہ جھجکے، سہمے، اور پھر آگے بڑھے ۔ قریب آ کر بولے "کون ہو تم ۔ ؟"

"لڑکی ۔" وہ ہنس کر بولی ۔

"لڑکی ۔ ؟" اچھا تو کیا یہ لڑکیاں اتنی خوبصورت ہوا کرتی ہیں ۔ ؟" لڑکی تو ہو مگر ۔ تمہارا نام تو ہو گا ۔ ؟"

"ثریا" ! پھر وہ ذرا تنبیہ کے انداز میں بولی ۔ "ہاں جی کنوئیں میں جھانک کیوں رہے تھے؟ اتنا گہرا ہے، کبھی گر پڑتے تو ۔ ؟"

مسعود میاں نے غور سے اس کی طرف دیکھا ۔"

"ہونہہ ۔"

بات ٹال کر بولے ۔ "اور تم یہاں کیا کر رہی ہو ۔ ؟"

"گڑیا کھیل رہی ہوں ۔ وہ اپنے آس پاس کے بکھرے سامان کو دیکھتی بولی ۔ دکھتا نہیں

— پھر کچھ فخر سے گنگنائی — "اور دیکھو یہ چڑیا کے انڈے بھی ہیں۔"

مسعود میاں نے آگے بڑھ کر دیکھا اور حقارت سے بولے

"باس — یہ ایسے مڑے مارے انڈے لے کر یوں خوش ہو! ہمارے پاس تو ایسے ایسے انڈے ہیں کہ بس —"

"کہاں سے لائے تم — ؟"

"میں نے خود گھونسلوں سے اتارے —"

"تم نے — ؟ ارے تم نے — ؟" وہ ان کے ہلکے پھلکے جسم کو دیکھ کر ہنسنے لگی، لال ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر زور زور سے ہنس کر بولی —

"ارے بھائی تم کیسے اتار سکتے ہو انڈے — بھلا تمہیں درخت پر چڑھنا آتا ہے — ؟"

یہ تو بڑی ذلت تھی کہ وہ خوبصورت بلائیوں حقارت سے ان پر ہنسے — انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور پائینچے چڑھائے صحن میں کھڑے جھاڑ پر لپک پڑے — اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر انھوں نے چار چھ رنگین انڈے برآمد کر لئے اور جیب میں بھر کر نیچے اُتر آئے —

نیچے آئے تو وہ آنکھوں پر ہاتھ ڈھانکے بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی — انھوں نے ٹھوکا دیا —

"یہ لو انڈے — اور یہ آنکھیں بند کر کے کیوں بیٹھی ہو بھئی — ؟"

"ہائیں —" اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں — اور شرما کر، ذرا لجا کر بولی — "مجھ سے دیکھا نہ گیا — اللہ نہ کرے تم گر جاتے تو ؟" — پھر اس نے انڈوں پر نظر ڈالی اور کھِل کر بولی — ہائے سچ —! ارے کتنے پیارے ہیں — کس قدر اچھے ہیں —" پھر نگاہیں عین مسعود میاں کی نگاہوں میں ڈال کر بولی —" تم — تم کس قدر اچھے ہو — اُف، اخلاق، احمد اور وہ (ناک سکوڑ کر) سٹرِل گورے — سارے کے سارے حد درجہ بجگڑیل — دیں تو کبھی نہ، اُلٹے لڑائی کرتے پھریں — تم اس قدر اچھے ہو —"

"تم بھی تو بڑی اچھی ہو —" وہ بڑی معصومیت سے بولے

اس کی چمکیلی آنکھوں میں دھیمی دھیمی آگ سلگ اٹھی — برسات کے دنوں میں مسعود میاں سردی سے بچنے کے لئے چولھے کے پاس جا کر بیٹھ جاتے — یخ جسم کو وہ ہلکی ہلکی تپش کیسی بھلی لگتی تھی — وہ زندگی بخش

حرارت ـــ! انہوں نے غور سے ان آنکھوں میں جھانکا۔

وہ آگ اتنی روشن، اتنی واضح تھی، ان کا انگ انگ جل رہا تھا ۔ بھڑک رہا تھا ۔ انھوں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ادھر آنگن میں پھولوں کے گچھے کھلے پڑے تھے۔ پتی پتی میں ثریا بی بی کے ہیولے اُبھر آئے ابھی وہ گلاب کی پتی میں چھپی ڈھکی مسکرا رہی تھیں ۔ ابھی انہوں نے اپنے موم لیسے پیر کنول کے سفید جوڑے چوڑے پتوں پر دھرے تھے۔ ابھی وہ موتیا کی کول اور نازک پتیوں میں کھل کھلا کر ہنس رہی تھیں، ابھی ابھی وہ سورج مکھی بن کر سارے آنگن میں سنہرے سنہرے اجالے پھیلا رہی تھیں ـــ سنہرے اجالالے ۔ سنہری آگ ـــ

انھوں نے آگ کی تپش سے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔ اک دم انہیں خیال آیا کہ وہ مرنے کے لئے آئے تھے ۔ انھوں نے لاپروائی سے پوچھا ۔

"اگر میں جھاڑ سے گر جاتا مر جاتا تو ـــ؟"

کس قدر بے باک معصومیت سے وہ بول اٹھی

"تو میں بھی مر جاتی ـــ"

کئی دنوں سے جو ندیاں اتنی سوکھی تھیں ان میں کہاں سے گھٹا ٹوٹ کر برس پڑی ـ۔

"تم بھی مر جاتیں؟" وہ حیرت سے بولے ۔ ان کی چمکیلی آنکھوں میں بادل برس برس گئے ثریا بی بی ہنسنے لگیں ـــ "ہاں سچ ۔ اور جانتے ہو کیوں؟" وہ آنکھوں میں آنکھیں لہرا کر بولی ـــ "تم میرے ہی لئے چڑھے تھے نا؟" سینے پر انگلی ٹکا کر ادا سے بولی ـــ "میرے لئے ۔ ہاں ۔"

اُن کے دل کے ہزار ٹکڑے ہو گئے اور ایک ایک ٹکڑا ڈھیرے ڈھیرے آنسو بن کر بکھرنے گرنے ۔ اور ٹوٹنے لگا ۔

"مگر میں تو کنوئیں میں کود رہا ہوں ـــ" وہ بھرپور سنجیدگی سے بولے ۔

اکدم وہ کھیل چھوڑ چھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی ـــ" اس کے چہرے کا رنگ فق ہو رہا تھا ۔ جلتی جلتی آنکھیں اس قدر قریب آگئی تھیں ۔

"تمہیں میری قسم — بھلا وہ کیوں — ؟"

تمہیں میری قسم — تمہیں میری قسم — تمہیں میری قسم — !

پیار کا — چاہے جانے کا یہ انداز کیسا دل توڑ دینے والا تھا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا موت اس قدر قریب تھی — اس قدر قریب کہ اس کی آہٹ تک محسوس ہو رہی تھی —

"سنو —" وہ آگ میں کود پڑے — آنکھوں میں جھک کر جھانک کر بولے —"میں سچ مچ مرجانا چاہتا ہوں — کیونکہ مجھے کوئی پیار نہیں کرتا — یہ میرا آخری فیصلہ ہے — بہت سوچا — بہت سوچا — بس یہی سمجھ میں آیا —"

"ہاں —" تمہیں کیسے خبر کہ تمہیں کوئی پیار نہیں کرتا — ؟" گیارہ برس کے ننھے آدمی انہیں خبر بھی کیا ہوتی — ؟

وہ ہاتھ چھڑا کر چلنے کو ہوئے — وہ لپک کر بیچ میں آگئی —" مگر سن رکھو — تم کودے تو میں بھی کود جاؤں گی — کیا تم چاہتے ہو میں مر جاؤں — ؟ وہ اس قدر قریب آگئی تھی — وہ مجسم بہار — مجسم آگ — جو انہیں جلا رہی تھی — جلا رہی تھی —

"تم کودے تو میں بھی کود جاؤں گی —"

"میں بھی کود جاؤں گی —"

"میں بھی . . . .

کیا یہ سب کچھ میرے لئے ہے — میرے لئے — ؟ آج تک کوئی ان کی راہ میں نہیں آیا تھا — اس عزم کے ساتھ کہ تمہاری زندگی سے میری بھی زندگی ہے — وہ بے کل ہو کر لپک پڑے

"میں نہیں مروں گا — میں جیوں گا تمہارے لئے — تمہارے — صرف تمہارے لئے — میں نہیں مروں گا —"

"اے رُودِ مُوسےٰ"

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ــــ ؟!
سترہ سال کی عمر میں مَیں خوبصورتی کا مکمل نمونہ تھی ــــ میرا جسم متناسب تھا، قد لمبا لمبا، ہاتھ پاؤں صندلیں۔ آنکھیں شراب کے پیالے۔ رنگت ایسی جیسے کسی نے میدہ، گلابی پانی سے گوندھ کر رکھ دیا ہو ــــ تم اگر اُسے خودستائی نہ کہو تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ میں نے دنیا میں خود سے زیادہ حسین شکل نہ دیکھی ــــ اور میرے اس حسن کا مول بھی بہت اونچا تھا۔
میری منگنی شہر کے ایک بہت بڑے رئیس کے ولایت پلٹ لڑکے سے ہو چکی تھی اور اسی لئے بھائی میاں مجھے بڑی سرگرمی سے چھُری کانٹے سے کھانا کھانا سکھا رہے تھے۔ کبھی کبھی میں کانٹا زبان میں چبھا لیتی ــــ
یا چھُری اس بے دردی سے ڈبل روٹی پر چلاتی کہ میری انگلی کٹ جاتی۔ اور نتیجے میں بھائی جان میرے سر پر ایک آدھ دھول جڑ دیتے ــــ انھوں نے ہزار بار بڑے پیار سے

سمجھایا تھا کہ کانٹے میں اٹکے روٹی یا گوشت کے ٹکڑے کو دانتوں کی مدد سے بڑی آہستگی سے زبان پر اتار لینا چاہیئے۔ مگر میں اکثر کانٹا اس انداز سے منہ میں رکھتی کہ زبان میں چبھ چبھ جاتا ــ مگر کانٹے کی یہ چبھن بھی بھلی لگتی ـــ یہ سب کچھ میں اپنی نئی زندگی میں داخل ہونے کے لئے ہی تو سیکھ رہی تھی نا ــ؟؟

جب بھائی میاں مجھے کھانا سکھا رہے ہوتے، دالان میں اماں بیٹھی خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورے جاتیں ــ جس گھرانے میں میری بات لگی ہوئی تھی، وہ گھرانا بڑا فارورڈ تھا، وہاں کے سارے طور طریقے بالکل انگریزوں کے سے تھے، اماں ڈرتی تھیں کہ میں نے اپنی نادانی کی وجہ سے اگر کوئی الٹ پلٹ بات کر دی تو اچھا رشتہ ہاتھوں سے نکل جائے گا۔! ولایت پلٹ لڑکے کوئی روز روز ملتے ہیں جی ـــ؟ (تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ــ؟)

میں سوچتی اماں کے خدشے بھی بے بنیاد تو نہیں ہیں ــ کانچ کے نازک اور خوبصورت کھلونے کو کوئی ٹھوکر مار دے تو کیا انجام ہوتا ہے ــ؟ (وطن میں ہماری زندگی بھی تو ایسی ہی نازک نازک خوبصورت کانچ کے کھلونے ایسی تھی)۔ وقت کی مضبوط ٹھوکر پڑی اور کھلونا چکنا چور تھا ــ پرانی زندگی کی یاد کو لے کر اب کرنا بھی کیا تھا ــ وہ ساری خوشیاں اور ولولے تو سرد پڑ گئے تھے ــ اب تو پیٹ کی آگ تھی اور کچھ نہیں ـ جسے کسی نہ کسی صورت بجھانا تھا ــ ابا راستے میں بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے اور لٹ پٹا کر میں، اماں اور بھائی میاں کسی نہ کسی طرح بچ نکلے ـ ان دنوں میں کس قدر ذرا سی تھی ــ؟ پھول کی طرح تازہ ــ کانچ کی طرح نازک، ــ اماں مجھے اس طرح بچا بچا کر لائی تھیں جیسے مرغی، چیل کو منڈلاتے دیکھ اپنے پروں میں اپنے بچے کو چھپا چھپا لیتی ہے ـ میں اماں کے پروں میں دبی دھنسی، پتہ نہیں کن کن راستوں سے گذر جاتی تھی ــ راستے میں کبھی کبھار آنکھیں کھول کر ذرا سر اٹھا کر ریل کی کھڑکی سے باہر جھانکتی تو رات کا پراسرار اندھیرا اور سناٹا جیسے میری روح سلب کئے لیتا ـ میں گھبرا کر پھر آنکھیں موندھ لیتی ـ

زندگی کا پہلا سفر انہی اندھیروں میں کٹا ــ شائد اس دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو اجالوں کی چاہ کرتے ہیں انہی کو اندھیرے ملتے ہیں ــ اپنے پیچھے ہم کیسی زندگی چھوڑ آئے تھے ــ؟؟

بھرا پُرا گھر — ہنستا جھومتا وہ باغ — پورٹیکو میں ابھی ابھی آکر کھڑی ہوئی کار — وہ نیلے رنگ کے پردوں والا ڈرائنگ روم — اور — اور —

(تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا — ؟؟)

ہم آگے بڑھ آئے، زندگی وہیں رہ گئی — میں نے اپنی کتابیں کاپیاں جو میز پر کھول رکھی تھیں شائد ابھی تک کھلی پڑی ہوں —! میز کے کنارے میں نے دوات کا ڈھکنا رکھ دیا تھا — کون جانے وہ وہیں پڑا ہو — الجبرا کا ایک سوال میں نے ابھی پورا حل بھی نہیں کیا تھا — سنہری سنہری روشنی میں اپنی میز پر جھکی جھکی میں کس قدر لگن اور اشتیاق سے اُدھورا سوال حل کر رہی تھی —؟؟ پھر میں وہ سوال کبھی حل نہ کر سکی — وہ سنہری سنہری روشنی وہیں کھو گئی — شائد وہ دوات لڑھک گئی تھی — تبھی تو سارے میں سیاہی پھیل گئی تھی — رات کی طرح تاریک اور ڈراونی — پھر سب کچھ اس سیاہی، اس تاریکی میں ڈوب گیا — مٹ گیا — فنا ہو گیا اور ہم دھیرے دھیرے چوروں کی طرح اپنے ہی گھر سے یوں نکل آئے کہ پیچھے پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکے — میں تو پوچھتی ہوں اتنے دن گزرنے پر بھی یہ دکھ جی سے کیوں نہیں جاتا — ماہ وسال کے کندھوں پر رکھا ہوا یہ بوجھ ہلکا کیوں نہیں ہوتا — کیوں نہیں ہوتا — ؟؟ — بولو — بولو نا — مگر نہیں — مجھے اس طرح جذباتی نہیں ہونا چاہیئے مجھے آج تم سے کوئی سوال نہیں کرنا ہے۔ بس تمہیں سب کچھ سنانا ہے — جی کا یہ بوجھ کسی طرح تو ہلکا پڑے — دل کا یہ دکھڑا کوئی تو سُنے — میرے غم سے بھرے دل کو ایک ہلکی سی مسرت، تو مل جائے کہ کوئی تو تھا جس نے میرا غم بانٹا —! تمہارا یہ پرسکون انداز — تمہاری یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ واقعی تم غور سے میری باتیں سن رہے ہو — نا ؟؟

میں الجھے ہوئے دھاگوں میں سرا تلاش کرتے کرتے بھٹک جاتی ہوں — بھول جاتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی تھی — اتنی ساری باتیں الکدم سے زبان کی نوک پر آکر مچلنے لگیں تو کیسے نہ کوئی راہ بھولے ؟ — کیسے نہ میں سرا کھو دوں —؟

ہم نے اس دیار غیر میں قدم رکھا تو کوئی آسرا نہ تھا — کوئی سہارا نہ تھا — بھائی میاں پنی ادھوری تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے، مگر کوئی ذریعہ کوئی آسرا نہ تھا — وہ ڈاکٹر بننے کے خواب

دیکھتے تھے مگر صرف ایف ایس سی پر آ کر ان کی گاڑی رک گئی ـــ میں نے زندگی کے جو سہانے خواب بنے تھے، سب جہاں کے نہاں رہ گئے ـــ بھائی میاں جوتیاں چٹخاتے سارے شہر کی خاک چھانا کرتے کہ کہیں سے چار پیسے کا آسرا لگ جائے اور ادھر میں اور اماں ایک تنگ تاریک سے مکان میں ـــ (ایسا مکان ۔ جسے مکان کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا) زندگی کی دھوپ چھاؤں کے رنگ دیکھا کرتیں ـــ کیا تم سمجھتے ہو ویرانے میں کھلنے والی کلی کبھی پھول نہیں بنتی ـــ ؟؟ میں اسی ویرانے میں کلی سے پھول بننے لگی ـــ اور سچ جانو ایک دن اسی اندھیارے کمرے کی دیواروں نے پہلی بار چاند کی کرنوں کا سامنا کیا ۔ !!

بھائی میاں کو چالیس روپے ماہانہ کی بہت بڑھیا سی ملازمت مل چکی تھی ۔ جہاں وہ دن بھر مغز پاشی کرتے اور شام کو یوں لوٹتے جیسے ابھی ابھی مرجائیں گے ـــ کاش مر ہی جاتے ۔ زمین کی چھاتی پر کا بوجھ کچھ تو کم ہوتا ! مگر یہ سنو کہ ہم میں سے کبھی کوئی نہ مرا ـــ دنیا میں غریبوں کے لئے جینے کی تو راہ ہی نہیں ہے ۔ مگر مرنے کی بھی کوئی راہ نہیں ہے ـــ کوئی کیا جئے کوئی کیا مرے ۔ ؟

معاف کرنا، تم پتہ نہیں ہمارے متعلق کیا سوچو، مگر یہ بات میں سنائے بغیر نہیں رہوں گی کہ ان حالات کے باوجود میرا اس قدر اعلیٰ گھرانہ میں رشتہ طے پا جانا، کس وجہ سے تھا ـــ وہ محض ایک سوٹ تھا ۔ ہاں، ہاں اونی سوٹ ـــ گرے کلر کا ـــ بھلے ہی تم اُسے بُرا کہہ لو، مگر میں نہیں کہوں گی ـــ اگر آدمی کو کھانے کو نہ ملے، پہننے کو نہ ملے تو میں سمجھتی ہوں اُسے ہر عیب کو ہنر سمجھنا چاہئے بھائی میاں کئی دنوں سے ایک جوڑے پر گذارہ کر رہے تھے ـــ چالیس روپے میں کیا ہو سکتا ہے؟ شائد یہ بات تمہاری سمجھ میں نہ آسکے ۔ مگر ہم تو سمجھ سکتے ہیں نا ـــ اس دن چکنی، کالی، لمبی ۔ سڑک پر، جبکہ کوئی موٹر، سائیکل بس نہ تھی، اکیلے بھائی میاں چلتے چلے آ رہے تھے اور ان کے آگے اک خوش پوش نوجوان ـــ (اوہ ذرا سوچو ۔ غریبی کس قدر بڑی معلّم ہے) بھائی میاں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور پیچھے سے اس خوش پوش کی گردن پر ایک دھول جمائی ـــ بھائی میاں ایسے کوئی ظالم تو نہ تھے کہ اُسے جان سے مارنے کے بارے میں سوچتے ـــ وہ تو محض اپنی ضرورت پوری کرنا چاہتے تھے ـــ تھوڑی دیر بعد جب بھائی میاں اسی تمکنت اور بھرم سے سڑک پر چل رہے

تھے تو ان کے جسم پر وہ قیمتی گرے کلر کا سُوٹ تھا اور اس خوش پوش نوجوان کے جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

ہاں تب میں نے جانا کہ لباس قسمتیں بدل دیا کرتا ہے ـــ بدل سکتا ہے۔ دیکھو ہم لوگ غریب ضرور ہیں ـــ مگر اپنا عیب نہیں چھپاتے ـــ سچائی میں جیت ہے نا۔ بس اسی لئے۔ رات کو بھائی میاں نے بڑے فخر سے بتایا کہ کس طرح پلک جھپکتے میں ایک قیمتی سوٹ کے مالک بن بیٹھے تھے ـــ اس رات ہم دونوں کتنی دیر تک ہنستے رہے تھے۔! اُف! پوچھو مت ـــ کیسی، خوشی تھی کہ بس ہنسی رکتی نہ تھی ـــ!

دوسرے دن وہی سوٹ پہن کر بھائی میاں اپنی سروس پر گئے تھے ـــ اور پھر پتہ ہے کیا ہوا تھا۔؟؟ ۔ اسے اتفاق بھی کہہ سکتے ہیں ـــ قسمت بھی کہہ سکتے ہیں ـــ بہرحال ہوا یوں کہ جب بھائی میاں اپنی سروس پر گئے تھے ـــ اپنی میز پر جھکے قلم چلا رہے تھے تو ان کا باس ان کے پاس آکھڑا ہوا۔ پہلے تو وہ سر سے پاؤں تک ان کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ پھر یوں گھوم پھر کر ان کے گرد پھیرے ڈالے جیسے کوئی قربانی کے لئے بکرا خریدنا چاہتا ہو۔ دیکھ لینا چاہتا ہو کہ کوئی کمی تو نہیں ہے۔ کن کٹا تو نہیں ہے ـــ لنگڑا تو نہیں ہے ـــ بیمار تو نہیں ہے ـــ بھائی میاں نے سر اٹھا کر دیکھا اور گھبرا کر سر جھکا لیا۔

"آجکل تو یہ کپڑا ملتا ہی نہیں ـــ کہاں سے خریدا مسٹر۔" وہ بہت سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی ۔ جی ۔ جی ۔" بھائی میاں ہکلا کر بولے ۔" اگر آپ کو یونہی بھلا لگتا ہے تو لے لیجئے نا ـــ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی میری ـــ"

باس مسکرا کر رہ گیا۔

گھر آکر پوری روداد بھائی میاں نے مجھے بتائی اور یہ بھی کہا کہ اس اہم فرض کو میں ہی انجام دوں ـــ کہ ان کے باس تک یہ سُوٹ پہنچا دوں۔ (اس لمحہ ان کے چہرے پر چراغ سا جل رہا تھا۔ اُمید کا ہی ہوگا۔!)

پہلے تو بڑی دیر تک جیل حجت ہوتی رہی کہ میرا جانا مناسب ہوگا۔ بھی یا نہیں ——— اور جب یہ طے ہو گیا تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ میں اتنے بڑے بنگلے پر جاؤنگی تو سہی مگر پہنوں گی کیا —— ؟

تم یوں لمبے لمبے سانس کیوں لے رہے ہو — ؟ تبرل — تبرل — تبرل — شاید یہ سوچ رہے ہو کہ آگے میں کیا کہوں گی —— ہاں شاید تم یقین نہ کرو کہ زندگی کیا تھی — کیسی تھی — کس کمبخت کے پاس خوشی تھی — ؟؟ — آخری آنسو تھے جو ہر صبح پر برس برس کر اندھیروں میں اجالے پیدا کرتے تھے — خیر — اس ایک سفید ساڑی کو جو اماں نے پتہ نہیں کس خیال سے سینت کر رکھی تھی میں نے اپنے جسم کے گرد لپیٹا —— اور تم ایک لمحے کو تو سوچو کہ اس سفید لباس میں کیا قیامت ڈھا رہی ہوں گی —— ؟؟ یہ گال اس وقت مرجھا کر زرد پڑ گئے ہیں تو کیا ہوا — ؟ یہ لمبے لمبے بال اب دھول سے اٹ گئے ہیں تو کیا ہوا —— یہ صندلیں بازو اور لچکتا جسم اب نڈھال نڈھال ہو گیا ہے تو کیا ہوا —— تب تو میں ایسی نہ تھی — میں تو شبنم میں نہایا ہوا تازہ پھول تھی — جس کی پنکھڑی پنکھڑی سے رس نتھرتا تھا —

حسن اپنی قیمت اپنی بولی اٹھوانے چلا تھا —

بھائی میاں نے پھاٹک کو ذرا سا دھکا دیا — اور ایک بڑے بڑے بالوں والے پیلے رنگ کے کتے نے بھونک بھونک کر ہمارا استقبال کیا — بھائی میاں تو مصلحتاً باہر جا کر چھپ گئے اور میں وہیں کاغذ میں تہہ شدہ سوٹ سنبھالے سہمی سہمی کھڑی رہ گئی —— کتے کی آواز سن کر پہلے تو چپراسی اور پھر ایک خوبصورت سا جوان آدمی باہر نکل آیا —

اب میں تم سے یہ نہ بتاؤں گی کہ کتنے لمحے یونہی گزر گئے تھے —— نہیں، ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا — نہیں نہیں — شاید میں بھول گئی ہوں — مجھے تو کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ ساری عمر گزر گئی تھی — ایک صدی سے کم کیا گزری ہوگی —— نہیں شاید وقت ٹھٹھک کر یونہی ساکت ہو گیا تھا وقت تو مگر کبھی نہیں رکتا نا — ؟ تو شاید میں ہی بھول رہی ہوں —!

پھر میں ایک بہت سجے سجائے ڈرائنگ روم میں تھی —— ہمارے دلی والے ڈرائنگ روم سے بھی بڑھ چڑھ کر سجا سجایا — ! تم کیا سمجھتے ہو میں اپنا ماضی بھول گئی ہوں — بھول سکتی ہوں

ارے توبہ کرو — عورت کے چار آنکھیں ہوتی ہیں — دو چہرے پر ۔ دو پیٹھ پر — چہرے پر کی آنکھیں تو سبھوں کو نظر آتی ہیں ۔ مگر وہ جو پیٹھ پر ہوتی ہیں وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا ۔ صرف عورت انھیں محسوس کرتی ہے ۔ اور ان سے ماضی کو دیکھتی رہتی ہے ۔ پوجتی رہتی ہے — مرد کی نگاہ مستقبل پر ہوتی ہے ۔ اور عورت ماضی کو دیکھتی ہے پلٹ پلٹ کر ، مڑ مڑ کر بڑھتی ہے میں کیسے اپنا ماضی بھول جاتی — بچہ تھی تو کیا ہوا ۔ عورت تو تھی ۔ !

میں سہمے ہوئے پرندے کی طرح صوفے کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی اور وہ بچوں کی طرح مجھ سے برتاؤ کر رہے تھے — یہ لو — وہ لو — یہ کھاؤ ۔ وہ چکھو ۔

اتنے میں دروازہ کا پردہ ہٹا اور بھائی میاں داخل ہوئے ۔ اپنے ازلی اور اکلوتے جوڑے میں ملبوس — میں نے ذرا طنز سے باس کی طرف دیکھا ۔" دیکھ لی ہماری حقیقت —" میری نگاہیں یہی کچھ کہہ رہی ہونگی ۔ اس کا مجھے یقین ہے ۔ کیونکہ اسی لمحہ میری نگاہوں کو پڑھ کر انھوں نے فوراً بھائی میاں سے کہا تھا ۔

" جمیل صاحب — بات بے ڈھب اور اچانک ہی کہہ رہا ہوں ۔ مگر آپ اپنی بہن کو میری دلہن بنانا پسند کریں گے —؟"

وہ باس تھے اور بھائی میاں ان کے ماتحت ۔ شائد کوئی اور موقعہ ہوتا ، کوئی دوسرا مخاطب ہوتا ، تو ان کے لہجے میں اتنی بے تکلفی اور انداز گفتگو اتنا صاف صاف نہ ہوتا ۔ مگر بھائی میاں تو پاتال میں تھے —

بھائی میاں اس قدر سراسیمہ ، اس قدر حیرت زدہ ، اس قدر پریشان سے رہ گئے کہ منہ سے کچھ نکلا ہی نہیں — بڑی دیر بعد وہ بولنے پر آئے تو پھر بولتے ہی چلے گئے ۔ اور ہماری زندگی کی کوئی بات ایسی نہ تھی ، جو انھوں نے نہ سنادی ہو — !

" میں جانتا ہوں — میں جانتا ہوں —" وہ سگار کو میز پر تھپک تھپک کر اتنا ہی کہے جا رہے تھے ۔

" آپ جانتے ہیں نا ہم کتنے غریب ہیں — آپ کو معلوم ہوگا نا کہ میری بہن صرف سیاتویں

کلاس پاس ہے ۔۔۔ آپ تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارے پاس رہنے کو ڈھنگ کا مکان بھی نہیں ہے۔ پہننے کو کپڑے بھی نہیں ۔۔ سونے کو بستر بھی نہیں ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔

"اور ۔۔۔۔" انھوں نے بات کاٹ دی ۔ "اور آپ جانتے ہیں کہ میں ایک نواب باپ کا بیٹا ہوں ۔۔ اپنا ایک ذاتی بزنس چلائے ہوئے ہوں ، اتنی بڑی دولت کا مالک ہوں اتنے بڑے بنگلے میں تنہا رہتا ہوں اور تنہا حقدار ہوں ۔۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں محض سیر کے طور پر ہزاروں روپے خرچ کرکے لندن ہو آیا ہوں ۔۔۔ اور آپ یہ بھی جان رہے ہیں کہ میں آپ سے آپ کی بہن کا ہاتھ مانگ رہا ہوں ۔ اور یہ بھی سنا دوں میں پاگل نہیں ہوں ۔۔ آپ سے نداق بھی نہیں کر رہا ہوں ۔۔ آپ کو دھوکا بھی نہیں دے رہا ہوں ۔۔۔ آپ کی بہن سے باقاعدہ شادی کروں گا ۔۔" وہ رُکے ۔۔ آگے بڑھے ۔ میرے قریب آکر ٹھٹھک گئے اور میرا چہرہ اوپر اُٹھا کر بولے ۔

"یہ انسان نہیں ۔۔ پری ہے ۔ اور میں بہت حسن پرست واقع ہوا ہوں جمیل ۔" اور وہ امید بھری نگاہوں سے بھائی میاں کو دیکھنے لگے ۔

"تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ۔۔۔ ؟؟

ایک انسان ، خدا بن کر ہماری زندگی میں آیا اور ہم پر آسمان بن کر چھا گیا ۔ !

زندگی کس قدر حسین تھی ۔! کتنی خوشگوار ۔۔۔ کتنی پیاری ۔ مگر ۔ مگر کیا انجام بھی اتنا ہی حسین ، اتنا ہی خوشگوار ۔ اتنا ہی پیارا ہو سکتا تھا ۔ ؟

تم بے چین ہو رہے ہو ۔ ہاں تمہاری ساکن سطح پر یہ کیسی ہلچل ہے ۔ کیا میری باتوں سے تمہارے دل میں بھی دکھ کی لہریں پیدا ہو رہی ہیں ۔ ؟؟ اے رود موسیٰ ۔ ٹھہر جا ۔ تھم جا ۔ میری باتیں سن لے ۔ میرے دل کا درد اپنے دل میں بھر لے ۔۔ میں اس درد کو اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی ۔ نہیں لے جانا چاہتی ۔۔ آج اپنی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں کا حساب لے کر میں تیرے پاس آئی ہوں ۔ سُن لے میری داستان ۔۔۔ سُن لے ۔۔ سُن لے زندگی پر چھائے غم کے گھرے بادل جیسے اکرم جھپٹ کر رہ گئے ۔۔ زندگی میں سکون

اور مسرت آگئی ـــ یہ ایسی خوشی تھی جس کے بارے میں سوچا بھی نہ جا سکتا تھا ـ اماں میرے لئے کتنی پریشان رہا کرتی تھیں ـــ غریبی اور حسن جہاں ایک جگہ ہو جائیں ـ وہاں آپ ہی آپ ایک چھلکہ کھل جاتا ہے ـ جوانی بہاریں لٹاتی آتی ہے ـ اور پھر کسی سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ـــ اب نافۂ مشک کی طرح میری خوشبو گھر سے باہر نکل کر پھیل رہی تھی ـ زندگی جس راہ پر جا رہی تھی، اُسے دیکھتے ہوئے اس کے سوا اور سوچا بھی کیا جا سکتا تھا ـــ؟ مگر بالکل اس طرح، جیسے کالی رات میں اچانک بجلی چمک جائے ـ اسی انداز سے ضیا میری زندگی میں داخل ہو گیا ـــ

بھائی میاں مجھے سر پہ ڈھول دھپے جڑ جڑ کر چھری کانٹے سے کھانا سکھلانے لگے، اور اماں مجھے رہ رہ کر گھورنے لگیں کہ میں یہ رشتہ کھو نہ بیٹھوں ـ !!

اے موسیٰ کے گہرے پانیو ـ اے بے تاب لہرو ـ ذرا میرے دل میں آ کر جھانکو ـ اے موسیٰ تیری زندگی تو اسی حیدرآباد میں گذری ہے ـ یہاں کے چپّے چپّے سے تیری شناسائی ہوگی ـ یہاں کی زندگی کا ہر ہر راز تیرے سینے میں دفن ہوگا ـــ مجھے یہ تو بتا یہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ، بیٹیوں کے دلوں کا خون بھی کر دیں ـــ! دولت کے بل پر اپنی بوڑھی رگوں کے لئے تازہ خون خریدلیں ـــ کیا یہاں پیسہ ہی سب کچھ ہے ـــ کیا نیکی سچائی اور پیار کا کوئی مول نہیں ـ کوئی قیمت نہیں ـــ؟؟ میں ان اتھل پتھل لہروں سے جواب مانگتی ہوں، ـــ بولو ـــ بولو ـ ـــ مگر نہیں ـ مجھے آج کوئی سوال کرنا نہیں ہے ـــ مجھے تو آج صرف اپنی داستان سُنانی ہے یہ دُکھ، یہ کرب، یہ غم، میں اپنے سینے میں نہیں لے جانا چاہتی ـــ میں پھول کی طرح ہلکی ہو جانا چاہتی ہوں ـ

اس دن میں اور بھائی میاں ضیا صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے ـــ وہ خود کہیں باہر گئے ہوئے تھے ـ بارش زور شور سے ہو رہی تھی اور میں نے سردی سے بچنے کو اپنی ساڑی کا آنچل اپنے کانوں اور سر کے گرد لپیٹ لیا تھا ـــ بیٹھے بیٹھے بھائی میاں نے مجھے دیکھا اور یونہی ہنس کر کہا ـــ

"مہر — خدا کی قسم تو خطرناک حد تک حسین ہے — کوئی حیرت کی بات نہیں جو ضیا صاحب نے تجھے مانگ لیا — مجھے تو فرشتوں کے بارے میں بھی شک کرنا پڑے گا —!"

میں نے ذرا جھینپ کر سر جھکا لیا — مگر دوسرے ہی لمحے مجھے پھر سے سر اُٹھانا پڑا — کیونکہ دھڑ سے دروازہ کھُلا اور .....

ہم دونوں گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے — وہ ضیا صاحب نہیں تھے، کوئی اور تھا — آنے والے کی نگاہیں جیسے مجھ پر جم کر رہ گئیں — اور خود میں بھی گھبرا کر بھائی میاں کو دیکھتی تھی کبھی آنے والے کو —

"آپ کی تعریف — ؟" آخر آنے والے نے بھائی میاں سے مخاطب ہو کر زبان کھولی —

"جی میں جمیل ہوں — ضیا صاحب میرے بوس ہیں — اور یہ ..... یہ میری بہن مہر —"

"سچ مچ مہر —" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا — اور پھر بولا — "اور میں ضیا کا والد ہوں نواب آصف الدّولہ — نام تو سنا ہو گا میرا — ؟" وہ مسکرا کر میری طرف گھوما — "حیدر آباد میں جتنی کوٹھیاں میری ہیں، اتنی شائد ہی کسی نے بنوائی ہوں — اور پھر کوٹھیوں کی کیا بات ہے — بزنس وغیرہ بھی چلتے ہی رہتے ہیں — اور ضیا میاں کو جو کام میں نے سونپا ہے وہ بھی بس...

وہ خود ہی مسکرا کر رُک گیا — مگر ہم دونوں میں سے کوئی نہ مسکرا سکا — پہلی ملاقات میں — آتے ہی ایسی بے سر پیر کی ہانکنا — کچھ عجیب سا لگ رہا تھا — یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ سچ بھی ہو سکتا ہے — اتنے عجیب انداز میں تو کوئی اپنے متعلق نہیں بتاتا — اور حد یہ کہ کسی نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا تھا — پھر وہ کہے گیا —

"جب کبھی اپنے بیٹے سے ملنے آتا ہوں تو بس یونہی اُٹ جھٹ کر چلا آتا ہوں — نوکروں اور مصاحبوں کے جمگھٹے میں باہر نکلنا مجھے مطلق پسند نہیں — کار بھی خود ڈرائیو کرتا آیا ہوں — پورے ساٹھ ہزار کی ہے —"

یقیناً یہ شخص پاگل ہے — میں نے دل ہی دل میں سوچا — مگر اسے دیکھ کر میں اس

قدر سہم گئی تھی کہ کچھ نہ کہہ سکی ـــ!

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ـــ؟ ذرا دل لگا کر سنو خدا کی بنائی یہ دُنیا کیسی ہے یہاں بسنے والے کیسے ہیں ـــ تو تم جاننا چاہو گے نا کہ پھر آخر ہوا کیا ـــ! سنو اس بڈھے نے مجھے بھائی میاں سے مانگ لیا ـــ!

ترل ـــ ترل ـــ ترل ـ یہ تمہارے سینے میں بے چینی کیسی؟ شاید تمہیں حیرت ہو رہی ہے ـــ مگر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے میرے شفیق اور مہربان دوست ـــ یہ تو دُنیا ہے. یہاں تو ایسا ہوتا ہی ہے ـــ اور جب بھائی میاں نے انکار کیا تو وہ سانپ پھن پھنا اُٹھا ـ اس کے حرم میں شائد مجھ ایسی بے بس رُوح کی ہی کمی تھی ـ جو مجھ پر ہر ہر حربہ آزمانے پر تُل گیا تھا ـــ اور پھر انسان نے انسان کے ساتھ شیطان کی سی چال چلی ـ

روپیہ ـــ روپیہ ـــ روپیہ ـ اس دنیا میں روپیہ کیا نہیں کر سکتا ـ ؟؟ ـ کیا نہیں کر سکتا ـــ محبت کی بولی لگوا سکتا ہے ـــ پیار کا نیلام کروا سکتا ہے ـــ بہن کی محبت بکوا سکتا ہے ـــ تم جانو دس ہزار روپے معمولی چیز تو نہیں ہوتے ـــ بھائی میاں نے مجھے بہکانا شروع کیا ـ "مہرو ـــ تو یہ سوچ زندگی بھر روپوں پر چلے گی ـــ ضیا جو اتنا امیر ہے تو نواب صاحب کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا ـــ نواب صاحب آسمان ہیں وہ پاتال ہے ـــ تو تو ملکہ بن کر راج رچے گی ـ ہاں دیکھ انکار نہ کرنا ـــ"

میں کبھی غصے کو چھپا کر ان کی طرف دیکھتی تو وہ میری سرخ رنگت کو شرم پر محمول کرتے ـــ کیسی بے بسی تھی ـ ؟ ذرا سوچو نا ـــ

میں یہاں بھائی میاں کو الزام نہیں دوں گی ـ کیوں دُوں؟ زندگی سے خوشیاں سمیٹنے کا حق ہر انسان کو ملنا چاہیئے ـــ نہیں ملتا تو پھر وہ ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے بھائی میاں نے اب تک کیسی زندگی گزاری تھی ـ ؟ ضیا نے صرف مجھے مانگا تھا ـــ میرے دکھوں کو سمیٹ کر اپنے دل میں چھپانا چاہا تھا ـ بھائی میاں کے سُکھوں کے لئے اس نے کیا قیمت ادا کی ـــ یہ کچھ بھی تو نہیں ـــ اگر انہیں یہاں کوئی فائدہ نظر آیا ـــ تو کیا بُرا کیا ـ جو اُنھوں نے میری زندگی کی

بولی اُٹھا دی ۔ ؟؟ یہ دنیا ہے میرے بوڑھے دوست ـــ یہاں ایسا ہی ہونا چاہیئے ۔

بھائی میاں کے جسم پر اب بہترین کپڑے تھے ۔ رہنے کو خوبصورت سا گھر ، ـــ اور ، زندگی کی ہر آسائش مہیا تھی ۔ ایک دن نواب صاحب نے ہمیں خاص الخاص اپنے دولت کدے پر بلوایا تھا ۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر جب ہم آگے بڑھے تو ایک لمحے کو میں چکرا گئی ـــ کیا اس قید خانے (وہ خوبصورت ہی سہی) میں مجھے رہنا ہوگا ۔ ؟؟ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا ۔ میرے خدا ، یہاں لوگ کیسے رہ سکتے ہوں گے ـــ ؟ اتنی اونچی اور ہیبت ناک دیواریں ۔ ! کس میں بوتا تھا کہ ان کو پھلانگنے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ۔ نرم اور گہرے صوفے میں ایک بیگم بیٹھی ہوئی تھیں ۔ بڑی رعونت سے دیکھتے ہوئے ـــ بھائی میاں نے آگے بڑھ کر تعارف کروایا ۔

" ان سے ملو مہر ۔ یہ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں ـــ اور یہ میری بہن ہے مہر ۔"

میرا خون جوش کھا گیا ـــ یہ میرا سگا بھائی تھا ۔ میرا ماں جایا ۔ جو نواب کی بیگم سے میرا تعارف کروا رہا تھا ۔ میں نے بھوں بھوں کر کے اس کی طرف دیکھا ۔ مجھے اس کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آئے ۔ میں نے خود کو مطمئن کر لیا ۔ ہاں ، ہاں ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہی تو ہے ـــ ایسا ہی ہونا چاہیئے ـــ اس کے آگے انسان سوچ بھی کیا سکتا ہے ۔ ؟؟

(تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ـــ ؟)

پتہ نہیں کن کن موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ـــ پھر پردہ اُٹھا اور ایک بانکی طرحدار لڑکی کمرے میں داخل ہوئی ـــ پتہ چلا وہ نواب صاحب کی بیٹی تھی ، (جو عمر میں مجھ سے بھی بڑی تھی) اس نے لڑکوں کی طرح پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی سر کے بال پوڈل کٹ کی شکل میں تھے ۔ وہ مزے میں سگرٹ پھونکے جا رہی تھی ۔ اور دھوئیں کے مارے میرا دم گھٹ رہا تھا ۔ یوں تو ہم عورتوں کی زندگی دھوئیں میں ہی گزرتی ہے ـــ مگر تم جانو یہ دھواں تو دم گھونٹ دینے کو تُلا ہوا تھا ۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور وہ لڑکی اچھلی ـــ اپنے ہونٹوں کا سگرٹ نکال کر اس نے جھٹ اپنی ماں کے مُنہ میں دیدیا ـــ

"ممّا — تم ذرا اسے اسموک کرو — میں ابھی آتا ہوں —" ممّا خوشی خوشی سے اسموک کرنے لگیں —

میں نے لرز کر دیکھا — یہ کیسی تہذیب تھی ؟ — کیا میں اس ماحول میں جی سکتی تھی —؟
میرا سانس رُک رُک کر چلنے لگا — بھائی میاں لہک لہک کر ہنس ہنس کر سبھوں سے باتیں کئے جا رہے تھے — میں وہاں تھی مگر نہیں تھی — مجھے ہوش آیا تو وہ لڑکی ممّا لڑکی کہہ رہی تھی —
"ملو بیٹا ایسا اسٹیچو ہم لوگاں میوزیم میں دیکھے تھے نا —" ان کا اشارہ میری طرف تھا!
بھائی میاں نے اپنی بہن کے حسن کی تعریف کو بڑی خوش دلی اور فخر سے سُنا اور سینہ تان کر مجھے دیکھنے لگے . جیسے "اس مال کا حق دار تو میں ہی ہوں —"

جب ہم باہر نکلے تو میرے قدم اس قدر وزنی ہو رہے تھے کہ مجھ سے چلتے نہ بن رہا تھا۔ دل و دماغ میں اس قدر کشمکش ہو رہی تھی — کیا کروں کیا نہ کروں — یکایک مجھے نواب صاحب کے مکروہ چہرے اور بڑے بڑے دانتوں کا خیال آگیا — اور میں نے طے کر لیا کہ نہیں میں اپنے آپ کو کبھی نہیں بیچوں گی۔ کبھی نہیں — کبھی نہیں — اس میں کیا بُری ہے —؟
میں نے بڑی ہمت کر کے ، شرماتے ، شرماتے ، آہستگی سے بھائی میاں سے پُوچھا ۔
"نواب صاحب کو معلوم نہیں کہ میری شادی ضیا صاحب سے ہونے والی ہے ؟؟"
"معلوم کیسے نہیں ہے — میں نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا ۔ مگر ... وہ بات ادھوری چھوڑ یونہی رُک گئے ۔

میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا ، مگر اسی لمحہ مجھے کوٹ کی جیب سے نوٹ جھلکتے نظر آگئے — میں نے سوچا ٹھیک ہے — ٹھیک ہی تو ہے ۔ اس کے آگے انسان کچھ نہیں سوچ سکتا۔ عقل چوپٹ ہو جاتی ہے ۔
"تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا —؟"
گھر پہنچ کر بھائی میاں نے اماں سے میرے پیام کے بارے میں بات کی ، اماں بھی راضی جیسی تھیں — بیٹیاں تو اپنے گھر میں پھلتی پھولتی ہی بھلی لگتی ہیں ۔ اور ایسی بیٹیاں تو کبھی کبھار ہی جنم لیتی

ہیں جو ماں باپ کا گھر بھی بھرتی جائیں ـــ ورنہ بیٹیاں تو سدا گھر ہی خالی کرتی گئی ہیں ۔

اماں کسی کام سے اُٹھ کر گئیں ۔ تو میں نے اپنی ساری ہمت سمیٹی اور منہ سے آواز نکالی مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ وہ بات نہ تھی جو میں کہنے چلی تھی ۔ میں کچھ بھی بک گئی ۔ پھر سے میں نے ہمت جمع کی اور سوچا ـــ یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال ہے ـــ خاموشی سے کچھ نہ بنے گا ـــ مجھے کہہ دینا ہی چاہیئے ـــ اور میں نے پھر سے خود کو راضی کیا ۔

" بھائی میاں ـــ " میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی ـــ ان سے نظر ملانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی ۔

میں نے پھر تھوک نگلا اور بولی ـــ " بھائی میاں ـــ "

پھر کچھ اسطرح جیسے لبلبی دبا دینے پر پیٹ سے گولی نکل پڑے ، میں بول گئی ـــ " میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ـــ "

میرے دل پر سے جیسے پہاڑ ہٹ گیا ـــ بھائی میاں خلاف توقع یونہی بیٹھے رہے شائد وہ مجھے سوجھ بوجھ کی مہلت دے رہے تھے ۔ بڑی دیر بعد بولے ۔

" مہر تم ابھی بچی ہو ـــ "

میں نے تیزی سے کہا ـــ " بچی ہوتی تو یوں میرا سودا نہ ہوتا ـــ "

اب کے انھوں نے چونک کر دیکھا اور خود بھی تیزی سے بولے ۔

" بہت سمجھدار ہوگئی ہو ـــ ! "

" جب بڑے ناسمجھ ہو جائیں تو چھوٹے خود بخود سمجھدار ہو جاتے ہیں ۔ " میں نے جل کر کہا

" بک بک مت کرو ـــ " وہ گرجے ـــ

میں نے ان کی طرف دیکھا

" بک بک تو آپ کر رہے ہیں ـــ میں تو ہمیشہ سے ہی خاموش طبیعت ہوں "

وہ تیزی سے اُٹھے ، مگر جانے کیا سوچ کر رک گئے ـــ بولے

" خیر آج نہیں ، تو کل تم جانے والی ٹھہری ، اس لئے خاموش ہوا جاتا ہوں ، ورنہ ابھی اس بک بک

کا مطلب سمجھا دینا۔"

میں نے اسی لہجے میں مضبوطی سے کہا ـــ میں نے کہہ دیا میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ـــ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ انسان شیر کے ساتھ اس کے بھٹ میں جا رہے۔"

بھائی میرے قریب آئے اور خونخوار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے ـــ

"نہیں کرے گی نواب صاحب سے شادی ـــ ؟ اور جو تیرے باپ کا گھر بھر دیا ہے نواب صاحب نے ـــ ؟ یہ عیش و آسائش اور کہاں مل سکتی ہے نا سمجھ کتیا ـــ بھول گئی کیا دو دن کے فاقے کرتی تھی، اندھیرے میں سوتی تھی۔ ننگی پھرتی تھی ـــ اب رہنے کو گھر مل گیا ـــ پہننے کو ریشم مل گیا ـــ اور پیٹ میں تر مال پہنچ گیا ہے تو اینٹھتی ہے حرام زادی ـــ"

تم سُن رہے ہو نا ـــ ؟ یہ میرا بھائی تھا۔ سگا بھائی ـــ جو مجھ سے یہ سب کچھ کہہ رہا تھا ـــ میں نے تلملا کر کہا ـــ

"مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیئے ـــ مجھے اپنی وہی زندگی پسند ہے ـــ"

"ہے نا فقیرنی ـــ اپنی اصلیت پر ہی جانے والی ـــ مگر اب میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔"

میں اسی تیزی سے نہیں نہیں کہے گئی ـــ اور بھائی میاں نے پیر سے جوتا نکال لیا۔ ان کا دم الٹ گیا۔ میرا جسم نیلا پڑ گیا ـــ اور میں بے سدھ ہو کر فرش پر گر پڑی۔

"دیکھتا ہوں کیسے نہیں کرتی ـــ" جاتے جاتے وہ پھر سنا گئے۔

پھر دھیرے دھیرے رات گزرنے لگی، ـــ میرے نصیبوں کی طرح سیاہ رات، آنسوؤں کے ستارے لئے دبے پاؤں، میرے قریب سے گزرنے لگی ـــ چوٹوں سے میرا جسم درد کر رہا تھا۔ زخم رس رہے تھے۔ اور چکر کے مارے سر نہ اُٹھتا تھا۔

"بھاگ چل ـــ خدا کی اتنی بڑی دنیا میں تیرا کوئی تو ٹھکانا ہوگا ـــ یہی وقت ہے ـــ دیر نہ کر ـــ"

میں نے یہ پکار سنی ـــ اور سر اُٹھا کر ادھر ادھر دیکھا ـــ زیرو پاور کا بلب بڑی اداس روشنی بکھیر رہا تھا ـــ اماں کا کمرہ پرلے سرے پر تھا، بھائی میاں کے کمرے سے خراٹوں کی آواز

آرہی تھی ۔ اور . . . . . . اور . . . .

میں نے دھیرے دھیرے خود کو سہارا دیا ــــ اور کسی صورت کھڑی ہو گئی ۔ جسم ٹوٹا جا رہا تھا ــ آنسو بہے جا رہے تھے اور سارا عالم ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا ــ پھر میں نے دھیرے دھیرے اپنے جسم کو پیروں کے سہارے آگے بڑھانا شروع کیا ــ الوداع میری پیاری ماں ــ الوداع میں نے کمرے کی طرف دیکھا، جہاں میری ماں سوئی ہوئی تھی ۔ اپنے دل میں کئی ادھوری حسرتیں لئے ــ بیٹے کے بیاہ کی ــ بیٹی کی وداعی کی ، ۔ پوتے کھلانے کی ، نوا سے جھلانے کی ــ آج یہ سب حسرتیں ہمیشگی کی نیند سو رہی ہیں ، میری ماں الوداع ۔

بھائی میاں کے کمرے کی طرف منہ کر کے میں کتنی ہی دیر یونہی کھڑی رہی ــ اے مالک تو نے عورت کے سینے میں اتنا درد کیوں بھر دیا ــ ؟ جو اسے دکھ دیتا ہے ۔ اُسے ہی پیار کرتی ہے ــ جو اُس سے نفرت کرتا ہے ۔ اُسی سے محبت کرتی ہے ــ تو نے عورت کا دل ، بہن کا دل اتنا دردمند کیوں بنایا ۔ ؟ ؟ الوداع میرے بھیّا ــ الوداع ۔ زخموں کے نشان جب تک میرے جسم پر رہیں گے ، پھول بن بن کر مہکیں گے ، اور تمہاری یاد دلائیں گے ــ آج تمہارا پیار دولت کے انبار تلے دب گیا ہے ۔ مگر کبھی تو تمہیں اس دل کی یاد آئے گی ۔ جس کی ایک ایک ادا پر تم دل سے ہنستے تھے ، خوش ہوتے تھے ، پیار کرتے تھے ۔ مسکراتے تھے ــ الوداع

دروازے سے سر لگا کر میں کتنی ہی دیر کھڑی رہی ــ رات آہستہ آہستہ یوں جا رہی تھی جیسے کوئی دلہن میکے سے پہلی بار سسرال کو چلے ۔ ! قدموں میں وہی بوجھل پن ــ دل میں وہی غم ــ آنکھوں میں وہی ستارے ــ آج دو دلہنیں اپنے اپنے میکوں سے ٹوٹ رہی تھیں ۔ اے رات تیرا پیا تو افق کے اس پار تیرا منتظر ہے ــ تیرا پیا تو سورج کا تلک لئے تیری راہ تک رہا ہے ــ دیکھتے ہی دیکھتے تو محبت کی دہلیز پر قدم دھرے گی ، اور تیری زندگی میں صبح کا نور بھر جائے گا ــ مگر میں ۔ ؟ میں کون سے پیا کی منتظر ہوں ۔؟ میری پیشانی پر کون سے سورج کا ٹیکا چمکے گا ۔ ؟؟ ۔ میں کون دلیش جا رہی ہوں ــ ؟ غم کی ڈولتی پرچھائیوں کے ساتھ ساتھ میرے دل میں پیار کی روشنی ، اُمیدوں کی کرنیں اور محبت

کے پھُول کیوں نہیں مہک رہے ہیں — ؟ میں کہاں جا رہی ہوں — کہاں —؟؟؟

میں نے ایکبار پیچھے پلٹ کر دیکھا اور پھر آگے بڑھتی چلی گئی — تو سُنا تم نے -؟ میں گھر سے نکل گئی — اور آج مجھے گھر سے نکلے پانچواں دن ہے — پانچواں — اور ان پانچ دنوں میں زندگی سے جی بھر گیا ہے — ان پانچ دنوں کی کہانی بھی تمہیں سُنا دوں — پھر میرا دل ہلکا ہو جائے گا — پھر مجھے یہ غم نہیں رہے گا کہ دنیا میں کسی نے میری داستان غم نہ سُنی کہ ایک لمحے کو ہی سہی، جی ہلکا تو ہو جاتا —! تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا -؟

میں گھر سے نکل تو گئی مگر معلوم نہ تھا کہ کہاں جاؤں گی، کدھر جاؤں گی — ایک نئی جوان اور خوبصورت عورت کے لئے دنیا میں جگہ ہو بھی کہاں سکتی ہے — ؟ میں صبح تک چلتی رہی — جب سورج نے ہر طرف روشنی بکھیرنی شروع کی، میں ایک نل کے پاس کھڑی تھی — میں نے چلوؤں میں پانی لے لے کر اپنا چہرہ دھویا اور جب گرد آلود بال جھٹکانے لگی - تو نل کے پاس کھڑی عورتیں مجھ سے پُوچھنے لگیں -

" کیا تم عورت ہو — ؟"

میں ہنسنے لگی — عورت ہوں اسی لئے تو یہ دکھ اُٹھانے پڑ رہے ہیں — میں نے دل میں سوچا —

میری ہنسی پر وہ اور حیرت زدہ ہوئیں - اور آپس میں بولنے لگیں - " صبح آوارہ روحیں بھٹکا کرتی ہیں - یہ تو کوئی ہم تم جیسی عورت نہیں معلوم پڑتی جی -" اور وہ اپنے اپنے مٹکے گھڑے اُٹھائے گھروں کو بھاگنے لگیں - مجھے پھر ہنسی آ گئی — آج سارا زمانہ مجھ سے دور بھاگ رہا ہے - میرے دل نے درد کے ساتھ سوچا — میں نے آواز دی — میں روح نہیں ہوں ایک دکھیا عورت ہوں — میری بات تو سُن لو - میرے دل کا درد تو دیکھ لو — " مگر وہ پیچھے نہ پلٹیں — میں ہی آگے بڑھ گئی — !

میں ادھر اُدھر ٹھوکریں کھاتی بڑھتی رہی، چلتی رہی - ایک آدمی نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری - میں دُکھ سے مسکرا دی — عورت کے لئے کہیں جائے فرار نہیں — یہاں ہر آدمی

نواب ہے جو پیسے دے کر عورت کو خرید لینا چاہتا ہے ۔ میں اس کے قریب پہنچی اور کمزور آواز سے بولی ۔

"بھائی صاحب آپ .....

اس نے ذرا غور سے میری صورت دیکھی اور پھر لوکھلا کر پلٹ گیا ۔" ہونہہ ۔ بھائی صاحب ۔!

دنیا کس قدر گندی جگہ ہے ۔ دیکھا تم نے ۔ ؟ ایک مرد ایک عورت کو آنکھ مار کر اشارہ کر سکتا ہے کہ چل میرے ساتھ ۔ لیکن عورت اگر اسے بھائی کا سا پوتر رشتہ لگا کر سہارا مانگتی ہے تو وہ ہونہہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے ۔

میں نے پھر اپنے بے جان قدم بڑھائے ۔ اتنے دنوں گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہی ، چلو آج موقع ہاتھ آیا ہے تو دنیا اور دُنیا والوں کی ایک نظر دیکھ تو لوں اور میں پھر چلنے لگی ، ۔ صبح سے دوپہر ہوئی ، دوپہر سے شام ، اور شام کے بعد رات آئی اور پھر سے میرے زخم جاگنے لگے ، ۔ یہ زندگی کی پہلی رات تھی کہ میں اپنے گھر سے ، اپنی ماں سے ، اپنے بھائی سے دُور رہ کر سو رہی تھی ۔ مگر کہاں ۔ ؟؟ چلتے چلتے میں قبرستان تک آنکلی تھی ۔ میں نے سوچا ہم جیسوں کا سب سے اچھا گھر تو یہیں بن سکتا ہے ۔ مگر میں نے کہا نا کہ غریبوں کے لئے جینے کی تو کوئی راہ ہے ہی نہیں ، مگر مرنے کی بھی راہ نہیں ۔ زندگی اپنے بس کی نہیں ۔ موت بھی بس کی نہیں ۔ چھوٹی بڑی قبروں کے بیچ میں وہیں لیٹ گئی ۔ اور کوئی موقع ہوتا تو شائد میں ڈر سے لرز لرز جاتی ۔ مگر آج کی بات اور تھی ۔ پے در پے صدموں اور تنہائیوں نے جیسے ڈر کا احساس ہی چھین لیا تھا ، اور میں یوں مزے سے قبر کے پہلو بہ پہلو لیٹی تھی جیسے سہاگ رات منا رہی ہوں ۔

پھر صبح ہو گئی ۔ مگر میری زندگی کی صبح کہاں تھی ۔ ؟ اور کون جانے میرے نصیبوں میں کتنی راتوں کی سیاہی لکھی ہوئی تھی ۔ ؟؟ بھوک سے میری چال ڈگمگا رہی تھی ۔ آنکھوں میں سیاہ دھبے ناچ رہے تھے ۔ اور چکر کے مارے قدم اُٹھانا محال تھا

مگر میں چلی جا رہی تھی ــــ ایک جگہ جاکر میں ٹھٹھک گئی ــــ بہت سارے مرد بچے، اور چند عورتیں کسی کو گھیرے میں لئے کھڑی تھیں ۔ میں نے جگہ بنا کر جھانک کر دیکھا ۔ گھنگھروں کی تال پر کوئی الھڑ سی عورت چھم چھم ناچ رہی تھی اور کوئی کوئی دل والا آنے دو آنے بھی پھینک دیتا تھا ــــ !

"ہاں زندگی کا ایک روپ یہ بھی ہے ۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا، اور پھر بہکے بہکے قدم اُٹھانے لگی ــــ بڑی دیر چلتے رہنے کے بعد آخر میں ایک نیم کے نیچے بیٹھ گئی۔

" ناچنا شروع کردوں ــــ ؟" میں نے بہت صلاحیت کے ساتھ سوچا ۔ پھر خیال آیا عورت ہوکر زندہ رہنا ہی مصیبت ہے ــــ دل والے مجھے کب زندہ چھوڑیں گے ۔ ؟ اس عورت کی بات اور تھی، اس کے ساتھ اس کا ایک رکھوالا بھی تو تھا ــــ عورت کے لئے رکھوالے کا وجود بھی کس قدر ضروری ہے ــــ ؟ بغیر سہارے کے تو یہاں پتہ بھی نہیں ہل سکتا ۔

اُف ــــ میں کس قدر نیچ ہوگئی ہوں ــــ ! سڑکوں پر ناچنا ــــ؟! بھلا کس نے ایسی ذلیل بات سوچی بھی ہوگی ــــ ؟ اُف یہ پیٹ !!

بھوک کا شدید احساس پھر سے جاگنے لگا ۔ اور میں للچائی نگاہوں سے اس فقیر کو دیکھنے لگی جو ابھی ابھی پتے کے دونے میں سالن لئے چپڑ چپڑ روٹی سے کھا رہا تھا ــــ میں نے بہت دیر تک اُسے دیکھا ــــ مگر اس نے میرا کوئی نوٹس نہ لیا ــــ شاید وہ صورت سے مجھے کوئی بہت امیر کبیر لڑکی سمجھ رہا ہوگا ۔ بڑی دیر بعد میں نے کچھ اس انداز میں، جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں کہنا شروع کیا ــــ (مگر دراصل میں اس فقیر سے مخاطب تھی ۔)

"میں بڑی دُکھیا ہوں .....

اُس نے ایک لمحے کو حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر دوسرے ہی لمحے ٹانگیں جھاڑتا ہوا یہ کہہ کر چل دیا ۔" اونہہ یہاں سبھی دُکھی ہیں ــــ کون کس کا دُکھڑا سنتا پھرے ۔"

میں اس جگہ گئی جہاں وہ بیٹھا تھا ــــ روٹی کے چند ٹکڑے ادھر اُدھر گر گئے تھے ــــ میں نے جلدی جلدی ہاتھ مار کر سمیٹے اور ندیدوں کی طرح منہ میں بھرنے لگی ــــ

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ---؟؟ ہاں یہ میں تھی ہیں --- جو ایک فقیر کے آگے کے ٹکڑے چُن چُن کر کھا رہی تھی --- مگر مجھے اب حیرت نہیں ہوتی کیونکہ اس دنیا میں رہ کر یہی تو جانا ہے کہ انسان کو ذلیل کرنے والا یہ پیٹ ہی تو ہوتا ہے --- خالی پیٹ! اور یہ نہ بھولو کہ اس لمحہ میرا پیٹ بھی خالی تھا۔

یہ دوسرا دن تھا جو میں گھر سے الگ تھی --- چند ٹکڑے کھا کر میری آگ اور بھڑک گئی - پتہ نہیں کیا جی چاہ رہا تھا - کسے پھاڑ ڈالوں - میں دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھتی بڑھی - ایک جگہ کچرے کے ڈبے کے پاس کیلے کے چھلکے پڑے ہوئے تھے - میں نے بغیر کسی تکلف یا شرم کے وہ چھلکے اُٹھائے اور جلدی جلدی منہ چلانے لگی --- اب میں پھر اسی نیم تلے آبیٹھی تھی - اور راہگیر مجھے آتے جاتے بڑی شوق بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے --- ایک موٹے سے سیٹھ نے مجھے حد درجہ مکروہ انداز میں آنکھ مار کر دیکھا --- میں نے متزلزل ہو کر اُسے دیکھا --- پارسائی اور بے حیائی میں بڑی کشمکش ہو رہی تھی --- کوئی اِدھر کھینچ لیتا کوئی اُدھر --- میں بیچ میں ادھ مری سی بیٹھی تھی -

چھی چھی چھی --- یہ میں کیا سوچنے لگی ، --- کیا میں اتنی نیچ تھی --- ؟؟ کیا زندہ رہنا ایسا ہی ضرور رہے --- ؟؟ کیا پیٹ کے لئے انسان اتنا بھی نیچ ہو جایا کرتا ہے --- پھر کیا یہ تم سوچ رہی ہو تم --- تم اپنی خاندانی روایات بھول گئیں --- دِلّی کی تمہاری شاندار حویلی - تمہارے گھرانے کی وہ عزت --- تمہاری وہ لوگوں کے لئے قابلِ تقلید زندگی ، --- اب تم اپنا جسم بیچو گی --- ؟؟ ہر رات ایک نئی سیج سجا کر ، نئے نئے مردوں کے ساتھ سویا کرو گی؟

--- میں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں بھر لیں -

" نہیں نہیں میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا بھی نہیں --- میں سوچ بھی نہیں سکتی - بند کرو یہ بکواس --- "

اور پھر سب کچھ جیسے ساکت ہو گیا - بیٹھے بیٹھے ہی جانے کتنے جگ بیت چلے - مگر وہ تصوّر کی دنیا تھی --- حقیقت تو یہ تھی کہ صرف سہ پہر کا وقت بیت رہا تھا۔

اور دھوپیں تیز تھی ہو رہی تھیں ۔۔۔ میں بلا کسی ارادے اور مقصد کے یونہی بے دلی سے اٹھی، اور چلنے لگی، ۔۔۔ رکی تو میں ایک ہاسپٹل کے سامنے تھی ۔۔۔ مریضوں کے رشتے دار آ جا رہے تھے اور کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ دو گھڑی کو رک کر میرا حال بھی پوچھ لیتا۔ اب دل برداشت کی حد سے اس طرح باہر ہو رہا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر ساری دنیا کو سنا دوں، ۔۔۔ دیکھو میرے دل کے گھاؤ دیکھو ۔۔۔ میں وہ بدنصیب لڑکی ہوں جسے اس کے سگے بھائی نے بیچ دیا ۔۔۔ دیکھو روپے کی طاقت کیسی ہوتی ہے کہ ماں جایا، ایک بہن کے جسم سے خون کے فوارے اڑا دیتا ہے اور یہ پیٹ کی آگ ......

مگر کوئی نہ تھا ۔۔۔ کوئی نہ تھا ۔۔۔ چپراسی نے مجھے وہاں رکا دیکھ کر پوچھا ۔

"اے لڑکی ۔۔۔ تم وہاں کیوں کھڑی ہو ۔۔۔"

میں نے خوشی خوشی زبان کھولی ۔۔۔ "بابا ۔ میرا اس دنیا میں اب ......

"یہاں ہم لوگوں کے دکھڑے سننے نہیں کھڑے جی ۔۔۔ ہسپتال میں جانا ہے تو جاؤ، ورنہ راستہ چھوڑ دو۔ موٹریں آ رہی ہیں ۔"

تو یہاں کوئی بھی نہیں جو کسی بے کس کی ہائے ہی سن لے ۔۔۔ یہ کیسی دنیا ہے مولی تیری ۔۔۔ یہ کیسی زندگی ہے خداوندا ۔۔۔ ؟؟ میں وہیں پرے ہٹ کر ایک کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی ۔

میری زندگی میں آوارگی کا کوئی گزر نہ تھا ۔۔۔ ورنہ ممکن تھا کہ میں بھی اپنے لئے کوئی راستہ ڈھونڈ ہی لیتی ۔۔۔ مگر میں نے تم سے بتایا نا کہ میں ایک شریف اور اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی ۔ بدچلنی کا میرے پاس ایک سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ۔۔۔ اپنا جسم بیچ کر اپنے دوزخ کی آگ بجھانا ۔۔۔ اس فلسفے کو ماننے کی میرے دل میں تاب نہیں ۔

میں پھر چلنے لگی ۔۔۔ چلتے چلتے میں شہر کے پر رونق بازار میں آ گئی ۔۔۔ ہر طرف رنگ و بو کا سیلاب تھا۔ موٹریں اڑ رہی تھیں ۔ عورتیں زرق برق کپڑے پہنے اتراتی پھر رہی تھیں آدمیوں کا ہجوم تھا کہ بس چلا جا رہا تھا ۔۔۔ ایک دریا کی مانند رواں دواں ۔۔۔ میرے دیکھتے

ہی دیکھتے دوچار موٹریں رُکیں ۔ اسی طرح کھمبوں کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی عورتوں کو اشارے سے پاس بلایا گیا اور موٹر زوں زوں ، یہ جا وہ جا ۔۔۔

" بیٹھ جاؤں میں بھی کسی موٹر میں ۔۔۔ ؟" میں نے دل سے سرگوشی کی ۔۔۔ ؟ چھی چھی چھی ۔ ایسا سوچنا بھی پاپ ہے ۔۔ یہاں تو میں بس اس لئے کھڑی ہوں کہ زندگی کا تماشہ دیکھوں۔

میں جانے کب تک تماشہ دیکھتی رہتی کہ اکدم کسی نے میرا کندھا تھپ تھپا کر کہا ۔" کیا آپ چند لمحے میرے ساتھ گذار سکتی ہیں ۔۔ ؟"

میں نے لرز کر دیکھا ۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا ۔۔۔ نیلے سرج کے سوٹ میں ملبوس ۔ سر کے بالوں میں اِکا دکا سفید بال بھی چمک رہا تھا ۔۔۔ اونچا قد اور چہرے پر عجب بے کسی چھائی ہوئی ۔۔۔ میں نے پھر اسے غور سے دیکھا۔ اس کے تیور آوارہ گردوں کے سے نہ تھے ۔۔۔ وہ خود بھی مصیبت کا مارا دکھائی دے رہا تھا ۔

"میں آپ ہی سے مخاطب ہوں ۔" وہ بڑی شائستگی سے بولا ۔" کیا آپ چند لمحوں کے لئے چل کر اس ہوٹل میں میرے ساتھ بیٹھ سکیں گی ۔۔ ؟"

میں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا اور جدھر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا ، ادھر چلنے لگی ۔۔

ہم دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے ۔ اور اس نے آگے بڑھ کر میرے لئے کرسی کھینچی اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا ۔

زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی ہوٹل میں آئی تھی ۔ میں حیران حیران نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی ۔۔۔ چھت پر بجلی کے پنکھے چل رہے تھے ۔۔ سارے میں کپوں اور برتنوں کی کھڑ کھڑ ہو رہی تھی ۔ سگرٹ اور سگار کے دھوئیں ۔ بگو نے کھا رہے تھے اور ٹھنڈی روشنیوں میں یہ سب کچھ عجیب خواب کی سی بات لگ رہی تھی ۔ ہمارے اطراف چند مرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے ۔ جیسے ہی انھوں نے مجھے دیکھا مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ۔

شاید میرے کپڑوں کی ہنسی اُڑا رہے ہوں ! ۔۔ میں نے دل میں سوچا اور بوکھلا کر

نگاہیں جھکا لیں ۔

اس شخص نے بوائے کو جلانے کیا کیا الا بلا لانے کا حکم دے دیا تھا اور اب میز لدی ہوئی تھی اور میری آنکھوں میں جیسے ستارے ناچ رہے تھے ۔ اس نے محض تکلفاً "لیجئے نا" کہا اور میں جیسے پل پڑی ۔

وہ دھیمے سُروں میں گویا ہوا ۔

"آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ۔ ؟"

اس کے اس جملے پر مجھے اپنے سارے دُکھ یاد آ گئے ۔ میرا تیزی سے کام کرتا ہاتھ رُک گیا اور میں بے بسی سے بولی ۔

" میں بہت بدنصیب لڑکی ہوں ، ۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں کن مصیبتوں میں گھری ہوی ہوں ....

اس نے میری بات یونہی کاٹ دی ۔ " آپ اپنے دُکھ ایک لمحے کو اپنے ہی دل میں محفوظ رکھیئے پہلے میری بات سُنیئے ۔

مگر میں اس کی بات نہیں سُن رہی تھی ۔ کوئی بھی ایسا دل والا نہیں ملتا جو کسی غم نصیب کے دُکھ کو اپنے سینے میں منتقل کر لے ۔ وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا ۔

" آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ۔ ؟؟ آپ جیسی عورتوں کو رات گزارنے کو تو بہت سے مرد لے جاتے ہوں گے مگر .... مگر اس کے بعد میں نے کچھ نہ سُنا ۔ آپ جیسی عورتیں ۔ آپ جیسی عورتیں ۔ آپ جیسی عورتیں ۔ ...

ہوٹل میں جیسے طوفان آ گیا تھا ۔ بادلوں کی گرج اور جہازوں کی کھڑکھڑاہٹ سے بھی بڑھ کر کوئی گونج گرج تھی ۔ جو مجھے ہلا رہی تھی بِکھرا رہی تھی ۔

آپ جیسی عورتیں

آپ جیسی عورتیں

۔ میں نے کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے اور تیزی سے اُٹھ بھاگی ۔ بھاگتے میں میز پر سے

دو تین طشتریاں اور کپ لڑھک گئے اور برتنوں کے شور اور قہقہوں کی گونج میں، میں بھاگتی ہی چلی گئی ___ باہر آکر میں نے لمبی سانس لی۔

یہ میری پارسائی کا انعام تھا ___ یہ میری ریاضت اور پاکیزگی کا صلہ تھا۔ یہ دُنیا جہاں دلوں کا درد کوئی نہیں دیکھتا ___ تسلّی کے دو بول کوئی نہیں کہتا مگر جہاں الزام خوب تراشے جاتے ہیں ___ عزتیں لوٹی جاتی ہیں ___ کہاں جاؤں ___ ؟ ___ کہاں جاؤں ___

میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا، ___ آسمان روشن تھا۔ پاس پاس ستاروں کے گچھے چمک رہے تھے ___ اور ان سبھوں کے بیچ میں چاند تھا جو تیرتا چلا جا رہا تھا ___ اپنی منزل کی طرف ___

"مجھے بھی روشنی دے دے ___ مجھے بھی اُجالے دے دے ___" میں دُکھے دل کو تھام کر بے بسی سے بولی ___ میں بھی اپنی منزل کو جانا چاہتی ہوں ___ مجھے روشنی چاہیئے۔ مجھے زندگی چاہیئے ___

اور میں وہیں گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھ گئی ___ اور پھر میں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے میں زمین پر گری جا رہی ہوں ___ میرے کانوں میں شور کی آوازیں اور راہگیروں کے قہقہے ہلکے اور ہلکے ___ اور ہلکے ہوئے جا رہے تھے۔ میرے سامنے ہسپتال کی بلند و بالا دیواریں تھیں اور ___ پھر کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا ___

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک بستر پر پایا ___ میں ہسپتال کے بستر پر پڑی ہوئی تھی ___ سفید سفید لباس پہنے ٹک ٹک کرتی نرسیں۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر آ جا رہی تھیں اسٹیتھسکوپ گلے میں ڈالے، ڈاکٹر، مریضوں پر مہربان نظریں ڈالتے ہوئے آ جا رہے تھے۔ ایک نرس قریب سے گزری تو میں نے پوچھا۔

"مجھے یہاں کس نے لا کر ڈال دیا ہے ___ ؟"

نرس رُک کر بولی ___ "ہمارے کو نئیں مالوم ___ مریضوں کو اُدھر سے اڈمٹ کرتے ___ کوئی تمہارے بھائی بندھی لا کر ڈالے ہوں گے ___"

"میرا بھائی بند ——— ! ہونہہ ! ایک زہرخند مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی۔

دو دن میں نے ہاسپٹل میں کاٹے۔ نرسیں مشین کی طرح مصروف رہتیں۔ ڈاکٹر ٹائم سے آتے اور جلدی جلدی چلے جاتے ۔ بازو کے بیڈ والے پیشنٹ کو اپنی ہائے ہائے سے فرصت نہ تھی، پورا وارڈ ہی آہوں اور کراہوں کا مسکن تھا۔ کون کس کا دُکھ سننے چلا تھا

ایک دن میں نے ڈاکٹر کے کوٹ کا دامن تھام ہی لیا ۔" ڈاکٹر صاحب ۔ میرے دل میں ہر دم اک آگ سی لگی رہتی ہے ——— ! اس آگ کو بجھانے کی کوئی صورت بھی ہے۔؟"

ڈاکٹر صاحب نے نرس کو آواز دی ۔" سسٹر ۔ ٹمپریچر لو ——— دماغ پر گرمی کا اثر معلوم ہوتا ہے ۔ بڑبڑا رہی ہے ۔ " میں نے تکیے پر سر پٹخ دیا ۔ " میں پاگل نہیں ہوں ——— میرے دماغ پر گرمی نہیں ہے ۔ میں سب کچھ سوچ سمجھ سکتی ہوں ۔ سب جانتی ہوں، بوجھتی ہوں مگر میں کہتی ہوں کوئی مجھ سے کبھی ہمدردی بھی جتائیگا ——— یا میں یونہی مرجاؤں گی ۔؟"

نرس نے آکر لال شال سر سے پیر تک اُوڑھا دی ۔

" اتنا پکار مت کرو بی بی ۔ دوسرے پیشنٹ جاگ جائیں گے ۔" اور وہ میرے منہ میں تھرمامیٹر کی نلکی دے کر چلی گئی ۔

میں نے تھرمامیٹر منہ سے نکال کر رکھ دیا اور جب نرس آئی تو اس سے بڑی لجاجت سے بولی ——" مجھے کھانا چاہیئے ۔ بھوک لگ رہی ہے ۔"

" اتنے بخار میں کھانا نہیں دیا کرتے ——— چین سے سو جاؤ ——— اُٹھ کے بعد دودھ پی لینا موسمبی یہ رکھی ہے ۔ " اور وہ پیر پٹختی چلی گئی ۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ۔ ڈاکٹروں کی راؤنڈ کا ٹائم ختم ہو چکا تھا ۔ نرسیں اپنے اپنے کاموں میں تھیں ——— مریض بستروں پر پڑے پڑے ہائے وائے کر رہے تھے ۔ پورے وارڈ میں عجیب سناٹا پھیلا ہوا تھا ۔ کیسی غیر دلچسپ زندگی ہے خدایا ۔ دو ایک دن میں ڈسچارج ہو جاؤں گی ——— پھر وہی زندگی اور زندگی کے ستم ! یہ دو دن کا آرام بھی کون بھلا لگ رہا ہے مجھے ۔ ؟ میں نے پڑے پڑے موسمبی کھائی اور دھیرے دھیرے اپنے

جسم کو اُٹھ بیٹھنے پر آمادہ کیا ۔ بڑے سے وارڈ بوائے سے ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی میں باہر نکل آئی ، دروازے پر چپراسی نے پوچھا ۔

" کہاں جا رہی ہو ۔ "

" گھر ۔ " میں ایک ہی لفظ بول سکی ۔ اور اس ایک لفظ نے پھر میرے دل میں غم ہی غم بھر دیا ۔

وہ غیر یقینی انداز میں بولا ۔ " مگر ٹکٹ کہاں ہے ۔ ؟ "

میں چڑ کر بولی ۔ " تو کیا میں یونہی بھاگی جا رہی ہوں ۔ ؟ "

میرے لہجے سے وہ ذرا سہم گیا ۔ اور بازو ہٹ گیا ۔ میں دھیرے دھیرے ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکل گئی ۔

اور آج پانچواں دن ہے کہ میں گھر سے باہر ہوں ۔ اس گھر سے بھی جہاں میں اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ رہتی تھی ۔ اور اس گھر سے بھی جہاں تصور ہی میں سہی مگر میں اپنے شوہر اور چھ بچوں کے ساتھ سکون سے رہتی تھی ۔ گھر ! جس کی لال اینٹوں کی دیواریں تھیں اور جس کے پھاٹک پر بوگین ویلیا کے قرمزی رنگ کے پھول ، ہرے ہرے پتوں میں چھپے مسکراتے جھومتے تھے ۔

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ۔ ؟؟

وہی حیدرآباد کی سڑکیں تھیں ۔ وہی راہگیر ۔ وہی چہل پہل ۔ اور وہی میں ، جس کا دل قبرستان تھا ۔ جہاں کئی آرزوئیں پہلو بہ پہلو سو رہی تھیں ۔ جنھیں خدا کا ہاتھ بھی زندہ نہیں کر سکتا تھا ۔ ! میں بھوک سے نڈھال تھی ۔ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا ۔ میری ساڑھی دھول اور گرد سے اَٹ گئی تھی ۔ میرا دل دُکھی تھا ، جسم بے جان ، اور میرے آس پاس مکروہ چہرے تھے اور بھوکی نگاہیں ۔ دل جیسے بار بار سمجھاتا تھا ۔

ایک ہی راستہ ہے ۔ ایک ہی راستہ ہے ۔ چل پڑو ۔ چل پڑو ۔ پھر نہ دُکھ ہوں گے نہ غم ۔ بس خوشیاں ہی خوشیاں ۔ ہاں ایک ہی راستہ ہے ...

کیا اس راستے کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہے ۔ ؟؟ کیا دنیا میں ایک بے سہارا عورت کے لئے سوائے چھلکے کے اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ۔ ؟ کیا سارے راستے اسی منزل پر آکر ختم ہوتے ہیں ۔ ؟؟ ۔ اور یوں ہی قدم اُٹھاتے اُٹھاتے میں تم تک آپہنچی ۔ اور جیسے میرے دل میں ایک ساتھ کئی چراغ جل اُٹھے ۔

" ارے ۔ ! مجھے پتہ ہی نہ تھا ۔ تم سے بڑھ کر اور کون منزل ہو سکتی ہے؟ تم نے کتنوں کو سہارا دیا ہے ۔ ؟ کتنوں کے غموں کی پردہ پوشی کی ہے کتنی آنکھوں کی فریادیں سُنی ہیں ۔ کتنے دکھوں کو اپنے دل میں جگہ دی ہے ۔ میں ۔ میں بھی تو اسی درد کی ماری ہوئی ہوں ۔ مجھے بھی تو یہاں پناہ مل سکتی ہے نا ۔ اے دریائے موسیٰ ۔ اے مہربان !

میں نے اپنے گرد آلود پاؤں پانی میں ڈال دیئے ۔ اور تم سے باتیں کرنے لگی ۔ انسانوں کے دلوں سے اچھا تو تمہارا دل ہے ۔ تم میری پکار اور غم زدہ آواز سن کر بھاگے نہیں ۔ ورنہ یہاں کون کسی کا دکھ سمیٹتا ہے ۔ تم اسی متانت اور سکون سے بہہ رہے ہو ۔ تمہارے دل میں ساروں کے غم سمیٹ کر بھر لینے کی وسعت ہے ۔ اوروں کی طرح تم نے بے زار ہو کر منہ نہیں پھیرا ۔ ہاتھ نہیں جھٹکا ۔ طعنے نہیں دیئے اور غور سے میری باتیں سنتے رہے ۔

کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں ، ۔ ہاں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں بس خواب میں ہی تو نظر آتی ہیں ۔ رسنی بستی زندگیاں اور کیسے اُجڑا کرتی ہیں ۔ ؟ ؟ ۔ تمہارا یہ سکون تمہاری یہ خاموشی ۔ کیا سچ تم نے میری باتیں غور سے سُنی ہیں ۔ ۔ ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ مجھ ایسی لڑکی کے لئے آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اور کون راستہ تھا ۔ ؟؟ اور کون منزل ہو سکتی تھی ۔ ؟ ؟ ۔ میں نے تو بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اُٹھایا ہے ۔ اور اب میں کس قدر خوش ہوں ۔ ۔ میں اب دھیرے دھیرے پانی میں اُتر رہی ہوں ۔ ٹھنڈا پانی میرے جسم کو چھُو رہا ہے ۔ اور میں زندگی سے قریب اور قریب ۔ اور قریب ہوتی جا رہی ہوں ۔

دھنک کے رنگ نہیں

اور پھر پھول اتنا رویا — اتنا رویا کہ اس کا کلیجہ پھٹ گیا۔

گھاس سر اُٹھا کر بولی — "ارے بھائی تم روتے کیوں ہو؟
ابھی ابھی تو تمہارے منہ پر ہنسی آئی تھی کہ تم رونے بھی لگے؟"

پھول نے مرتے مرتے جواب دیا — میں روتا ہوں اس لئے
کہ دوسرے ہنس سکیں —" اور پھول مرگیا۔

دوسرے دن ٹہنی پر گلابی کلیاں جھوم جھوم کر ہنس رہی تھیں۔
گھاس نے شرمندہ ہوکر سر جھکا لیا۔ میں کتنی نادان ہوں!
اتنی سی بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔"

ہم سب گھاس کی طرح نادان ہیں

(ایک جاپانی گیت)

رفیق میاں کندھے پر اچکن لٹکا کر باہر نکلنے تو پیچھے سے حوری لپکی ہوئی آئی اور پردے کو اپنے جسم کے آس پاس لپیٹ کر، سر نکال کر بولی۔

"اجی ماموں جان پاندان میں ڈلی نہیں ہے۔"

رفیق میاں پلٹے۔ "نہیں ہے تو نہ ہے کون پان کھانے کا اتنا شوقین ہے؟"

وہ پھر سے بولی۔ "امی جان کہتی ہیں : واپسی میں ضرور لایئے گا۔ ہاں۔ اور وہ پانوں نچانے لگی۔

"یہ تو بھئی خواہ مخواہ کے خرچے ہیں، بی بنّو۔ بھلا......"

ابھی اُن کی بات ان کے منہ ہی میں تھی کہ اچانک ان کی نگاہیں حوری کے تھرکتے پیروں سے جا ٹکرائیں۔ "ارے......"؟

اچانک ان کے منہ سے نکلا۔ اُن کی نگاہیں حوری کے پیروں سے چپک کر رہ گئیں۔

"ارے یہ گلابی گرگابیاں ــــ؟" حوری نے اترا اترا کر پیر نچانے شروع کر دیئے۔ مخمل کی نازک نازک گلابی کامدار گرگابیاں۔ جیسے دو مہکے مہکے گلاب، حوری کے پیروں میں کھل اُٹھے تھے۔ ان کا دل دھڑ، دھڑ، دھڑکا اور پھر وہ دل مزے سے حلق میں آ کر جھولنے لگا ــ

"اماں تو بوڑھی ٹھہریں۔ وہ بھلا ایسی گرگابیاں پہننے لگیں ــ؟؟ آپا بھی بے چاری بیوہ۔ سفید ساڑی کے سوا کبھی انھوں نے دوسرے رنگ کی ساڑی تک نہ پہنی، تو ایسی چمکتی دمکتی گرگابیاں وہ کہاں پہننے چلیں ــ؟ وہ زہرہ دلہن۔ انھیں تو میں جانتا ہوں۔ ان کے پاس بھی ایسی گرگابیاں نہیں۔.. ــ پھر... پھر.... اتو میاں؟.. اتو میاں ٹھہرے مرد۔ وہ آخر ایسی رنگین، بھڑکیلی گرگابیاں کیسے پہن سکتے ہیں ..... اور بچے تو بچے ہی ٹھہرے... پھر؟؟ ہو سکتا ہے آپا بی کے جہیز کی رکھی رکھائی ہوں اور حوری نے مارے اتراہٹ کے پہن لی ہوں ــ مگر آپا بی کا سارا جہیز تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔ اور جو کبھی جہیز کی ہوتیں تو بھی اتنے دنوں تک ان کی چمک دمک ماند نہ پڑ جاتی ــ؟ ہو سکتا ہے کہ حوری نے ہی خریدی ہوں۔ اچھا اگر حوری نے ہی خریدی ہیں تو یہ اس کے پیروں سے اتنی بڑی کیوں ہیں کہ ایڑیاں تو اندر رہ گئی ہیں اور جوتی پیچھے سے

باہر نکل گئی ہے۔"

انھوں نے حیرت سے پھر حوری کے پیروں کو دیکھا۔ گرگابیاں تو اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتیں۔ ان کے زبان نہیں ہوتی۔ پھر یہ کیسی گرگابیاں تھیں بھئی جو باقاعدہ پٹ پٹ باتیں کر رہی تھیں، چہک رہی تھیں اور رفیق میاں کو باقاعدہ مجبور کر رہی تھیں کہ وہ بھی چہکیں اور ان کے ساتھ باتیں کریں۔

بھلا آدم کے سنسان ویران، جنت کے باغ میں یہ کون سی حوّا آگئی ہے کہ سارے میں گلاب مہکنے لگے ہیں ۔۔ وہ جھلّا کر بولے ۔" ارے یہ کس کی گرگابیاں چڑھا رکھی ہیں؟ خراب ہو جائیں گی تو ۔۔ ؟"

حوری نے پرے میں پاؤں چھپانے کی کوشش کی۔ پھر کھلکھلا کر بولی ۔" ارے واہ خراب کاہے سے ہونے لگیں ۔۔"

" اور جو تو مسلسل ناچے جا رہی ہے تو ایسی نازک گرگابیاں کھٹیں گی تھوڑے ہی ۔۔"

حوری کس قدر منہ پھٹ تھی ۔" شکو باجی کا درد آپ کو کیوں ہو رہا ہے۔ بھئی واہ، جس کی چپلی وہ تو کچھ نہ کہے۔ تیسرا ہی دل اٹکاتا پھرے ۔"

شکو باجی ۔۔ ؟ وہ گڑبڑائے۔ یہ شکو باجی کون ۔ ذرا حیرت۔ ذرا نرمی۔ ذرا گھبراہٹ " یہ شکو باجی کون بھئی ؟" بالآخر وہ کھل کر پوچھ بیٹھے۔

" وہی جو اندر بیٹھی ہیں ۔ وہ دھانی رنگ کی ساڑی پہنے ۔" وہ ایک دم پردہ چھوڑ کر باہر لپک آئی ۔" قسم خدا کی ماموں جان ۔۔ ان کا سارا بکس لال نیلے پیلے کپڑوں سے بھرا پڑا ہے اتنے پیارے پیارے رنگ کہ پوچھئے مت ۔ اور ایک چھوٹا بکسا ہے، جس میں ڈھیروں چوڑیاں ایک اور بکسا ہے جس میں ان گنت چپلیاں، ڈھیروں جوتیاں رنگ برنگی کہ نظر نہ ٹھہرے ۔ ایک اور بکس ہے جس میں ...."

" اونہوں ہوں ۔۔ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ تجھ سے اتنی ساری تفصیل کس نے پوچھی تھی۔ اور یوں اُچک اُچک کر باتیں نہ بنا۔ کہیں آڑھا ترچھا پاؤں پڑ گیا تو گرگابی بےچاری ٹوٹ جائے گی۔

اتنی نازک جو ہے۔

"توکیا غضب ہو جائے گا خداوندا۔ ڈھیروں تو جوتیاں ہیں۔ کچھ قحط تو نہ پڑ جائے گا۔"

"مگر دوسرے کی چیز لینا کچھ اچھا لگتا ہے۔" وہ اُسے ذرا سی غیرت دلانے پر تلے ہوئے تھے۔

"یہ دوسرا کیا ہوتا ہے جی میاں ___ میری پھوپھی ہی تو ہے اور بھلا پھوپھی کہیں غیر ہوتی ہے جی ماموں جان ___؟"

رفیق میاں نے حیرت سے دیدے کھول کر پوچھا۔

"تیری پھوپھی ۔ تیری پھوپھی یعنی کہ اپنی آپا بی کی نند"

"ظاہر ہے ___" وہ انتہائی لاپروائی سے بولی۔

"مگر میں نے تو آج تک نہیں دیکھا بھائی

حوری تنک کر بولی: "تو اس کا مطلب یہ کہاں نکلتا ہے کہ آپ نے نہیں دیکھا تو وہ میری پھوپھی نہیں ہوئیں۔"

"تو بڑی چرب زبان ہے لڑکی ___ یہ نہیں سوچتی کہ میں تیرا بڑا ماموں ہوں اور تو ایسی زبان چلاتی ہے۔"

"واہ بھئی واہ ___ میں نے ایسی کون سی بُری بات کہی ۔ اپنا دل صاف نہیں اسی لئے جناب نے لتاڑ بتائی۔ میں نے تو ذرا ہی زبان ہلائی تو مجھ پر الزام۔"

رفیق میاں کو پہلی بات یاد آگئی ___ تو آپ اسی لئے ڈلی منگوانے پر اصرار کر رہی تھیں کہ گھر میں مہمان آگئے ہیں۔"

"ظاہر ہے ___" وہی عجب بےزاری بھرا

"حوری ..... اے حوری ___ اری حور......" اندر سے آپابی کی آواز آئی۔ اور حوری پردے کو جھلاتی سپڑ سپڑ اندر کو بھاگ گئی۔

نرم نرم گلابی گلابی گرگابیاں اس کے پیروں تلے کس بری طرح رگڑے کھا رہی تھیں۔ رفیق میاں جھلا گئے "اری کمبخت ...."

کوئی آدھ پون گھنٹے بعد رفیق میاں باہر سے واپس آئے تو اپنے کمرے میں پہنچ گئے مگر ہمیشہ کی طرح انھوں نے پلنگ پر پڑ کر تھکی ہاری سانس نہیں لی۔ بلکہ اچکن کو ٹانک کر وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگے ۔ پیروں کی چاپ سن کر حوری پھر جان کھانے کو آموجود ہوئی تھی ۔ آتے ہی تنک کر بولی ۔"ڈلی آئی یا نہیں ؟"

رفیق میاں نے خوشی خوشی اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔

"آج بہت اِترا رہی ہے ری ۔ اور جو دو چانٹے جڑ ہی دوں تو ۔"

حوری شرارت اور گستاخی سے بولی "اور میرے پیر تو غالباً جناب نے دیکھے ہی نہیں ۔"

اُچھا ۔!! وہ بناوٹی غصے سے بولے ۔" تو مطلب یہ ہے کہ آپ ان چپلیوں سے ہماری خبر لیں گی نا ؟

حوری کھی کھی کر کے ہنسنے لگی ۔" اچھا لائیے چھالیہ تو دے دیجیے ۔" وہ ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو گئی ۔

"تو چل ۔ میں خود ہی لئے آتا ہوں ۔" اور وہ پلنگ کے نیچے جوتے ٹٹولنے لگے ۔ آگے آگے حوری تھی اور گلابی مخملیں گرگابیوں کی ہلکی ہلکی دپ ۔ دپ اور پیچھے پیچھے رفیق میاں تھے اور تازہ تازہ گلابوں کی مہک ۔ حوری پردہ اٹھا کر اندر کہیں غائب ہو گئی تھی ۔ سامنے باورچی خانے سے دھواں اٹھ رہا تھا ۔ اماں ہانڈی بھون رہی تھیں ۔ رفیق میاں آگے بڑھ گئے ۔

پرلے دالان میں انو میاں کی بیوی بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں وہ مایوسی سے اور آگے بڑھ گئے ۔ سامنے والے کمرے میں حوری کی اسلم سے چھین جھپٹ جاری ہو چکی تھی ۔ شائد گڑیا کی چوٹی کھینچے جانے کا سا کوئی سنگین معاملہ پیش تھا ۔ انھوں نے زور سے چھالیہ کی پڑیا تخت پر پٹخ دی اور اماں سے بولے

" یہ چھالیہ کی پڑیا یہاں رکھ رہا ہوں ۔ پاندان جانے کدھر پڑا ہے ۔ ورنہ میں خود ہی کلیا میں ڈال دیتا ۔"

کونے والے کمرے میں جہاں سنبریہ دہ جھول رہا تھا، ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور ایک دم رفیق میاں

چکرا کر رہ گئے

دھنک کے رنگ ــــــــــــ

قوسِ قزح کی رنگینیاں ــــــــــــ

دھیرے سے پاندان تخت پر رکھ کر وہ بولی ــــــــ

"امی پان کھا رہی تھیں - معاف کیجیے آپ کو تکلیف ہوئی - "

نہ پھول مہکے نہ کلیاں چٹکیں، نہ ہوائیں چلیں، نہ بادل جھومے۔ بس آپ ہی آپ بہار سی چھا گئی، جیسے سارے ہی دھنک کے رنگ ہی رنگ بکھر گئے - رنگ جو بہاروں اور خوشیوں سے عبارت تھے۔

ہرا آنچل پاندان کے کونے سے اٹک گیا۔ تو وہ ذرا کی ذرا رُکی، مڑی اور ہلکی سی "اونہہ" کے ساتھ آنچل چھڑا کر اندر چلی گئی۔ اور تو کچھ نہیں لیکن اس کی مخمل والی گلابی گلابی ایڑیاں وہیں رہ گئیں جو اتنی تازہ، اتنی نازک تھیں۔ جیسے گلاب کی کچی کلیاں!! قسم خدا کی' یہ پاؤں نہیں یہ گلاب ہیں" رفیق میاں نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ کہیں دل کی بات زبان نہ کہنے لگے اور جو زبان کہہ دے تو کان نہ سن لیں ــ تو یہ بات کھل جائے گی کہ دیکھو بھائی یہ رفیق میاں تو محبت کرنے لگے ہیں!"

اب جب کبھی اندر سے پانوں کی گلوریاں باہر بھجوائی جاتیں تو رفیق میاں کو اُن پانوں سے صفا گلابوں کی خوشبو آتی - اور وہ حُوری سے پوچھتے ـ" ہاں حُوری یہ پان کس نے بنائے ہیں؟

"شکو باجی نے ـ "

"کس نے ـ ؟" وہ جان کر دوبارہ پوچھتے۔

حُوری چڑ جاتی ـ" شکو باجی نے ـ شکو باجی نے ـ شکو باجی نے - اب سن لیا یا نہیں - ؟"

"ارے یہ تمہاری شکو باجی بڑھیا کی طرح دن رات پان ہی چباتی رہتی ہیں کیا ـ ؟"

وہ شرارت سے پوچھتے۔

"ہش ـ" وہ ناک سکوڑ کر کہتی - انھیں پان کھانے کی کیا غرض پڑی ہے' ان کے ہونٹ

تو خود ایسے سرخ ہیں کہ بس ۔"

" ہم کو کیا پتہ ۔ لیکن یہ آپ کو شکو باجی سے کیا لینا ہے جی ۔ وہ بھلے سے پان کھائیں چھالیہ کھائیں آپ سے مطلب ــــ ؟"

رفیق میاں جھٹ سے بات کا رخ پھیر دیتے، جو حُوری سی طرار لڑکی بات چھوڑ دے تو سارے میں اودھم مچ جائے گی ۔ اور یہ گلوریاں تو دن بھر میں کم سے کم چار پانچ بار چلی آتی تھیں کمبخت ۔ ورنہ اماں جی کے ہاتھوں تو نہ کبھی پان ہی ملا نہ پان کی طلب کبھی محسوس ہوئی ۔ اب تو جب دیکھو تب رفیق میاں کی چونچ لال ہے ۔ اور وقت بے وقت حوری سے فرمائش کئے جا رہے ہیں

" اری حوری ذرا پان تو بنوا لائیو ۔"

" ابھی ابھی تو پان کھایا تھا ماموں جان آپ نے ۔ ہُوا کیا ہے آپ کو ۔؟"

وہ چونک جاتے ۔

" واقعی مجھے کیا ہوا ہے ؟ کیا ہو رہا ہے ؟

کوئی ہفتہ بھر بعد کی بات ہے رفیق میاں مردانے میں بیٹھے کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہے تھے کہ پردہ اٹھا کر اماں اندر آگئیں ۔

"کیا بات ہے اماں ؟" انھوں نے اپنا ہاتھ روک کر ماں سے پُوچھا

اماں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر دیوار کے کنارے لگ کر بیٹھ گئیں ۔ "تیری آپا بی کی نند اور ساس آئی ہوئی ہیں ۔" انھوں نے اپنے طور پر گویا بہت بڑی اور نئی خبر سنائی ۔

" انھیں تو آئے بھی غالباً چار چھ دن ہو گئے ہیں نا ۔"

وہ لاپرواہی سے بولے ۔ اماں چپ رہ گئیں ۔ بیٹے نے ماں کو چور نگاہوں سے دیکھا اور گلا صاف کر کے بولے ۔" آپ کچھ خاموش خاموش نظر آرہی ہیں اماں ۔ کیا بات ؟"

"نہیں تو ــــ" اماں نے خواہ مخواہ کی ہنسی چہرے پر لانی چاہی ۔ تجھے وہم ہو رہا ہے

"آپ کو قسم ہے اماں جو آپ نے مجھ سے کوئی بات چھپائی۔ ورنہ میں سمجھ لوں گا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

"اے واہ میاں — کیسی بات کرتا ہے۔ بھلا تجھ سے محبت نہ ہو گی تو پھر کس سے ہو گی۔ اللہ کے بعد تو ہی تو میرا پہلا اور آخری سہارا ہے۔" اماں کا جی کلپ اٹھا۔ آنکھیں بھیگ گئیں

"اور یوں بھرپور جوانی میں تجھ پر بڑھاپا آیا تو کس کے کارن"؟ انھوں نے رفیق میاں کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ جس میں اِکا دُکا سفید بال جھلک رہا تھا۔

"اونہہ —" رفیق میاں نے پیار سے اماں کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں نے ایسا کیا کر دیا ہے آپ کے لئے جو آپ بار بار یاد دلاتی رہتی ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے اماں کہ اللہ مجھے ہزار جنم دے اور میں ہر جنم آپ پر اور بھائی بہنوں پر یوں ہی وارتا جاؤں ....."

بس بس..... اماں نے منہ میں پلو ٹھونس لیا۔ اب ایسا نہ کہہ میرے بچے — تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔ میرا جی کیسے کیسے کڑھتا ہے کہ تو نے ہماری خاطر، میری خاطر، ان بچوں اور اس گھر کی خاطر کیسا سنجوگ لے لیا۔ آج کو تیرا بھی گھر ہوتا۔ تیری بھی دلہن ہوتی۔ تیرے بھی بال بچے۔ تیرے بھی جی کو ٹھنڈک پہنچتی مگر ....."

"اُف، اماں بی تو ہوا ہی کیا — آپ کیوں یوں دل کو جلا رہی ہیں — کیا مجھے کسی نے منع کیا تھا؟ ——— ؟ کیا کسی نے میرا ہاتھ روکا تھا — ؟

"وہی تو میں بھی کہتی ہوں —" وہ آنسو پونچھتی پونچھتی بولیں۔ "اگر آج کو تیرے سر اتنی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو کیا تو یوں ہی اکیلا پڑا رہتا — ؟ اب تو میرا جی رہ رہ کر یہ کہتا ہے کہ ....."

آنسوؤں ان کا گلا دبوچے لے رہے تھے۔

رفیق میاں نے ہنس کر بات کاٹی۔ — اوہو اماں ان سب باتوں کا بھلا یہ کون سا موقع ہے؟ اچھا بتلایئے۔" وہ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔ "آپ میرے پاس کس کام سے آئی تھیں —"

اماں نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کر کے کہا: "بیٹا مہمان گھر آئے ہوئے ہیں، گھی

ختم ہو چکا ہے ــــ پراٹھوں اور انڈوں کے لئے تو گھی ہونا ہی چاہیئے ..... ذرا سا تھا تو اتنے دن چل گیا۔ اب تو ڈول خالی پڑا ہے۔"

"کوئی بات نہیں میں منگوا دوں گا۔ اتنی اتنی سی باتوں کے لئے آپ یوں پریشان کیوں ہوتی ہیں اماں؟"

"اتنی سی بات ــ؟" اماں الجھ کر بولیں۔"کیا تیرے قدموں تلے گنگا بہہ رہی ہے جو اتنی سی بات ہے یہ ــ اور ماشاءاللہ سے کھانے کے لئے تو پورا گھر بھرا پڑا ہے۔ بھائی، بھاوج تین بچے ...."

"اماں ــ اماں۔" وہ ماں کے لہجے کو دھیما کروانے کے لئے خود بھی دبے دبے بولنے لگے۔ "آپ ذرا چپ رہا کیجیئے۔ انوّ کو بار بار اُلاہنے نہ دیا کیجیئے۔ بدک گیا تو گھر چھوڑ کر چلا جائیگا"

"جاتا ہے تو سو بار جائے۔ ہمارا کیا لے جائے گا۔؟"

"ہمارا چین، سکون لے جائے گا۔ رفیق میاں کھوئے کھوئے لہجے میں درد سے بولے۔ ــ"آپ بھول گئیں وہ ابّا میاں کا کتنا دلارا تھا اور ابّا میاں نے مرتے مرتے آپ سے کہا بھی تو تھا کہ بیگم انو اور کوئی نہیں، میرا ہی دوسرا روپ ہے۔ اور ابّا میاں نے مجھ سے بھی تو کہا تھا نا اماں کہ رفیق بیٹے میرے بعد اور کون ہوگا جو اس گھر کو دیکھے۔ تم سے مجھے بہت ساری امیدیں ہیں۔ میرے پیچھے تم سا بیٹا ہو تو قبر میں بھی چین ہی چین ہے ــ آپ انوّ کو دکھ دیں گی تو ابّا میاں کی روح کہاں چین پائے گی۔"

"تمہاری شہ پا کر ہی وہ اتنا غیر ذمّے دار اور لاپروا ہو گیا ہے، ورنہ کس نے دیکھا ہے کہ جوان جورو کا مرد اور اتنے سارے بچوّں کا باپ، یوں گھر، زندگی اور پیسے خرچے سے بیگانہ رہے کہ پھوٹی کوڑی دینے کا روادار نہیں رہے۔ اُلٹے دھونس جماتا پھرے۔"

"سنبھل جائے گا اماں ــ آخر عمر ہی کیا ہے۔"

"یہ لو اور سُنو ــ ڈھیر سے بچوّں کا باپ ہے اور کیا عمر ہونی چاہیئے ــــ"

"ایسا چھوٹا دل بھی نہیں کرنا چاہیئے اماں۔ اُوپر والا دیتا ہے، ہم کسی کو کھلانے کا دعویٰ کر سکتے

ہیں بھلا! سب اللہ کی دین ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا کہ اللہ کی دین ہے لیکن اللہ بھی کب تک دیگا۔ دے گا۔ دے گا. پھر ہاتھ سمیٹ لے گا۔"

"ارے واہ اماں یہ کیسے ممکن ہے بھلا۔ بھولے بھٹکے دو چار مقدمے تو مہینے بھر میں مل ہی جاتے ہیں۔"

"اور کھلانے والے جو گاڑی بھر ہیں ——؟" اماں تلخی سے بولیں —— رفیق میاں نے جان کر بات کا رخ موڑ دیا۔

"اچھا تو اماں میں صبح ہی باقر کو بھجوا کر گھی منگوا دوں گا۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہلوا دیجئے گا۔"

ماں کی آنسو بھری آنکھیں وہ بھول نہ سکے رہ رہ کر انھیں ان جھرّیوں بھرے چہرے کا خیال آتا رہا۔ جس پر آنسو آڑی ٹیڑھی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے بہے جا رہے تھے —— اور کیا اماں بی کا رونا غلط تھا۔ دکھوں سکھوں سے پالی گئی اولاد کا کون سکھ نہیں چاہتا۔ کس ماں کا دل گردہ ہے کہ جوان اولاد کو کنوارپن کی تنہائیاں بھوگتے دیکھے۔ نصیبوں کے ستم تو دیکھو کہ پھول کو بھی ہاتھ لگایا تو وہ کانٹا ہو گیا۔ ماں باپ کے گھر کوئی من تو برستا نہ تھا جیسا میکہ ویسی ہی سسرال ملی۔ مگر اللہ نے آل اولاد سے خوش رکھا۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے اب اور کیا چاہیئے تھا۔ روکھی سوکھی سے، ہنسی خوشی سے بسر ہوتی تھی۔ بیٹی عمر کے سترہویں، اٹھارہویں میں آئی تو ماں باپ نے اچھی جگہ دیکھ کر سر کا بوجھ اٹھا دیا۔ مگر قسمت کی ہیٹی تھی کہ بھری جوانی میں رنڈاپے نے آگھیرا۔ اوپر تلے چار بیٹے ہوئے۔ حوری باپ کی موت کے کوئی چھ سات ماہ بعد پیدا ہوئی۔

عورت کا سارا دم خم مرد کے دم سے ہوتا ہے۔ مرد ہی چھوڑ جائے تو کون اس کو پوچھے —— کون اس کی عزت کرے۔ باپ اور بھائی نہیں چاہتے تھے کہ غریبی سے سہی، مگر نازوں لاڈوں کی پالی کو سسرال میں یونہی چھوڑ دیں۔

سسرال والے بھلے سے لاکھ نانا کرتے رہے مگر انھوں نے بیٹی کو گھر بلا ہی لیا۔ یہ پھر بھی اپنا ہی گھر تھا۔ بُرے بھلے کی کیا بات تھی۔ جو یہ کھاتے وہی کچھ وہ بھی کھاتی۔ جو یہ پہنتے وہی کچھ وہ بھی پہنتی — یہ تو نہ تھا کہ عمر بھر سسرالیوں کی جھیڑ جھبیڑ پیڑ پیڑ سُنا کرتی — چار دن تو ہر کوئی اوپر اوپر کرتا ہے اور پھر بات بات میں گو سے نکال کر موت میں ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے سے میکہ کیا برا ہوتا ہے جانے کون سا اُلو گھر پکار گیا تھا کہ ایک سے ایک مصیبت ٹوٹتی گئی — دن نہ گذرے تھے کہ باپ بھی چلتے ہوئے — دو دو بیوائیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے۔ جو کچھ بڑاپن تھا وہ رفیق میاں ہی میں تھا۔ پڑھائی جاری تھی مگر اب ساری ذمہ داری انھیں کے سر آپڑی — ماں نے پھر بھی اپنے اتنے حواس نہ کھوئے کہ بیٹے کی پڑھائی ہی ختم کروا دیتیں۔ پاس کا زیور، برتن بھانڈے کام آتے رہے۔ رفیق میاں کو وکالت کی ڈگری مل گئی۔ یہ تو ہوا کہ منہ بھگونے کو کوئی آسرا تو ہوا، ورنہ چھوٹے انو میاں تو بچپن ہی سے ماں باپ کے لاڈلے تھے۔ اب ان سے کیا آس تھی۔ ان کی اور رفیق میاں کی عمروں میں فرق بھی تھا۔ باپ بیٹے جیسا نہ سہی، مگر گنے جاتے یہ باپ ہی سے۔ وہ بھلا دینے کیا اور یہ لیتے کیا؟ بلکہ خود ہی چار آٹھ آنے کے لئے بھائی اور ماں کے آگے ہاتھ پھیلایا کرتے۔ ایسے میں وہ کسی کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں کیا رکھ سکتے تھے۔ دسویں کے بعد تو ان کی پڑھائی کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ بھائی نے لاکھ چاہا کہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جائے مگر شائد ان کے مقدر ہی میں کسی کے زخموں پر مرہم رکھنا نہ لکھا تھا تو وہ کرتے بھی تو کیا کرتے؟

یونہی برس گذر گئے — زندگی اس قدر سپاٹ تھی کہ کوئی اونچ نہ نیچ۔ اس قدر ویران تھی کہ رنگ نہ بو۔ آخر ماؤں کے جی میں بھی ارمان ہوتے ہیں۔ اماں بی ایسی کون سی انوکھی تھیں اور بڑے بیٹے کی موجودگی میں آخر کو بول ہی اٹھیں۔

" اللہ نے جیسی بھی گذار دی، گذار دی — اس کا شکوہ کس سے کیا کریں۔ ہم سے بھی گئے گذرے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں۔ مگر میاں اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ میرے بھی آنگن

میں بہو پازیب جھنکاتی پھرتی ۔ اس سے پہلے بھی اماں نے ہزار بار کہا ہوگا ۔ مگر بیٹے ٹال ٹال گئے جس پر اتنی ذمہ داریاں ہوں، وہ کیا گھر بسائے گا ۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر آپ دیر کیوں کر رہی ہیں، سوچ کیا رہی ہیں ۔ آخر کر کیوں نہیں ڈالتیں ایک ہنگامہ ۔ لے آیئے دلہن بھی ۔"

اماں کی آنکھیں چمک اٹھیں ۔" کلموہنے ۔ اتنے دنوں سے پھر منہ کیوں بسیئے بیٹھا تھا ۔ آج کو چار چار پوتے گھر بھر میں اُدھم مچاتے لوٹتے پھرتے ۔"

"پوتوں کا گیا ہے ۔ آج بہو لے آیئے، چند ہی سالوں میں پوتے پوتیوں سے آنگن بھر جائیگا ۔" وہ ہنسے ۔" مگر آپ نے کوئی ڈھنگ کی لڑکی بھی دیکھی ہے ۔"

"تُو تو کان ہی نہیں دیتا تھا ۔ لڑکی دیکھ کر میں کرتی بھی کیا ۔ اب تو نے حامی بھر لی ہے، تو سمجھ میں نے لڑکی بھی دیکھ لی ۔" وہ خوشی خوشی بولیں ۔

رفیق میاں کچھ سمجھ کر مسکرائے ۔" مگر اماں میں تو انور میاں کی شادی کے بارے میں کہہ رہا ہوں ۔"

"کیا کہا ۔" اماں ان کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولیں ۔"انو کی شادی ہوگی اور تو یوں ہی سانڈ بنا گھومتا رہے گا ۔"

"اماں ۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سنجیدگی سے بولے ۔" میرے حالات ایسے نہیں ہیں اماں کہ میں شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکوں ۔"

"اوئی میں بھی تو سنوں کہ وہ کون سے حالات ہیں جو تیری شادی میں پتھر روڑے اٹکا رہے ہیں ۔ ؟"

"اماں میری حالت اس ستون کی سی ہے جو ساری چھت کو سنبھالے رہتا ہے ۔ ستون ذرا بھی اپنی جگہ سے ہلا کہ ساری عمارت نیچے ۔ میں ایسی ناسمجھی کی حرکت کبھی نہیں کر سکتا ۔"

"عقل والے ستون کو ہلنے بھی نہیں دیتے ۔ قدم جمائے کھڑے رہتے ہیں ۔ تجھے خود پر بھروسہ نہیں ۔"

"ہاں اماں ۔ مجھے کھلے لفظوں میں اقرار کرنے دیجیے کہ خود مجھے ہی اپنی ذات پر بھروسہ نہیں ۔ مجھے اتنے سارے مرحلے طے کرنے ہیں اگر کوئی ایسی ویسی جورو مل گئی جس نے گھر والوں میں پھوٹ ڈلوادی تو میں آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا ۔ یہ سارے لوگ کدھر بھٹکیں گے ۔"

"اے چل میاں ۔ عورت پاؤں کی جوتی ہوتی ہے اس سے اتنا بھی کیا ڈرنا ۔"

"نہیں اماں ۔ آپ عورت ہو کر عورت ذات کی بے حرمتی نہ کیجیے ۔ عورت تو سر کا تاج ہوتی ہے ، وہ ہر روپ میں قابل عقیدت ہوتی ہے ۔ میں خود کو بہت کمزور پاتا ہوں ، مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ سر کے تاج کو ٹھوکر لگا سکوں ۔"

"تو کیا تو اب شادی کرے گا ہی نہیں ۔؟"

وہ ہنسنے لگے ۔ تو اماں کہنے لگیں "۔ تیری باتوں سے تو یہی لگتا ہے مجھے ۔"

"جی نہیں اماں ، اس کا یہ مطلب تو نہیں نکلتا ۔ میں شادی کروں گا ضرور ۔ مگر ابھی نہیں ۔ کچھ دن ٹھہر کر ، جب حالات ذرا سدھر جائیں گے ۔ دیکھئے نا اماں آپا جی کے بچے ہیں ۔ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں ۔ اتنے ساروں کی لکھائی پڑھائی ، پرورش ، تعلیم ، تربیت پہننا اوڑھنا ، پھر اُنو ہے ۔ اس کی شادی بیاہ ۔ اس کے بچے ہوں گے ، پھر گھرداری ۔ کتنی ساری الجھنیں اور بکھیڑے ہیں اور ۔۔۔۔۔"

اماں بات کاٹ کر بولیں ۔ "ارے پگلے تجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اپنی الجھنوں اور بکھیڑوں کو بانٹنے والا بھی کوئی ہونا چاہیئے ۔ مرد تھکا ہارا ہو ، پریشان ہو ، غم نصیب ہو ، تو کوئی تو ہاتھ ایسا ہو جو ممتا کی سی محبت سے اس دکھی دل کو سنبھال لے ۔"

"آپ جو ہیں ۔"

"ماں ماں ہے بیٹا ۔ بیوی بیوی ہوتی ہے ۔"

"میں اس بات کو نہیں مانتا اماں ۔ عورت بہر حال عورت ہے ۔ جو ہر حال میں ہر روپ میں محبت ہی تو دیتی ہے ۔"

آدم اور حوا کا حوالہ دیتے ہوئے اماں صاف صاف بے تکے پن پر اُتر آئیں ۔

"وہ...... وہ اماں -" بیٹے گھبرا گئے۔ "بات ایسی ہے کہ شائد آپ بھی ٹھیک ہی کہتی ہوں لیکن اماں اصل بات یہ ہے کہ اُف .... آپ میرا مطلب تو سمجھتی نہیں ہیں میں نے کبھی آپ کا حکم ماننے سے انکار کیا ہے ــ ؟ یہ تو مجبوری کی بات ہے اماں اور آپ خود جانتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ میں شادی کرلوں چار دن میں بال بچّہ ہوگا ـ اپنی بیوی اپنے بچوں اور اپنے گھر گرہستی میں گھِر کر بس یہی سوچا کروں گا ناکہ میں اپنوں کا منہ مار کر دوسروں کا منہ کیوں بھروں۔ کیوں ان کی حق تلفی کروں آخر اپنی زندگی بھی میرے سامنے ہے۔ دوسرے خود کمائیں خود کھائیں، میں کیوں ان کا ساتھ دوں۔ کیا میں اکیلا کمانے کے لئے رہ گیا ہوں ــ ؟ اَنو تو خیر مرد ہے کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ لیکن آپاجی کدھر ٹھوکریں کھاتی پھریں گی۔ پانچ بچوں کا ساتھ، چار دن میں لڑکی جوان ہوجائے گی۔ پھر کیا ہوگا یہ ظاہر ہے کہ ہانڈی ڈوئی آپس میں کھڑکھڑائیں گی ضرور ہی دو بہوئیں ہوں گی۔ دو بیٹے ـ دن گذریں گے تو دانتا کلکل شروع ہوجائے گی۔ ہمارا کیا ہے مگر کچلن میں کون آئے گا ــ ؟ آپاجی اور اماں بی ـ ! میرا تو کچھ نہیں جائے گا! اچھا بتائیے آپ نے میرے لئے کون سی لڑکی ڈھونڈی اور پسند کی ہے ـ میں کیوں یہ گناہ مول لوں کہ بڑھاپے میں ایسی محبت والی ماں کا دل دکھایا ــ ؟"

اماں نے غور سے بیٹے کی صورت دیکھی ـ کتنی سچی باتیں اس نے کہیں ـ وہی تو اس گھر کا کرتا دھرتا ہے۔ وہی منہ پھیرے تو کس پہ کیا گذرے، کون جانے ـ یہاں تو سارا ہی کچّا آدا تھا ـ اور پھر یہ تو دنیا میں ہوتی آئی ہے کہ شادی کے بعد مرد کا دل اس کے اپنے بس میں نہیں رہجاتا ایسی کٹھ پتلی بن جاتا ہے جس کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے کہ جیسا نچائے ویسا ہی ناچے ــ بیٹے نے ماں کو کچھ اسطرح قائل کیا کہ پھر آگے منہ ہلانے کی ہمت ہی نہیں پڑی ـ جی بہلانے کو آپا بی کے بچے تھے ـ بڑے بڑے بھی تھے تو کیا ہوا ؟ تھے تو بچے ہی ــ ہاں یہ ضرور تھا کہ گھر میں بیواؤں کا راج تھا ـ پائل کی چھنک اور چوڑیوں کی کھنک مدت ہوئی اس گھر سے رخصت ہو چکی تھی ـ اب انو میاں،

کی دلہن آجاتی تو یہ ویرانی بھی رخصت ہو جاتی — اپنے ہی قریبی عزیزوں میں بیٹی دیکھی اور انّومیاں کی شادی رچ گئی — دالان کے ساتھ والا کمرہ میاں بیوی کو دیا گیا۔ اب دُلہن جو چلتی تو پازیب چھن چھن اُٹھتی اور آنچل سنبھالتی تو چوڑیاں کھنکنے لگتیں۔ اور کبھی جو انّومیاں کو رات بے رات شرارت سوجھتی تو پھر پائل اور چوڑیاں دونوں مل کر چیخ پکار مچانا شروع کر دیتیں۔ گھر کی فضا اب ایسی تھی جیسے برسوں پڑت پڑی رہنے والی بنجر زمین میں کسی نے ہل چلا کر ہری بھری فصل اُگا دی ہو — پہلے تو یوں ہوتا تھا کہ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن اور اپنے اپنے بکھیڑوں میں اُلجھے رہتے، لیکن اب ان اداس چہروں پر ہنسی کی چھوٹیں بھی دکھائی دے جاتی تھیں، جو مدّت ہوئی مسکرانا تک بھول چکے تھے — رفیق میاں جب کبھی کوئی موٹی رقم ہاتھ لگتی، چھوٹی دُلہن کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لے ہی آتے۔ کبھی ساڑی۔ کبھی جھمکے کبھی چوڑیاں تو کبھی کنگن۔

دُلہن تو بچوں کے لئے عجوبہ ہوتی ہے۔ گھیرے میں لے کر بیٹھ جاتے اور چہلیں ہوتیں۔ اب کہیں اتنے دنوں بعد اس گھر میں قہقہے جاگے۔ شادی کے ٹھیک دسویں مہینے چھوٹی دلہن کے درد اُٹھا — رات مصیبتوں سے کٹی — ایک طرف انّو میاں اور دوسری طرف خود رفیق میاں دروازے کے باہر بیٹھے گھڑیاں گنتے تھے۔ امّاں بدحواس۔ نند پریشان پہلا پہل معاملہ اور چودہ گھنٹے گذرنے پر بھی مشکل آسان نہ ہوئی۔ رفیق میاں کا دل رہ رہ کر ڈُوبتا اُبھرتا — مصیبتوں نے ہمیشہ سے اس گھر کو تاکا تھا۔ خدا نہ کرے زہرہ دلہن کو کچھ ہو گیا تو — وہ جان جوان دلہن اپنی جان سے جائے گی۔ یہاں کیا ہے آٹھ چار دن میں اُنّو میاں کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے گا۔ پھر ڈُوبتے دل سے انّومیاں کو دیکھتے۔ آنکھوں میں نمی گھُلی پاتے تو خیال بدلنا پڑتا کہ گھر آباد ہو گا تب آباد ہو گا۔ یہاں تو ایسے دہشت کے مارے بیٹھے تھے کہ بُری بھلی خبر جو آجاتی تو وہیں بیٹھے بیٹھے دم چھوڑ دیتے۔

"ہمارے قہقہے نہ چھین لینا خداوندا —" انھوں نے کلپ کر دُعا مانگی — چیاں چیاں کی آواز آئی اور ادھر ان کا دل ان کے حلق میں آ بیٹھا۔ انّو میاں

چیاں چیاں سنتے ہی لپک پڑے اُدھر ماں بہن ہاں ہاں کرتی ہی رہیں۔
ارے میاں کیا کرتے ہو۔" مگر وہ اندر پہنچ بھی گئے اور ہاہا ہوہو کر کے گوشت کے گولے کو ہنسانے کا جتن بھی کرنے لگے۔
الّو میاں باپ بن گئے۔

رفیق میاں کا دل آج تک اس انداز سے نہ دھڑکا تھا۔ ماں نے ٹھیک کان کے پاس بھتیجا ہونے کی خوش خبری سنائی تو بھرے دل سے ہنس کر بولے۔" چلو بھائی آج ہم تایا بن گئے۔"

اُس دن جب آیئنے کے سامنے کھڑے ہو کر اُنھوں نے آئینے کو خوش خبری سنائی کہ لو بھئی تم تایا ہو گئے تو آئینے نے ہنس کر کہا۔" اور آج ہم بھی تم کو ایک خوشخبری سناتے ہیں کہ وہ دیکھو تمہارے کان کے پاس ایک سفید تار سا جھم جھما رہا ہے۔
کہیں یہ بڑھاپا تو نہیں ؟؟

لوگ کہتے ہیں کہ گرمیوں کی شاموں کو جو سرسراتی ہوائیں چلتی ہیں اُن میں ایک جھونکا ایسا بھی آتا ہے جو تنہائی کا احساس دلا کر کانوں کے پاس شائیں شائیں کئے جاتا ہے۔" اُٹھو۔ کسی کا ہاتھ تھامو۔ اُٹھو کسی کا ہاتھ تھامو۔ اُٹھو....." یقیناً ایسے ہی کسی جھونکے نے آدم کو تنہائی کا احساس دلایا ہوگا۔ اور شدت سے دلایا ہوگا تبھی تو حوا نے ان کی پسلی میں اپنی سیج سجائی۔ مگر لاکھ ہوائیں چلیں، ہوائیں گرم گرم ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی زندگی بخش پھواروں سے بدلیں۔ پھواریں پھر سردیوں کا پیغام لائیں۔ موسم کی اس آنکھ مچولی نے جی کو کیسے کیسے کلپایا۔ کبھی سرد برف کے جھونکے کبھی پروا کبھی چھینٹے جو بدمست ہواؤں کے دوش بدوش آتے۔ اور یہ سرسر کرتے جھونکے کانوں میں سرگوشیاں کرتے۔" اُٹھو کسی کا ہاتھ تھامو۔ کسی کی مہکی ہوئی زلف کو اپنے چہرے پر بکھیر لو۔ کسی کا آنچل جو دھنک رنگ ہے اس میں اپنے وجود کو چھپا لو۔ چھپا لو،

لیکن رفیق میاں کے کان ایسے پٹ تھے کہ اُن کے پردوں سے کبھی یہ آواز نہ ٹکرائی۔

جنے ایک دن بیٹھے بٹھائے انھیں خود ہی یہ خیال کیوں آیا۔ زہرہ دُلہن نے تو کبھی کسی بات پر زبان نہ ہلائی۔ ممکن تھا کہ میں شادی کر لیتا تو میری دلہن موم کی مورت ہی ملتی۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ اُونہہ اب غصے کی بات تو جانے ہی دو بھلا کون انسان ایسا ہے جسے ایک آدھ بات پر غصہ نہ آتا ہو۔ پھر میری دلہن ہی کیوں قصور وار ٹھہرائی جاتی۔؟

یہ سوال اُنھوں نے اپنے دل سے کیا تھا۔ دل کچھ جواب نہ دے پایا۔ دیتا بھی کیا، لیکن دوسرے ہی دن انھیں خود بخود جواب مل گیا۔

ننھے اسلم کے چھلّے پر گھر میں دھوم دھڑکا تھا۔ یوں تو اب گھر میں قہقہے سنائی دیتے ہی تھے مگر اس دن تو ہر طرف خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ماں بن جانے کے بعد عورت کا دل بڑا نرم و نازک بڑا وہمی بن جاتا ہے۔ اور اسلم میاں تو یوں بھی ماں کو زیادہ ہی پیارے تھے کہ کڑے دردوں سے جنائے گئے تھے۔ گود بھرائی کی رسم کے لئے زہرہ دلہن جب اسلم کو گود میں لے کر بیٹھیں تو چاؤ کے مارے بیوہ پھوپھی بھی پھول پہنانے لگیں۔ چھوٹی دلہن کے منہ سے جیسے آپ ہی آپ سوچا سمجھا جملہ ٹپک پڑا۔

" آپا بی پھول پہنانے کو ایک آپ ہی رہ گئی تھیں۔ حوری بھی تو ایک ہلکا پھلکا ہار پہنا سکتی تھی۔"

دُلہن نے تو اپنے حسابوں بڑی سمجھداری کی بات کی تھی لیکن آپا بی سے چھپا نہ رہ سکا کہ اُن کا مطلب کیا تھا۔ بھلا کون بہن اپنی بھابی کے سہاگ کو یعنی اپنی ہی زندگی اپنے ہی بھائی اپنے ہی خون کو ٹوک سکتی ہے۔

ارمان بھرا دل بھائی کی خوشی پر خوش ہی ہوا ہوگا۔ یہ تو نہ سوچا ہوگا کہ اپنا منحوس سایہ بھابی پر ڈال دیں۔ اور بھائی بھر پور جوانی میں مر کر اپنے پیچھے اولاد کو یتیم چھوڑ جائے پھر زہرہ دلہن کے منہ سے یہ بات کیسے نکل پڑی اور پھر وہ اس انداز سے اسلم کو اپنے سینے میں سمیٹ بیٹھی تھیں کہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہار تو گرا ہی گرا، اُدھر آپا بی

بھی گر پڑیں ۔ اماں بی کو جو کھٹک دن رات کھائے جاتی تھی کہ رفو میاں نے شادی نہیں کی، شادی نہیں کی ۔ وہ کھٹک آج کھٹ سے کہیں اُڑ گئی ۔ آج اُنہیں یاد آیا کہ کیسی عقلمندی کی بات بیٹے نے کہی تھی کہ ہانڈی ڈوئی ساتھ رہیں گی تو کھڑکینگی ہی ۔ اگر آج یہ رفیق میاں کی دُلہن نے کہا ہوتا تو کسی کو سہار ہوتی ۔ ؟؟ کوئی نہ کوئی کچھ کہہ اُٹھتا اور پھر وہ اپنے میاں کے کان بھر دیتی اور مرد کس کی سنے گا ؟ ماں بہنوں کی یا اپنی دل لگی بیوی کی ۔ ؟ جو اس کا پہلو گرماتی ہے ، اور بچوں سے اس کا گھر بھر دیتی ہے ۔

رات کو رفیق میاں نے بڑی بھلمناہٹ سے اپنے دل کو سمجھایا ۔

"میں جانتا ہوں تم عمر کے اس دور میں ہو کہ کسی پر نگاہ نہ ڈالو گے لیکن پھر بھی آج تمہیں سُنا دیتا ہوں کہ اپنے کان بند کر لو ، اپنی آنکھیں میچ لو ، ایسا نہ ہو کہ کوئی سریلی آواز اور مٹھاس بھری صورت تمہاری عبادت میں خلل ڈال دے ۔

دل نے دھیرے سے جواب دیا

عمر کا یہی حصّہ تو خطرناک ہوتا ہے ۔ اسی دَور میں آکر تو عورت کے پیار کی، اس کے محبت بھرے دل کی ، اس کے نرم گرم جسم کی خواہشیں بڑھتی ہیں ۔ پیاسا تو پانی دیکھ کر لپکتا ہی ہے ۔ کیا میں یونہی قصوروار ٹھہرایا جاؤں گا ... ؟

وہ ہنسے ۔ " نادان ، پیاس تو مدت ہوئی بجھ چکی ہے ۔ اب کوئی خطرہ نہیں ۔ یہ تو محض ایک دوستانہ مشورہ تھا ۔"

دل بے تکے پن سے بولا ۔ بعض ملائم ہونٹ اتنے گستاخ ہوتے ہیں کہ بے صدا آواز سے پکارے جاتے ہیں ۔ ہمیں چُوم لو ۔ ہمیں چُوم لو ۔ ... اگر ان گستاخ ہونٹوں پر بھولے بسرے پیار آ ہی گیا تو ۔ ؟؟

"نہیں ۔" انھوں نے دھیرے سے مضبوط لہجے میں کہا ۔ "ایسا کبھی نہ ہو گا ۔ میری روح کے سارے دروازے بند ہیں ۔ یہاں تک کسی کی آواز نہیں پہنچ سکتی ۔ چاہے وہ پیار کی درخواست کرنے والے ملائم ہونٹ ہوں یا چنگاریاں چھوڑتے ہوئے سرخ سرخ گال"

اس سے پہلے اماں نے ایک بار شادی کے لئے کہا تھا' بڑے پیار اور بڑی ضد سے اُنھوں نے بیٹے کو قائل کرنا چاہا تھا۔

خواہ مخواہ عورتوں کو بدنام کرتا ہے بھلا چھوٹی دلہن نے آج تک کیا کیا ۔ کبھلے کو بڑی ہی آتی تو دل سکون ملتا ۔"

"کیوں اب سکون نہیں ہے کیا ۔" اُنھوں نے کہا تھا۔

" ہے کیوں نہیں مگر ۔۔ ؟"

" مگر کیا ۔۔ ؟"

ارے کمبخت ۔۔" اماں گلا پھاڑ کر چلائیں ۔ خواہ مخواہ ٹرٹر کئے جاتا ہے کبھی تو اس ممتا کے مارے بوڑھے دل کا خیال کر .... "

اُس دن اماں نے ایسی گونج گرج کے ساتھ ڈرادیا تھا کہ ایک لمحے کو وہ جھک سے گئے تھے اور اماں بھی اپنی جگہ خوش ہو گئی تھیں' مگر اس دن کی بات اور تھی اور آج کی بات اور . زہرہ دلہن کی اتنی سی بات نے سارے گھر میں سناٹا پھیلادیا تھا۔ انو میاں بن بات اپنی جگہ روٹھ گئے تھے۔ جیسے واقعی آپا بی کا قصور ہو اور آپا بی کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسوؤں کی قندیلیں سلگ اٹھی تھیں. انھوں نے اماں سے جاکر بڑے دھیمے سبھاؤ میں کہا ۔

" میری آمدنی تو یونہی سی ہے' اور کوئی ذریعہ آمدنی کا ہے بھی نہیں ۔ اور اماں شادی کرنا تو سراسر آبادی بڑھانا ہے ۔"

بھلا اتنے سارے لوگوں کے کھانے پینے پر کچھ نہ کچھ خرچ تو لگتا ہی ہے ۔ بس آپ سب لوگ میرے آس پاس رہیں ۔ اماں مجھے سچ مچ بڑا غرور محسوس ہوتا ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میں اتنے سارے لوگوں کا بڑا ہوں ۔ ان سب کی دیکھ ریکھ کرتا ہوں ۔ میرے دم سے ان کی خوشیاں ہیں ۔ اور میرے ہی دم سے .... "

اور ان کی بات کاٹ کر ان کا دل ان سے پوچھ بیٹھا ۔

"اور اپنی تو سناؤ — سچ کہنا کیا تم نے کبھی ایک چاند سی دلہن اور پھول سے بچے کی آرزو نہیں کی ؟ یہ تمہارے وجود پر برف کی سلیں رکھی ہیں، جو راتوں کو پگھل پگھل کر تکیے کو گیلا کر دیتی ہیں ۔ اور اماں .... (وہ دل کا اُلاہنا شربت کا گھونٹ جان کر پی گئے) سب سے زیادہ خوشی تو مجھے اس بات کی ہے اماں کہ میں آپ کا بھی بڑا ہوں ۔ !"

اماں نے بیٹے کو سینے سے لگا دیا — وہ سِل 'جو راتوں کو چھپے چوری پگھل پگھل کر تکیہ بھگویا کرتی تھی ۔ دن دہاڑے پگھل اُٹھی

ٹپ — ٹپ — ٹپ

شروع سے رفیق میاں نے انو کو ایسی شہ دی بات بے بات یوں پشت پناہی کی تھی کہ ان کو ذمہ داری کا احساس ہوا ہی نہیں ۔ انسان کے آگے پیچھے کوئی اجھٹا ایسا لگا رہے کہ بار بار اسی کا دھیان بندھا رہے تو وہ ذرا ذمہ دار بن جاتا ہے ۔ یہاں تو شروع سے لے کر آخر تک ہر کام کو رفیق میاں نے سنبھال لیا ۔ پھر بھلا ان میں کیا احساس پیدا ہوتا اور تو اور پڑھائی بھی پوری نہ کر سکے ۔ بھائی کی کمائی کو کبھی یہ سوچ سمجھ کر خرچ نہ کیا کہ یہ بھائی کے محنت کے پسینے کی کھینچ ہے اور انو میاں کا تھا ہی کیا ، سبھی رفیق میاں کے بل بوتے پر زندہ تھے اگر رفیق میاں کی بھی کوئی بیوی ہوتی تو وہ اپنا حق جتا کر کچھ نہ کچھ تو سنبھال کر بچا کر رکھتی مگر انھوں نے خود ہی یہ روگ نہ پالا ۔ اب تک جتنا بھی آیا سبھی کھائی میں گیا ان کا جو کچھ تھا سب گھر والوں کا تھا ۔ بھولے سے بھی کبھی خیال نہ آتا کہ کبھی اپنی بھی شادی ہوگی ۔ دُلہن گھر آئے گی ۔ اپنے بچے ہوں گے ۔ اور ان کی بھی زندگی بنانی پڑے گی ۔ جب آگے پیچھے کوئی فکر ہی نہیں تھی تو اور کون سا خیال ہوتا ۔ جو جی سے چمٹا رہتا ؛ بس آ جا کے یہی دکھ انہیں ستائے جاتا کہ میری جان پر بھلے سے جو گذر رہے سو گذرے لیکن سب چین اور امن خوشی سے رہیں ۔ مگر اتنا سا سکھ ان کے نصیب میں نہ تھا ۔ زہرہ دلہن کا منہ ایک بار کیا کھلا کہ سدا کے لئے ہی کھل کر رہ گیا ۔ روز دا نتا کلکل ہونے لگی ، کبھی کبھار تو اماں بول جاتیں ورنہ اکثر خاموش ہی رہتیں ۔ مگر چھوٹی دلہن کا منہ بند ہونے میں نہ آتا ۔

آپا بی کے بچے اسلم کے دیوانے ـ یوں بھی گھر میں ننھا بچہ ہو تو بڑوں چھوٹوں سبھی کے لئے کھلونا ہو جاتا ہے ـ بچے اسے ستائیں بھی، ماریں بھی اور کھلا پلا کر پیار دلار بھی کریں ـ اس کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ بچے سے دشمنی ٹھہری ہے ـ کھلائے پلائے کی حد تک تو مومانی چپ تھیں ـ لیکن جہاں بچے کی چیں بھی سنی وہ آپے سے باہر ـ

"اوئی! بچہ نہ ہوا خدا کا غضب ہو گیا ـ میں کہوں یہ کون تک ہے کہ ننھے بچے کو رلا رلا کر خوش ہوتے ہیں ـ ہنستے ہیں ـ" حوری ایسی طرار تھی کہ خاموش تو اس سے بیٹھا ہی نہ جاتا ـ تیزی سے بولتی ـ" ہاں ہاں جان کر رلا رہے ہیں ـ سن لیا ـ ارے کھاتا ہی بہت ہے تو چلائے گا نہیں ؟"ـ

چھوٹی دلہن انگارے اگلنے لگتیں ـ "اے لیو اور سنو ـ کیا تمہارے باوا جان، جائداد چھوڑ کر مرے تھے کہ کھلائے پلائے کا الاہنا دیتی ہو ـ لو بھئی چار دن کی چھوکری ہمارے منہ آتی ہے ـ"

آپا بی جو لپک کر دو چار دھول دھپے حوری کو جڑ دیں تو جڑ دیں ورنہ بات بڑھتی، چلی جاتی ـ اور جب تک خود رفیق میاں اپنے کاغذات کے انبار سے نکل کر نہ آتے تب تک صلح صفائی نہ ہوتی ـ

انھیں دنوں زہرہ دلہن کی چھوٹی بہن طاہرہ اپنی بہن سے ملنے آئی ہوئی تھیں ـ اچھی خاصی صورت ـ ڈھنگ گن بھی اچھے ـ منہ کی ایسی میٹھی کہ بس باتیں ہی سنا کرو ـ رفیق میاں سے پردہ تھا لیکن آتے جاتے جھپک ضرور دکھائی پڑ جاتی ـ اماں تو چھوٹی بہو کے تماشے دیکھ دیکھ کر دنگ تھیں ـ مگر آپا بی چاہتی تھیں کہ رفیق میاں گھر بسا لیں ـ جانتی تھیں کہ بھائی نے یہ ویرانی کسی اور کے لئے نہیں انہی لوگوں کے لئے اٹھائی ہے ـ ورنہ آگے پیچھے بہن بھائی، بھانجے بھتیجے نہ لگے ہوتے تو وہ کیوں ایسے ڈھائیں ڈھائیں پھرتے لاکھ چاہا کہ بھائی ہاں کر دیں لیکن وہ کب ماننے والے تھے ـ بہن نے بہت ہی جان کھانی شروع کی تو بولے ـ

"جیسی ایک بہن ویسی دوسری ۔ زہرہ دلہن نے بیٹھے بیٹھے کیسے ہاتھ پاؤں، نکالے ہیں۔ اگر طاہرہ بی بی بھی ویسی ہی نکلیں تو ــــ ؟ پھر تو اس گھر کا اللہ ہی مالک ہے نا آپا بی نا ــ میرے سامنے میرے ننھے منّے بھانجے بھانجیاں ہیں۔ ان کی زندگیاں ہیں ــ میرا اپنا بھائی ہے لاکھ جان جوان ہے مگر مجھے تو یہ بات نہیں بھولتی کہ ابا میاں میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے کر گئے تھے۔ پھر اس کی بیوی بچے ہیں۔ آپ ہیں۔ اماں بی ہیں ــ میں کیسے اتنے سارے لوگوں کو چھوڑ دوں ؟ میں اور کتنی بار دہراؤں کہ مجھے باربار مجبور نہ کیا جائے۔ میں اپنا ذہنی سکون نہیں برباد کرنا چاہتا۔ سب سے ٹھیک یہ ہے کہ اتنے سارے لوگوں کو چھوڑنے کی بجائے میں ایک دلہن کو چھوڑ دوں ــــ"

آپا بی خوش ہوگئیں ــ" اگر طاہرہ بی بی بھی ایسی ہی نکلیں تو ــــ" مطلب یہ کہ وہ شادی کے لئے راضی تو ہیں مگر وہ صرف اس وجہ سے آنا کانی کر رہے ہیں کہ کہیں بڑی بہو بھی چھوٹی کی طرح لڑاکا اور بدتمیز نہ نکل آئے اور گھر کا سکون لٹ جائے۔ وہ خوشی خوشی بولیں ــ" اے میاں تو میں کوئی اچھی سی میٹھے سبھاؤ کی دلہن ڈھونڈ ھ لاؤں گی۔"

سامنے ٹوکری میں سیب دھرے تھے۔ ایک سرخ سا سیب اُٹھا کر وہ بولے "یوں دیکھنے میں اوپر سے تو یہ اتنا خوبصورت نظر آرہا ہے لیکن کون جانے یہ میٹھا ہے یا کھٹا
آپا بی کی زبان پر تالے پڑ گئے۔

ایک دن چھوٹی دلہن نے بڑے چاؤ سے باورچی خانہ سنبھالا اور مرچوں کا کھٹا سالن پکایا۔ اور تو سب نے ہری مرچوں کا کھٹا اور تیز سالن مزے لے لے کر کھایا مگر اماں بی ایک تو بوڑھی ۔ دوسرے دس دن سے پیچش سے گھل رہی تھیں ۔ سوں سوں کر کے جیسے تیسے مگر انھوں نے بھی کھا ہی لیا۔ بہو کو یہ بات نہ بھائی کہ سب تو تعریف کریں اور ساس سوں سوں کر کے سب کی توجہ اس بات کی طرف دلائیں کہ "دیکھو بھئی اس نے سالن

مزے کا نہیں پکایا - بلکہ مرچیں کچھ زیادہ ہی جھونک دی ہیں ۔"

وہ کھرّے پن سے بولیں ۔" اوئی اماں جان آپ یہ سُوں سُوں کیوں کئے جا رہی ہیں؟"

اماں نے بیچارگی سے دیکھا اور بولیں" بی بی بس کچھ بہانہ تو کر نہیں رہی ہوں' دیکھ لو بیچپش کے مارے زبان چھالوں سے لد گئی ہے ۔" انھوں نے زبان نکال کر بتائی - سرخ کھیری ہو رہی تھی ۔

اُنو مُیاں بیوی سے مخاطب ہو کر بولے ۔" تمہیں معلوم تھا اماں بیمار ہیں تو ایک پھیکا سالن الگ سے پکا دیتیں ۔"

"اے واہ - میں کوئی باورچن ہوں ۔ کیا میں نے ماماگیری کرنے کا ٹھیکہ اُٹھا رکھا ہے کہ سارے گھر کا کام کاج کرتی پھروں ۔ ایسا ہی ہے تو چولھے کیوں نہ الگ کرلیں وہ اپنی مرضی سے کھائیں ، ہم اپنا من مانا پکائیں ۔"

بہو کی زبان چر چر چلی جا رہی تھی ۔ رفیق میاں نے ناگواری سے بھاوج کی طرف دیکھا ، مگر کچھ بولے نہیں ۔ اماں بی بھی خاموش رہ گئیں ۔ مگر آپا بی سے چُپ نہ رہا جا سکا تنّا کر بولیں ۔" دلہن - ایک دن چولہے کے پاس جا کر جھانکا تو اتنی باتیں کر رہی ہو آخر تمہیں اپنے بچوں سے فرصت ہی کب ملتی ہے کہ باورچی خانے کا رخ کرو ۔ اُوپر کا سارا کام تو باقرہی نبیڑ لیتا ہے ۔ رہا روٹی تھوپنا اور رہا ہنڈی بھون دینا تو آخر میں اور اماں پھر کرتی ہی کیا ہیں ؟"

" گویا میں تو مالکن بن کر راج رچ رہی ہوں نا ۔" وہ تیکھی ہو کر بولیں

" میں نے تو نہیں کہا بی بی - تم آپ کہہ لو تو میں کیا کہہ سکتی ہوں - لیکن تم ہی کہو کر شادی کے اتنے دن گزر گئے تم نے کتنی بار باورچی خانے میں جھانک کر بھی دیکھا ۔ ایک دن ایک سالن پکا کر یہ کہہ دینا ذرا تو زیبا نہیں کہ میں باورچن نہیں جو سارے گھر کا کام کاج کرتی پھروں ۔ انسان ذرا تو ایمان کا پاس کرے ۔"

سارے گھر میں وہ ہلڑ مچی کہ توبہ ہی بھلی ۔

دلہن نے رو رو کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ آخر رفیق میاں کو ٹھنڈے دل سے کہنا پڑا۔

"آپا بی آپ غلطی پر ہیں۔ چھوٹی دلہن کا کہنا ٹھیک ہے۔ اگر ان کی مرضی ہو تو آپ چولہا ہانڈی الگ کر لیں۔"

امّاں جو اب تک چپ تھیں، پھپھک کر بولیں۔ "اے واہ ان کی مرضی۔ یہ اُن کی مرضی کیا ہوئی۔ کون سی بڑی اُن کی کمائی دھمائی ہے۔ ذرا منہ تو ہو بولنے کے لئے۔ دوسروں کے مال پر یوں چودھرائی کرتے ذرا تو شرم آئے۔"

الو میاں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ "بھائی صاحب آپ زہرہ کی باتوں کا اثر نہ لیں۔ سب ایک ساتھ ہی بھلے۔ خواہ مخواہ ایک فتنہ کھڑا کر دیا۔" وہ غصّے سے بیوی کو گھورتے ہوئے بولے۔ "بہو کو ساس کی بات تیر جیسی لگی۔"

"یہ دوسروں کے مال کی اچھی سُنائی۔ آخر کو بڑے بھائی ہیں، کچھ تو حق لگے گا اور کیا ابّا میاں یونہی خالی ہاتھ تو نہ مرے ہوں گے۔ پھر وہ جمع جتھا کدھر ہو گئی ہیں تو پھوٹی دمڑی تک نہ ملی۔ ورنہ یہ بڑے بھائی آج وکیل اور چھوٹے بھائی اَن پڑھ نہ رہ جاتے۔"

ایک تلوار تھی کہ سب کے دلوں کو کاٹتی ہوئی نکل چلی۔ کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ کسی کے منہ سے ایک حرف نہ نکلا۔ رفیق میاں اپنی جگہ سکتے میں رہ گئے۔ اسی کو دنیا کہتے ہیں۔ بھائی سے محبّت کی اور ایسی کہ کبھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ دیکھا۔ ہر ضد پوری کی، یہاں تک کہ پڑھنے سے جی چُرایا تو ڈانٹ ڈپٹ تک نہ کی، کہ دل پر بوجھ نہ پالے۔ اسکول سے اس لئے اُٹھا لیا کہ پڑھائی میں دل نہ لگتا تھا۔ ماسٹر مار پیٹ کرتے تھے تو روتا ہی رہتا تھا۔ اور اُن کا اپنا دل دکھتا تھا۔ خود روکھا سوکھا کھا کر سب کی برابری کی۔ اپنے ارمانوں اور آرزوؤں کو تھپک تھپک کر سُلایا۔ اپنے جذبات کی خود ہی قدر نہ کی اور بھائی کی سیج سجا دی۔

بھائی کی دلہن آئی تو ان کا اپنا بستران کے لئے کانٹوں کا بچھونا ہو گیا۔ مگر کسی سے بھی اپنے دل کا دکھ نہ کہا۔ بھائی باپ بنا تو جگر پر آرے چل چل گئے۔ مگر دل کے درد کو تکیہ

بھگو بھگو کر مٹاتے رہے۔ اور آج بھاوج نے کیا صاف صاف سُنا دیا۔ پشیمان نگاہوں سے بھائی کو دیکھا ۔ لاکھ بُرے تھے۔ انّو میاں، مگر ان میں ایسی بُری کوئی ادا نہ تھی کہ جس کی وجہ سے بڑے بھائی کا دل اُن سے پھر جاتا۔ بس اتنی بات ضرور تھی کہ گھر بیٹھے روٹی توڑتے تھے۔ اور کمائی نہ دھن۔ سال پیچھے بچہ جنتے تھے۔ لیکن یوں کھری کھری تو کبھی انھوں نے بھی نہ سُنائی۔

انّو میاں نے بڑی شرمندگی سے بڑے بھائی کو دیکھا اور غم سے بولے۔ "بھائی صاحب زہرہ کی باتوں پر نہ جایئے۔ چولہے دو ہو جائیں گے تو دل بھی دو ہو جائیں گے۔"

"ہمیں کیا ایک دل لے کر چاٹنا ہے جی کہ آئے دن کی موئی لڑائیاں لپٹ گئی ہیں" زہرہ دُلہن کا غبار ابھی تک نہ نکلا تھا۔

"ہاں زہرہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایک جگہ رہ کر بکھرے ہوئے دلوں سے کہیں اچھا ہے، کہ بکھرے ہوئے رہ کر دل ایک رہیں۔" رفیق میاں نے ٹھنڈی سانس بھر کر بھیگے بھیگے لہجے میں کہا۔

چولہے دو ہو گئے لیکن دل پھر بھی ایک نہ ہو سکے۔ دل کی رنجشیں باقی ہی رہیں چھوٹی موٹی باتوں پر آئے دن جھڑپ ہو جاتی۔ امّاں تو طرح دے کر ٹال جاتیں لیکن آپا بی برداشت نہ کر پاتیں۔ انھیں رہ رہ کر یہی دکھ ستاتا کہ آج بھائی کی حالت انہی کی وجہ سے یوں تباہ ہے۔ یوں بڑے نرم سبھاؤ کی تھیں اپنی سسرال میں کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات تک نہ کی۔ اپنے سے چھوٹوں تک کی بھی عزّت کی۔ بھلا بڑوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ مگر بھاوج نے رات دن کے طعنوں مہنوں سے ان کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔

پہلے پہل تو رفیق میاں گھر کے اندر ہی دالان کے دائیں ہاتھ والے کمرے میں رہتے تھے مگر جب لڑائیوں کا زور شور بڑھا تو وہ مردانے میں اُٹھ گئے۔

بیاہے مرد کو یہ احساس نہیں ہو سکتا کہ ایک کنوارے مرد کی زندگی کیسی کانٹوں کا بچھونا ہوتی ہے۔ عورت کا ساتھ کسی ٹھنڈے باغ سے کم نہیں ہوتا۔ فکر ہو۔ پریشانی

ہو۔ غم ہو، الجھن ہو، ذرا جی ہارا اور عورت کا سہارا لیا۔ اس کے پیار کے دو بول زندگی
میں ٹھنڈک پھیلا دیتے ہیں۔ غم کے اندھیرے میں اس کی محبت اور دلاسوں سے
چاندنی بکھرنے لگتی ہے ـــ ہر غم تو ایسا نہیں ہوتا کہ ماں بہن سے رونا لے بیٹھے۔
ماں، بہن لاکھ کلیجے سے چپٹالیں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو عورت محض ایک پیار
بھری ترچھی نگاہ سے ہی دیکھ لے!!

رفیق میاں کی زندگی میں تو اس نگاہ کا گذر ہی نہ تھا ـــ رات ہو یا دن۔ بیٹھک
کھلی اور وہ بھلے۔ کاغذات سامنے دھرے ہیں۔ اور وہ سوچ بچار میں غرق ہیں
کبھی بچے اُچھل پھاند کرتے پہنچ گئے کبھی حُوری شرارت کرنے جا پہنچی ورنہ وہاں وہی یک
رنگی تھی۔ ایک دن انھوں نے بڑے جتن سے اپنے دل کو سمجھایا تھا۔

"اپنی آنکھیں میچ لو ـــ اپنے کان بند کر لو کیا خبر کوئی چاندسی صورت تمہاری عبادت
میں بادھا ڈال دے۔" اب ایسی بات سوچ کر انھیں ہنسی آتی تھی۔ بھلا میں بھی کتنا
نادان تھا۔ دل کو سمجھانے چلا تھا ـــ بھلا میری زندگی میں کہیں چاند چمکا کرتے ہیں؟ اور
جو چمکیں بھی تو میں کہیں دیکھا کرتا ہوں۔"

اور وہ مزے میں اِدھر اُدھر ڈولتے پھرتے۔ اپنے کھچڑی بالوں کو دیکھتے اور
بولتے ـــ

"عبادت گاہ کے دروازے تو بند ہیں۔ اب یہاں کون آئے گا۔ کیسے آئیگا ـــ؟"
گرمیوں کی رسمساتی شاموں کا البیلا جھونکا کبھی تو ان کے کانوں میں نہ کہہ سکا کہ "اُٹھو
کسی کا ہاتھ تھا مو۔"

مگر اب اُن کا سارا مان ٹوٹ کر رہ گیا ـــ سُرخ مخملیں چپلیوں کو دیکھ ان کی سا ری
عبادت دھری کی دھری رہ گئی ـــ وہ نرم نرم گرگابیاں ان کے دل سے یوں چمٹ
کر رہ گئی تھیں کہ نکالے نہ نکلتیں ـــ نہ کسی کی چاندایسی صورت پر پیار آیا نہ کبھی کسی کی

سریلی آواز نے کانوں میں رس ہی گھولا۔ نرگسی کی نگاہوں کا تیر دل کے آر، پار ہوا۔ نرگسی کی
البیلی چال نے اُن کا سیدھا راستہ چلتے قدم ڈگمگائے۔ اور تو اور کسی کے سرخ ہونٹوں
نے یہ گستاخی نہیں کی کہ "ہمیں چُوم لو۔ ہمیں چوم ..... ہمیں ..."

جنے کیسا سمے تھا کہ بے پروں کے دل اُڑ پنچھو ہوگیا۔ ان کا دل چاہتا کہ نرم نرم..
گرگابیوں پر ہمیشہ کے لئے اپنا سر جھکا دیں ــ" میں تمہاری عبادت کرتا ہوں۔ میں تمہیں
پُوجنا چاہتا ہوں ـ میں تمہیں پیار کرنا چاہتا ہوں۔"

اور جب سے وہ شوکی اپنی پیٹھ موڑے دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی اپنی
گلابی گلابی ایڑیاں ان کے دل کے زخموں پر مرہم کی طرح رکھتی چلی گئی تھی۔ اُن کو ہمیشہ اپنے
آس پاس گلاب کی اَدھ کھِلی کچی کلیوں کا ڈھیر سا محسوس ہوتا رہتا۔ ہاتھ بڑھا بڑھا
کر وہ ان کلیوں کو چھونا چاہتے تو جیتی جاگتی ایڑیاں بن جاتیں اور دھیرے دھیرے دور
ہوتی چلی جاتیں۔ لپکتے تو قہقہے لگا کر کہتیں۔

"ہمیں چھوؤ نہیں ہماری عبادت کرو۔ ہم تو پوجے جانے کے لئے ہی بنی ہیں:
اور یہ کسی انجانی طاقت کے آگے سر جھکا دیتے۔ کیا یہ محبت ہے..؟ وہ اپنے دل
سے پوچھتے ـ دل بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔

" عبادت خانے کے دروازے تو بہر حال اب کھُل ہی گئے ہیں۔ اور جیتا جاگتا
بت اس میں داخل ہوگیا ہے۔ عبادت تو کرنی ہی پڑے گی۔ بھلے یہ کفر ہی سہی"!!

اب تک رفیق میاں کی شوکت سے مڈبھیڑ نہ ہوئی تھی۔ وہ تو اندر ہی گھُسی رہتیں
کھانا لگ جاتا تو اماں بی اُدھر سے آواز دیتیں۔

"رفو میاں کھانا کھالے بٹیا ـــ" یا پھر حوری تھرکتی ہوئی آتی اور وہیں سے
چلّائے جاتی۔

"سب بھائی لوگ کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ماموں جان، اجی

ماموں جان چلئے نا بھئی کھانے ۔۔۔۔۔۔"

پہلے رفیق میاں یوں ہی اُٹ جھٹ کر آجایا کرتے اور اب گھر میں داخل ہونے پر یوں سنبھل جاتے تھے، جیسے عبادت گھر میں داخل ہو رہے ہوں۔ سر جھکا ہوا۔ آنکھیں نیچی۔ ہلکے ہلکے قدم۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا کہ شوکت نظر آ گئی ہو۔ مگر انھیں تو اُڑتی خوشبوئیں آپ ہی بتا دیتی تھیں کہ وہ گلاب کس جگہ مہک رہا ہے۔

انو میاں کے گود کے بیٹے کا عقیقہ تھا۔ ایسے کام کاج کے دن دو جگہ کھانا نہ بچتا بلکہ سبھی ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے۔ ورنہ جب سے لڑائی ہوئی تھی اس گھڑی سے آج کے دن تک الگ الگ ہی کھانے پکتے اور کھائے جاتے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کے گھر تو کچے گوشت کا حصہ بھجوا دیا گیا۔ گھر میں تین چار رنگ کے سالن قورمے پکے۔ میٹھا بنا۔ پتلی پتلی چپاتیاں۔ کھانا کھانے سبھی بیٹھے۔ رفو میاں نے ایک نوالہ منہ میں رکھا اور بے ساختگی سے بولے۔

"قسم خدا کی، اماں کیا ہی مزے دار قورمہ بنایا ہے۔"

اماں شوکت کی طرف دیکھ کر پیار سے مسکرا دیں۔

شوکت عورتوں والے حصے میں کھانا پکا رہی تھی۔ اپنا ذکر اور پھر تعریف کے سلسلے میں سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ آنکھیں اُٹھیں اور سیدھی ان بجلیوں سے جا ٹکرائیں جو اتفاقاً رفیق میاں کی آنکھیں تھیں۔ رفیق میاں بری طرح گڑبڑا گئے۔

کھانا حلق سے اُترا بھی نہ تھا کہ جلدی سے سامنے سے کھارے کی رکابی ہٹا کر میٹھے کی طشتری کھینچ لی۔

پھر شامت آئی — ماں سے اُسی لہجے میں لاعلمی میں کہنے لگے۔

"اماں میں سمجھتا ہوں آپ نے اتنی مزے دار فیرنی تو آج تک شاید ہی کبھی بنائی ہو۔"

اب کے ماں صاف صاف ہنس پڑیں۔

"اے لڑکو تیری عقل ماری گئی ہے۔ دوپہر سے گھر میں ہلو رہے ہے کہ آج کے کھانے

شوکت نے پکائے ہیں۔ اور اماں کی تعریف ہو رہی ہے۔ واہ۔"

لوگ کہتے ہیں کیسی ہی پتھر دل عورت ہو، مرد کی تعریف سے بہہ جاتی ہے اور بھلا شوکت پتھر دل کب تھی۔۔ ؟۔

اب کی بار شوکت کی نگاہیں اٹھیں اور اب کے، بجائے آنکھیں ملنے کے، یوں ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اُتر گئے اور آنکھوں کے راستے سیدھے دل میں اُتر کر بیٹھ گئے ہمیشہ کے لئے۔

بے تکے پن سے رفیق میاں اُٹھے اور لپکتے ہوئے باہر چلے گئے۔ بعد میں اپنے پلنگ پر گر پڑے اور اوپر نیچے لمبی لمبی سانسیں لینے لگے، پلٹ پلٹ کر ادھر ادھر دیکھتے اور گھبرا گھبرا کر آنکھیں بند کرتے اور پھر کھول دیتے۔

کچھ نہ سوجھا تو آئینے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ سوچا تھا وہاں شوکت ملے گی۔ لیکن وہاں تو بس وہی وہ تھے۔

"تم کہاں چلی گئیں ۔۔ تم کہاں چلی گئیں ۔۔۔۔"

"میں ۔۔؟ میں تو تمہارا ہی ایک رُوپ ہوں۔ میں تم سے الگ کب تھی، جو مجھے کھو جنے کی ضرورت پڑے۔ اپنی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو، اگر اپنا ہی عکس نظر آئے تو جان لو کہ وہ تم نہیں، میں ہوں میں، جو تم میں جذب ہو کر تمہارا ہی روپ دھار چکی۔"

پلکیں جھپکا جھپکا کر انھوں نے دُور دُور تک اپنی آنکھوں کی سیر کر ڈالی۔ وہاں اُن آنکھوں میں شوکت بہار بن کر پھُول کھلا رہی تھی۔ پھول بن کر خوشبو مہکا رہی تھی اور خوشبو مہکا کر اپنے وجود کو نہلائے بیٹھی تھی۔ میٹھی میٹھی پھُوار سے اُن کا سارا جسم بھیگ گیا۔

وہ شوکت بڑی نازک تھی۔ دُبلی پتلی، سُرخ و سفید رنگت۔ پیٹھ پر لمبی سی موٹی چوٹی سدا جھولتی ہوئی، وہ یوں تو جوہی کی مُنی کلی ایسی تھی مگر اس کی ساری خوبصورتی آکر ایڑیوں میں جمع ہو گئی تھی۔ ایسی کومل کومل گلابی ایڑیاں کہ ایک دن رفیق میاں نے چوری سے بڑے

رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ری حوری یہ تیری شکو باجی نے کہیں گلابی رنگ تو گھول کر اپنی ایڑیوں میں نہیں بھر لیا ہے۔؟"

حوری ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ لوٹتے لوٹتے پھر اُٹھ بیٹھی اور اُٹھ کر اندر بھاگ گئی اپنے قہقہوں کو روک کر اس نے بڑی مشکلوں سے پھوپھی سے کہا۔

"شکو" باجی کچھ سُنا۔ ہمارے ماموں جان کہہ رہے تھے" وہ سانس لے کر بولی۔ ۔"کہ کہیں آپ نے ایڑیوں میں گلابی رنگ تو گھول کر نہیں بھر لیا ہے۔؟ ہی ہی ـــ ہاہا ـــ ہو ہو ـــ

شوکت نے گھبرا کر اپنے پیروں کو دیکھا۔ اپنے بازوں کو دیکھا۔ اپنی آنکھوں میں جھانکا۔ اپنی انگلیوں کی سُرخ سُرخ پوروں کو پتلیوں سے قریب لا کر دیکھا۔ اور پھر ہتھیلیوں میں ایڑیوں کو لے کر دیکھنے لگی۔ پھر وہی سرخی اس کے گالوں میں بھر گئی اور ہنسی اس کے چہرے پر چھا گئی۔ ہنستے ہی ہنستے اس نے حوری کی ٹھوری پکڑ لی اور بولی ۔ بتا تو بھلا مجھے ہنسی کیوں آرہی ہے۔۔؟

حوری اپنی ہنسی بھول بھلا کر شوکت کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ پھر جیسے بڑی عقلمندی کے انداز سے سر ہلا ہلا کر بولی۔

معلوم ہوگیا جی" یہ آپ کچے رنگ کے مخمل کی گرگابیاں اس لئے پہنتی ہیں کہ ان کا رنگ چھوٹ چھوٹ کر ایڑیوں میں لگتا ہے، اور ماموں جان تعریف کرتے رہیں۔"

"اررر ـــ" شوکت گھبرا کر بولی "کیسی باتیں کرتی ہے۔ حوری ۔ بھلا میری چپلیاں کچے" رنگوں کی ہیں۔ توبہ، توبہ"

"پھر آپ کی ایڑیاں گلابی کیوں ہیں؟؟"

شوکت نے ہنس کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔" اور کل تو یہ پوچھنے بیٹھے گی کہ آپ کے گال اتنے سُرخ کیوں ہوئے جاتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں اتنی گہری

کیوں ہیں۔ آپ چلتے میں جھومتی کیوں ہیں ۔ آپ آئینے میں کس سے باتیں کرتی ہیں۔
ایسی بے بنیاد باتوں کا بھلا میں کیا جواب دے سکتی ہوں ۔ ؟ اونہہ !!"

پھر ایک دن یوں ہوا کہ تیسری تاریخ کا کچھ مدھم سا، کچھ چمکیلا سا، زیادہ مدھم، کم چمکیلا، چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ سب لوگ آنگن میں بچھے ہوئے تختوں اور پلنگوں پر لیٹے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ شوکت کی شادی کا ذکر چل نکلا۔

اماں نے اپنی سمدھن سے پوچھا۔
"کیوں بہن شکو بی بی کی بات کہیں ٹھہرائی ہے۔ ؟"
بہن کے چہرے پر ذرا ناگواری کے اثرات چھا گئے۔
" دوئی بہن اس کے باپ سے پوچھو ہم سے کیا پوچھتی ہو۔ تم سے کیا چھپانا ہے بیس اوپر دو برس کی بٹیا ہو گئی مگر قسم لے لو جو کبھی بھول سے بھی شادی کی بات چھیڑی ہو۔ لکھا پڑھا کر عاقبت خراب کر دی ہے۔ اب تو یوں آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ صفا کہتے ہیں کہ جب بٹیا کا جی چاہے گا تبھی کریں گے۔"
اماں نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر دیکھا۔
" دوئی یہ کیا بات ہوئی بھلا ۔" پھر بولیں .... "مگر کوئی لڑکا تو نظر میں ہوگا ہی"
"مجھے تو نہیں معلوم بی۔" پھر ذرا طعنے سے بولیں "کیا پتہ یہ لڑکا ڈھونڈنے کا اختیار بھی بیٹی کو ہی دے رکھا ہو۔"
ساری روشن خیالی یہیں آکر اٹک گئی ہے۔ صاف تو بولتے ہیں کہ مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ کبھی لڑکی کی شادی اپنی مرضی سے نہ کرو۔" اماں اچنبھے سے بولیں ۔
"بہن یہ تو آج تم نے نئی ہی بات سنائی۔"
"ہاں بہن ۔" انھوں نے ایک ٹھنڈا ٹھنڈا طعنہ چھوڑا ۔ "نئے زمانہ کے لوگ ہیں ۔ کوئی کیا کہے۔ بی اے تو پاس کر ہی لیا ہے بٹیا نے ۔ اب باپ کہتے ہیں ۔

ام اے بھی کروائیں گے۔ اب تک لڑکیوں کے کالج میں پڑھایا، اب تو لڑکوں کے کالج میں پڑھانا پڑے گا۔ میں کچھ زبان ہلاتی بھی ہوں تو بولتے ہیں کہ مذہبی کتابوں میں آیا ہے کہ جو بیوی اپنے شوہر کو خوش نہیں رکھے گی، سیدھا دوزخ میں جائے گی۔"

پھر تھوڑی دیر کے لئے تیسری کا چاندا ایک بدلی کی آڑ میں چلا گیا۔ اور سارے میں صرف چھالیہ کترنے کی چِک چِک باقی رہ گئی۔ مگر رفیق میاں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو تخت کے اس کونے پر ایک چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔

وہ اُٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ ہلکے سبز رنگ کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے رفیق میاں کو جا کر دیکھا، اچھے خاصے تھے۔ چہرے پر جُھرّی تھی نہ ماتھے پر شکن۔ انگوں میں تناؤ بھی تھا۔ اور بدن بھی گٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ اور ہونا کیوں نا لیکن لہریں مارتے سیاہ بادلوں میں یہ سفید سفید سی رہگزر کہاں سے پھوٹ نکلی تھی!۔

"میں تمہیں چاہتا ہوں مگر .... مگر ..." مگر کے ساتھ اپنے عکس سے مخاطب ہو کر کسی اور کو سنایا۔

"مگر یہ تم میرے بالوں میں سفید تار بھی دیکھ رہی ہو۔"

"دیکھ رہی ہوں۔ یہ سفید تار نہیں یہ تو تاروں بھری راہ ہے۔ کہکشاں ہے۔ اس پر شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا محبت سیاہ بادلوں اور حسین چہرے ہی سے کی جاتی ہے۔ وہ تو دل سے کی جاتی ہے۔ پیار کرنے والے، پیار کو سمجھنے والے دل سے ..."

رفیق میاں گھبرا کر پلٹے۔ اس راہ پر پاؤں دھرتے دھرتے۔ قدم قدم چلتے چلتے کون ان کے دل کے اس قدر قریب آ گیا تھا کہ اس کی آواز تک سنائی دے رہی تھی ملے جلے سبز اور سیاہ اجالے میں انھوں نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا۔ اپنے دبلے پتلے جسم کو سمیٹے شوکت پردے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ پردے کو اس نے اپنی پتلی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ ساڑی کے نیچے سے اس کے گلابی کافوری پیر نظر آ رہے تھے اور وہ پردے میں سے چاند ایسا منہ نکالے دھیمے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں رفیق میاں سے کہہ رہی تھی۔

"اس پر شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ کہکشاں تو راہ دکھاتی ہے۔ بھلا کہیں سفید روشن جھم جھماتے ستاروں کو کسی نے یہ کہہ کر ٹھکرایا ہے کہ یہ اجالا کیوں بکھیرتے ہیں — کیوں —؟ کیوں؟؟"

رفیق میاں نے آنکھوں کے پٹ کھول دیئے۔

شوکت شرما گئی۔ اس نے دھیرے سے پردہ چھوڑ دیا اور گلابی، گلابی ایڑیوں کو دھیرے دھیرے زمین پر ٹکاتی، اٹھاتی یوں دھیرے دھیرے چلی گئی کہ جیسے وہ ایڑیاں کانچ کی بنی ہیں کہ ذرا زور سے پاؤں پڑتا اور چٹخ چٹخ جاتیں۔

ابھی ابھی جہاں ایڑیوں کے نشان تھے، وہاں سجدوں کے نشان اُبھر آئے۔

رات بھر رفیق میاں کا کمرہ گلاب کی کچی کلیوں سے مہکتا رہا۔

عورت جب محبت کرتی ہے تو چاہتی ہے کہ ہر صورت اپنے محبوب کی خوشنودی حاصل کرے۔ اس کی محبت کا مرکز اپنی ہی اپنی ذات کو بنا لے۔ اس کی راہوں میں اپنی آنکھیں بکھیر اپنا دل بچھا دے۔ اور جب محبوب کے قدم پڑیں، وہ قدم تلے بچھی زمین رہ رہ کر پکار اُٹھے، ہمیں تم سے محبت ہے..... ہمیں تم سے محبت ہے۔

ہمیں تم سے....

ہمیں.....

اور یہ بھی تو محبت ہی تھی کہ اب دسترخوان پر ہمیشہ چٹ پٹی نئی نئی چیزیں کھانے کو ملتیں۔ جانے کیسے شوکت کو پتہ چل گیا تھا کہ رفیق میاں کو سوئیوں کی فیرنی پسند ہے۔ ثابت آلوؤں کا سالن من بھاتا ہے۔ چاول کھڑے کھڑے نہ پکیں تو دسترخوان چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت، کنوارپن کی پھٹکار منہ پھوڑ پھوڑ کر بولتی ہے، ہم کنوارے ہیں، ایسے میں جو محبت کی کہیں سے مٹھاس مل جائے تو چہرے پر نور بکھر جاتا ہے۔ وہی رفیق میاں تھے۔ وہی گھر، وہی حالات — وہی

خرچے۔ وہی خرچ کی تنگی، وہی بھاوج اور ماں کے جھگڑے۔ وہی بچوں کی جھڑ جھڑ پھڑ پھڑ مگر پھر بھی وہ — رفیق میاں نہ رہ گئے تھے، اور کوئی فرق بھلے سے آیا ہو نہ آیا ہو لیکن آنکھیں سدا چمکتی رہتیں، جیسے آنکھیں نہ ہوں آسمان سے توڑ کر دو ستارے ٹانک دیئے گئے ہوں۔

ایک دن باورچی خانے سے شوکت نکلی تو آنکھیں سرخ تھیں۔ آنگن بیچ کھڑی ہو کر اُس نے حوری کو پکارا۔ "حوری ذرا دیکھ تو میری آنکھ میں شائد بال پڑ گیا ہے۔" شیشے کی سی نازک ایڑیوں کی مانوس مدھم چاپ سُن کر رفیق میاں بھی اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔ حوری بازد میں کھڑی پھوپھی کی آنکھوں میں بال ڈھونڈ رہی تھی کہ اسی دم اسے رفیق میاں بھی اسی دنیا میں چلتے پھرتے نظر آ گئے۔

رفیق میاں کو سامنے دیکھ کر شوکت شرما سی گئی۔ ٹالنے کو حوری سے بولی۔

"جانے دے کدھر بھی کھو گیا ہو گا۔"

حوری شرارت سے بولی: "اجی جناب بال کی کیا بات ہے، آپ کی آنکھوں میں تو بڑے بڑے آدمی کھو جاتے ہیں۔ بال بے چارہ تو اتنا نازک، اتنا باریک ہی تھا۔!"

"کیا مطلب —؟" شوکت گڑبڑا کر بولی

"مطلب یہی —" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "کہ ابھی ابھی میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماموں جان آپ کی آنکھوں میں اُترے اور دیکھتے ہی دیکھتے کھو گئے۔"

شوکت اِس سچی حقیقت کو سن کر پانی پانی ہو گئی۔

رفیق میاں نے بہت — بہت دھیمے دھیمے کہا۔

"وہ آنکھیں تو میرا وطن ہیں۔ میں وہیں پیدا ہوا، میں وہیں پلا۔ وہیں بڑھا وہیں میں نے زندگی بتائی۔ وہیں رہ کر میں نے محبت کرنی سیکھی۔ وہیں رہ کر میں نے جانا کہ ایڑیوں میں گلاب کیسے کھلتے ہیں۔ وہیں میرے دل نے نئے انداز سے دھڑکنا سیکھا اور زندہ رہنے کا گر بھی تو میں نے اپنے وطن سے سیکھا ہے — کاش میں وہیں کھو جاؤں

یوں کہ پھر کبھی کسی کو نظر نہ آؤں - کبھی نہیں۔ — کبھی بھی نہیں ۔ اور ان پلکوں کے پیچھے

میری زندگی یوں ہی خاموش خاموش سی بیت جائے ۔"

شوکت نے بڑی مشکل سے پلکیں اُٹھائیں ۔ یوں جیسے ان پر ساری دنیا کا بوجھ تھا

وہ آنکھیں جو رفیق میاں کا وطن تھیں ۔ وہ اُن کے سامنے کھلی تھیں ۔ پلکوں کے دروازے کھلے

ہوئے تھے اور کوئی بے صدا آواز جیسے خوابوں کی دنیا سے انھیں بُلا رہی تھی ۔

"آجاؤ — چھپ جاؤ — "

آجاؤ — چھپ جاؤ — "

" خدا نہ کرے کہ تمہیں جلا وطن ہونا پڑے ۔"

اور شوکت نے بڑے معنی خیز انداز میں آنکھیں بند کرلیں ، یوں جیسے ہمیشہ کیلئے

ان دو پُتلیوں میں رفیق میاں کو قید کرلیا ہو ۔

رات چمکدار تھی — فضا خوشبودار تھی ۔ پھر یہ دل لگتا کیوں نہیں ؟ نیند آتی

کیوں نہیں — ؟ انھوں نے اپنے پلنگ پر پڑے پڑے سوچا ۔

" میں بوڑھا ہو رہا ہوں — بھلا بوڑھے سے کون پیار کر سکتا ہے — ؟"

میں کر سکتی ہوں — میں — جو ایک عورت ہوں اور سہارا دینا جانتی ہوں ۔

دو آنکھیں اُن کی آنکھوں میں جھک آئیں ۔ اور دھیرے دھیرے سے بولیں ۔

ذرا ان آنکھوں میں جھانک کر تو دیکھو، تمہارے سوا اور کوئی دوسری تصویر،

یہاں نظر آجائے تو پھر جو جی چاہے کہنا ۔

اگر وہ آنکھیں شوکت کی تھیں تو پھر واقعی ان میں سوائے رفیق میاں کے اور کسی

کی تصویر نہ تھی ۔

رات کے سناٹے میں یہ آواز کہیں سے بھی آئی ہو ۔ مگر ہے شوکت کی ہی ! انھوں

نے بڑی خوشی اور گہرے اطمینان سے سوچا ۔

رفیق میاں نے اپنے ہاتھوں اپنے لئے ایسا راستہ بنایا تھا کہ کوئی اونچ نہ نیچ ۔

Scanned with CamScanner

سیدھی سیدھی سڑک تھی ۔ بار بار ماں اور بہن نے کہا اور انھوں نے وہی ایک بندھا ٹکا جواب دیا۔

"نا، میں شادی نہیں کروں گا ۔"

اور آخر کتنی بار کوئی اصرار کرتا ۔ اور جب ان کے سر میں کھلم کھلا سفید بالوں نے راج رچنا شروع کر دیا۔ تو یہ خیال ہی سبھوں کے دل سے مٹ گیا کہ کبھی اُن کی شادی ہو بھی سکتی ہے ۔ لاکھ وہ سفیدی فکروں اور پریشانیوں کی رہی ہو ۔ مگر تھی تو سفیدی ہی ۔ پھر کون اُن کے دل پر ہاتھ رکھتے چلا تھا ۔ اور اب رفیق میاں کا دل اپنے پہلو سے اڑا تو کسی پل قرار نہ آیا۔ منہ پھوڑ کر ماں سے کیسے بولیں ؟ کیا صاف صاف جا کر یونہی سُنا دیں ۔" اماں میری شادی شوکت سے کر داد یجیئے نا ۔

کہنے کو کیا تھا کہہ بھی دیتے ۔ مگر ایک تو انہیں یہ خیال آتا کہ اس میں شوکت کی اپنی بدنامی ہوگی ۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اس کے ابا نے اُسے شادی کا پُورا اختیار دے رکھا تھا ! ایسے میں یقینی بات تھی کہ سب کی نگاہیں اس کے دل کو ٹٹولنے لگتیں اور پھر دوسرے یہ کہ انھیں عمر کے اس دور میں پہنچ چکنے کے بعد یہ کہتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہوتی کہ "میں سہرا باندھوں گا ۔"

ماں بہن لاکھ ماں بہن تھیں ۔ لیکن اگر تڑ سے بول دیتیں کہ جب ہمارے دلوں کے ارمان نکلنے کا وقت تھا ۔ اور ہم نے بول بول کر منہ سکھایا تو کلموہے نے سہرا نہ باندھا اور اپنے قدم بہکے ہیں ۔ تو کیسے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے ۔ اس مخمصے میں رات دن الجھے رہتے ۔ کہ اچانک ایک دن اماں ان کے کمرے میں آکر بیٹھ گئیں اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر ذرا مطلب بھرے انداز میں بولیں ۔

" تو یہ میلے کپڑوں کا انبار بھرا پڑا ہے ۔ دھوبی کو کیوں نہیں دیتے ۔"

" ارے ــــ " انھوں نے کھونٹیوں کی طرف دیکھا اور ذرا شرمندہ ہو کر بولے ۔

" ایک بات دھیان میں آئے اور اُسی دم کر ڈالوں تو اچھا ، ورنہ پھر کام کاج میں

دوسرے ہی لمحے بھول بیٹھتا ہوں۔"

اماں نے بڑے غور سے دیکھا۔"ارے میاں اپنے کمرے کی گت تو دیکھ ذرا یہ جالے، یہ کچرا، یہ دھول، یہ پھٹے پھٹائے کاغذوں کے انبار — تجھ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ باقر سے کہہ کر ذرا جھاڑو ہی پھر ڈالے۔ آخر تیرے مقدموں والے آتے ہوں گے تو کیا منہ پر تھوک کر جاتے ہوں گے۔"

رفیق میاں کے چہرے پر شرمندگی چھا گئی

"بولوں بھی تو ایک بار کے کہے میں سنتا ہی نہیں ہے۔ اماں اسے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے اور یہاں کسے اتنی فرصت ہے — اور جب نوکر ایسا کم بخت ہو تو....."

تو اماں نے بات کاٹ دی :"یوں ناک کیوں چڑھاتا ہے تو سیدھے سے شادی کیوں نہیں کر لیتا کہ آپ ہی وہ سارے گھر کی دیکھ بھال کر لے گی۔"

رفیق میاں کے دل کا وہ چراغ جو اتنے دنوں سے مدھم مدھم سی لو دیتا تھا آج پوری چمک دمک سے جل اُٹھا۔

"اب — ؟" وہ ہنسے۔" کون بدنصیب اس بوڑھے کا ہاتھ تھامنا پسند کرے گی — ؟

اماں نے غصّے سے دیکھا۔"اونہہ بوڑھا — یہ کیوں نہیں کہتا کہ مرنے کے قریب ہوں۔ شرم نہیں آتی ذرا سی تیری اور آنو کی عمروں میں ایسا فرق ہی کتنا ہے نگوڑوں نے یہ سفیدی عنایت کی ہے۔

رفیق میاں ہنسے۔

"دیکھ میاں میں عورت ہوں اور عورت کے دل کی بات جانتی ہوں عورت کی فطرت میں خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اُسے خود پالنے پوسنے اور دیکھ ریکھ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ یہ تو اللہ کا بنایا ہوا طریقہ ہے میاں — اگر ایسا نہ ہوتا تو اولاد کو اللہ میاں عورت کے پیٹ کے بجائے مرد کے پیٹ سے پیدا کرتا۔"

رفیق میاں نے ماں کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

"عورت اسی مرد سے زیادہ محبت کرے گی جس مرد کی خدمت کا اسے زیادہ موقع ملے اور پھر یہ تو دلوں کی بات ہے۔ بیٹا عورت کا دل تو بس محبت کرنا جانتا ہے:"

رفیق میاں کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ اماں کا دھیان کدھر ہے۔ آخر یہ تو وہ بھی دیکھتی ہی تھیں کہ بی شوکت نے آئے گھڑی سے چولہا چکی سنبھال لی تھی۔ سب گھر والوں کا ثابت آلوؤں کا قورمہ اور کھڑے چاول کھاتے کھاتے ناک میں دم آگیا تھا۔ اماں بی کے دانت روزانہ شکایت کرتے۔ لیکن چپاتیاں ویسی ہی ہلکی اور پتلی پکتیں کہ کوّوں کے کانوں میں باندھ دو تو آسانی سے لے کر اُڑ جائیں۔ رفیق میاں کو مٹھاس زیادہ پسند نہ تھی۔ لے دے کے ایک سوئیوں کی فیرنی پسند تھی، سو آئے دن ایسی پھیکی پھیکی فیرنی کھاتے کھاتے حلق میں پھندے پڑنے لگے تھے۔ اوپر سے موئی کڑکڑاتی نیکر جھڑک کر کھاؤ تو کھاؤ ورنہ وہ پھیکا گولہ نصیب میں بندھ کر رہ گیا تھا۔ بچپن سے رفیق میاں کو گلابی رنگ پسند تھا۔ گھر میں جتنے بھی دروازے تھے، سبھوں پر اب گلابی گلابی سرسر کرتے پردے جھولتے تھے۔ اب اماں کے دیدے پٹ تو نہیں تھے اور ایسی باتوں کو دیکھ کر تو کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ پانی کا بہاؤ کس طرف کو ہے۔؟ یہ ندی چاہے نکلی کہیں سے بھی ہو مگر بل کھاتی لہراتی آکر رفیق میاں کے قدموں ہی میں سر پٹختی تھی ۔ اور رفیق میاں بھی کہ لاکھ سادھو بنا کرتے تھے کہ کسی پر آج تک اچھی بری نظر نہ پھینکی تھی، اب ایسے دیوانے کاہے سے ہو گئے تھے، کہ بات تو کرتے حوری سے اور نگاہیں کھوجتی رہتیں شوکت کو، بات کرتے میں حوری کے بجائے شوکی، شوکی نکل پڑتا اور حوری ایسی تیز طرار، کہ چار لوگوں کی موجودگی دیکھے نہ جھجکے، صفا بول پڑتی۔ "میں نے کہا جناب میرا نام حوری ہے حوری، شوکی نہیں۔ ۔ شوکی آپ کی وہ بیٹھی ہیں وہاں باورچی خانے میں آٹوا باتی ہوئی ۔"

ہمیشہ تو رفیق میاں بڑھ بڑھ کر باتیں بنایا کرتے تھے۔ مگر آج ان کی زبان کو اماں کے سامنے چپ لگ گئی تھی ۔ بس بیٹھے بیٹھے منٹ منٹ کو ماں کے منہ کو تکتے رہے

"تیری مرضی ہو تو بول دے ۔ ورنہ پھر تو وہ لوگ چلے جائیں گے ۔ وہ تو،
شوکت کا اصرار تھا کہ چھٹیاں گزارنے بھابی کے پاس چلیں تو بہن آگئیں ۔ وہ کدھر
ہم کدھر ۔"
"تو آپ یہ غضب کر دیں گی کہ اپنے گھر بیٹھ کر ہی بات چھیڑ دیں ۔ نہیں اماں بی
انہیں برا لگے گا کہ جس گھر میں بیٹی آئی تھی، وہیں بات چھیڑ دی ۔ آپ جانتی ہیں پرانے
لوگ ایسی باتوں کا برا مانتے ہیں ۔ آپ ان کے یہاں سے جانے کے بعد اُن کے ابا کو خط
کیوں نہ لکھ دیں ۔؟" ۔ رفیق میاں معصومیت سے یہ سب کچھ سناتے رہے ۔ وہ بھول
گئے کہ اُن کے بات کرنے کے انداز نے اماں پر ان کی محبت کا بھید کھول کر رکھ دیا ہے ۔

شوکت کے جانے میں تین چار دن باقی رہ گئے تھے ۔ اس کے قدموں کے ساتھ
ساتھ ان کا دل بھی گھومتا پھرتا ۔ مسکراہٹ ان کے رویئں رویئں سے پھوٹی پڑتی ۔
کیسے سدا بہار گلابوں سے ان کا باغ مہکنے والا تھا ۔
سردی کے دن تھے ۔ آتش دان میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں چٹختیں، یا پھر انگیٹھی میں
سرخ انگارے دہکتے ۔ پان چبائے جاتے ۔ کافی اور چائے کے گھونٹ بھرے جاتے
رات گئے تک باتیں ہوتیں ۔ ایسی ہی ایک رات میں آپا بی کمرے کے گرم ماحول سے اُٹھ
کر باہر کوئلے لانے گئیں ۔ اندر گرمی تھی ۔ باہر سردی نے جیسے ان کا سر جکڑ لیا ۔ واپس
کمرے میں آئیں تو سر پکڑے ہوئے ۔ اماں نے دیکھا تو ذرا فکرمندی سے بولیں ۔
"کیا ہوا بیٹی ۔ ؟"
"کچھ نہیں اماں ۔ ایسے ہی اچانک سر میں درد ہونے لگا ہے ۔ جنے ہوا لگی
یا کیا ہو گیا ۔ ابھی تو بھلی چنگی تھی ۔"
ماں نے ماتھے پر ہاتھ رکھا ۔ جو ٹھنڈا ہو رہا تھا ۔ رضائی اُڑھا کر لٹا دیا ۔ صبح
سے وہ گھر کے کاموں میں اُلجھی رہی تھی ۔ کبھی کھلے آنگن میں بیٹھ کر گیہوں پھٹکے، تو

کبھی چاول صاف کئے ۔ برتن دھو دُھلا کر رکھے تو مرچوں کے ڈنٹھل توڑنے بیٹھ گئیں کمر میں سخت درد ہونے لگا۔ گھنٹے بھر میں بخار اچھا خاصا تیز ہو گیا۔ سارا گھر آپا بی کی تیمار داری میں جُٹ گیا۔ سوائے زہرہ دلہن کے۔ وہ ادھر قیامت گزر جائے تب بھی اپنے دالان سے نہ نکلتیں۔ بُرائی کا بیج جو اتنے زمانے پہلے دل کی زمین میں بویا گیا تھا، اب پھیل پھول کر ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ ان کو آج کے اس بات پر غصہ تھا کہ میں تو میاں والی ہو کر بھی خالی ہاتھ رہتی ہوں اور آپا بی سارے گھر پر راج رچتی پھرتی ہیں ۔ آٹھ چار دن میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی کہ پھر گھر میں ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن گزر گیا ــــ

دوسرے دن بھی بخار میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ جسم تھا کہ پھنکا جا رہا تھا۔ سانس میں آنچ کی سی لپٹیں نکلتیں۔ آنکھیں سُرخ انگارہ ہوئی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر آیا۔ دوا انجکشن سبھی، کر کے گیا، مگر بخار اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں نہ آنکھوں کی سرخی کم ہوئی۔ سر تھا کہ درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا، حوری ماں کے سرہانے بیٹھی تھی۔

"اُف ــ" آپا بی درد سے کراہیں۔

"امّی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

ماں نے آنکھیں کھولیں ــ دل رکھنے کو ذرا مسکرائیں اور بولیں۔ اچھی خاصی ہوں بٹیا، بس سر میں درد بہت ہے۔"

"آپ بستر پر پڑ گئی ہیں امّی تو سارا گھر ہمیں اُداس اُداس نظر آ رہا ہے۔" وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔

"مجھے ہوا ہی کیا ہے ــ" وہ بچوں کا دل بڑھانے کو بولیں ــ "ذرا سر میں درد زیادہ ہے وہ بھی اچھا ہو جائے گا۔"

"بام مَل دوں امّی ۔؟"

"شیشی تو خالی پڑی ہے، رات ہی ختم ہو گیا تھا، رہنے دے یونہی ٹھیک ہو جائے گا۔

"ٹھہریئے میں زہرہ ممانی سے پوچھتی ہوں، ان کے پاس شائد ہے!"
آپا بی منع کرتی رہیں اور وہ دالان کی طرف دوڑ بھی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اُدھر سے تیز تیز آوازیں آنے لگیں۔

رفیق میاں نے سر اونچا کر کے سُننے کی کوشش کی۔ آواز زہرہ دلہن کی تھی۔

"اے ہے درد ورد خاک بھی نہیں۔ اب وہ شوکت بیگم چلی جا رہی ہیں نا، سوچا چولہا چکی پھر نصیبوں میں آگئی تو کیوں نہ بیمار پڑ جاؤں کہ اِدھر میرے گلے سارے گھر کی مصیبتیں آجائیں۔"

حوری کی غصہ بھری آواز آئی ۔

"ذرا چل کر خود ہی دیکھ لیجئے نا۔ مارے درد کے تڑپ رہی ہیں۔"

"اے بی بی درد کی نہ کہو۔ درد آج تک کس کو دکھائی دیا ہے۔ بخار کہو تو ایک بات بھی ہے۔"

"بخار اور کیسا ہوتا ہے۔ جسم تو جلا جا رہا ہے۔"

"سر سے پاؤں تک رضائی اوڑھ کر جسم تپا لیا اور بخار کا نام بدنام۔ ہونہہ!"
حوری تیز آواز سے بولی۔ "ذرا سا بام مانگا تو سَتّر باتیں سُنا ڈالیں۔ نُھوہے بڑے ماموں جان کی کمائی پر اتنی کنجوسی۔؟ اور جو خود کی کمائی......"

ابھی اس کی بات منہ کی منہ میں ہی تھی کہ دھن دھن کی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ ہی گرجدار ڈانٹ ۔

"بالشت بھر کی چھوکری اور زبان اتنی بڑی۔ نکل یہاں سے بدتمیز کہیں کی۔ اور خبردار جو کبھی اِدھر کے دالان میں پاؤں بھی دیا۔ ٹانگیں چیر ڈالوں گا کمبخت کی۔"
آواز اَلّو میاں کی تھی۔

حوری سُرخ سُرخ آنکھیں اور بجھا ہوا چہرہ لئے سسکتی ہوئی آکر بڑے ماموں سے لپٹ گئی۔

"کیا ہوا بی بی - کیوں روتی ہے حوری -؟"

حوری نے ہچکیاں لے لے کر روتے روتے سنانا شروع کیا۔

"ماموں جان - ماموں جان - ہم ذرا امّی کے لئے بام مانگنے گئے تو زہرہ ممانی نے سو باتیں سنا ڈالیں - اور غصّے میں آکر ہم نے کوئی جواب دے ڈالا تو چھوٹے ماموں نے آکر دھن دھن چار چھ تھپّڑ مار دیئے -" وہ روتے روتے اور زور سے ان سے چمٹ گئی اور بولی۔

"اچھا ہوا آپ نے شادی نہیں کی، ورنہ بڑی ممانی کی باتوں میں آکر آپ بھی ہمیں چھوٹے ماموں کی طرح مارتے، ہمیں ڈانٹتے۔ پھر تو کوئی بھی ہمیں پیار کرنے والا نہ ہوتا۔ زہرہ ممانی بے حد بُری ہیں - اچھا ہوا......"

وہ سُنہری چراغ جو زندگی بھر کے اجالوں کا امین تھا، حوری کے آنسوؤں سے اُسی دم بجھ گیا۔ سارے میں اندھیرا پھیل گیا۔ اور رفیق میاں اسی ایک لمحے میں اَسّی برس کے بوڑھے بن گئے۔

جھریوں بھرا ہاتھ وہ حوری کے سر پہ رکھ بولے

"مت رو بیٹی - مت رو - میں تو تجھ سے محبت کرتا ہوں نا - میں تو تیرا اچھا ماموں ہوں نا - میں نے تو کبھی ....."

برآمدے میں ہوا کے سرد جھونکے آرہے تھے - اندر کمرے میں شوکت اپنی بجلی بھری نگاہوں سے رفیق میاں کو تاک رہی تھی - اک دم رفیق میاں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھام لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے

-" اماں - یہ دروازہ بند کر لیجیے -"

شہرِ ممنوع

سارا جھگڑا یہ تھا کہ نوری کی گوری گوری پنڈلی پر ایک کالا کالا تِل تھا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی بہتوں کی پنڈلیوں پر تل ہوتے ہیں۔

اصل جھگڑا یہ تھا کہ مدن میاں نے نوری کی پنڈلی کا تل دیکھ لیا تھا۔ اصل جھگڑا یہ بھی نہ تھا۔ بات در اصل یوں تھی کہ نوری کی پنڈلی کے تل سے مدن میاں نے اور بھی کئی سلسلے ملائے کچھ یوں سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ نوری کے اور بھی کئی جگہ تل ہوں۔ مثلاً کھلے گلے کے کرتے میں سے جو گوری گوری گردن نظر آتی ہے، اس کے آثار پر کسی خوبصورت سے نشیب میں کوئی چم چماتا تِل ہو؛ بس ادھر ادھر کے خیال جو آتے چلے گئے تو انھوں نے کہہ سن کے اپنی اماں کو راضی کر لیا اور پندرہ ہی دنوں کے اندر چٹ منگنی پٹ بیاہ کروا لیا۔

اور یہ سب کچھ ہوتا بھی نا اگر اس دن مدن میاں کا اوبدا کے نماز پڑھنے کو جی چاہ جاتا لگ بھگ چار پانچ بجے کے انداز میں انھوں نے عصر کی نماز کے لئے لوٹا اُٹھایا۔

...... پانی بھرا اور بیچ آنگن میں جا بیٹھے۔ آنگن کے بازو دیوار تھی۔ دیوار سے لگ کر بیری کا چھتنار درخت تھا۔ جس پر دنادن پتھر برس رہے تھے ایک بیر پٹ سے آکر ان کے سر پہ پڑا

Scanned with CamScanner

انھوں نے سر نیہوڑا لیا۔ دوسرا بیر حپٹ سے آکران کی پیٹھ پر گرا۔ انھوں نے تن تنا کر منہ پھیر کر ایک آدھ گالی بکنی چاہی تھی کہ تڑ سے ایک بیران کی ناک پر آگرا۔ اب تو ان کا ڈول چھلک گیا چلا کر بولے:-

کون تیس مار خانم ہے یہ ــ؟ ٹانگ سیدھی کر دوں گا ابھی آکے۔

معلوم تھا گھر میں سوائے لڑکیوں کے ایسی مستی کوئی نہیں مچاتا۔ دھوپ کی سناتی دوپہریں ہوں، یا جاڑوں کی برفیلی چاندنیاں، یہ چھوکریاں سدا کرکٹے لگاتی پھرتیں۔

مدن میاں کے جواب میں ادھر سے ٹھُن ٹھُناتی ہوئی نوری آئی ــ نیلی شلوار جس کے پائنچے چڑھائے ہوئے ــ لال کھلے گلے کا کرتا۔ لال اوڑھنی، آتے ہی بولی:-

"ہاں، ہاں جھڑائیں گے بیر۔ تمہارا کیا جاتا ہے جی ــ؟ بڑے آئے ٹانگ سیدھی کرنے والے ــ"

"اچھا ــ تیری اتنی بڑی زبان ــ؟ ٹھہر تو سہی ــ"

مدن میاں ڈری گرمی میں آستین چڑھاتے ہوئے نوری پر لپکے۔ سوچا ہوگا نوری آتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوگی ــ مگر وہ تو ویسے ہی تنی کھڑی رہی۔ انھوں نے اس کی چٹیا گھسیٹ لی ــ "اب بول کرے گی زبان درازی ــ ایں ــ؟"

"اوں ــ اوں ــ" وہ چلائی ــ بڑے کہیں کے آئے ــ اس دن بھی لے کے اتنا مارا اور آج بھی چٹیا نوچ ڈالی ــ ابھی اماں سے جا کر کہتی ہوں ــ"

مدن میاں سٹ پٹا گئے "یہ پرکالہ چھوکری اب خالہ بی سے جانے کیا کیا جا لگائے" ذرا نرم پڑ کر بولے۔

"کہاں مارا تمہارے میں نے؟"

"ہاں ہاں ــ اس دن آنگن میں ــ "چڑی چھپاکا" کھیل رہے تھے تو کس نے اتنا بڑا تبڈا پھینک کے مارا تھا ــ؟ ایکدم وہ تیکھی ہو کر بولی ــ "کیوں جی یہ آنگن تمہارے باپ کا ہے ــ؟"

مدن میاں صاف مکر گئے "جھوٹ بکتی ہے۔ میں نے تجھے تو کیا آج تک کسی نوکر کے بھی پتھر نہ مارا ہوگا۔"

"اوں ــــ جھوٹے کہیں کے۔ یہ دیکھو تو ــــ" اور اس نے جھٹ اپنی نیلی شلوار کا پائنچہ گھٹنوں تک چڑھا لیا۔

"یہ دیکھو یہ نیلا نیلا نشان۔ پتھر کی چوٹ کچھ کم نہیں ہوتی جی، ــ ہاں ــ!"
وہ کمبخت تو پتھر کی چوٹ بتا رہی تھی اور یہاں دل چوٹ کھا گیا۔ بڑی اجلی، دُھلی دھلی سی پنڈلی تھی ــ اور غروب ہوتے سورج کی پیلی پیلی دھوپوں میں نہا کر تو سونا جیسی بن گئی تھی نیل دیل کچھ بھی نہ تھا، ہاں ایک تل ضرور چمک رہا تھا ــ کالا، کالا۔
اور قبل اس کے کہ مدن میاں کچھ سنبھلتے یا حیلے مٹولے سے ابھی تھوڑی دیر اس کی پنڈلی ہی دیکھتے رہتے ــ وہ بیر پٹختی تینوں بیر سمیٹتی، اپنی لال لال اوڑھنی کا آنچل لہراتی، یہ جا، وہ جا
مدن میاں کئی منٹ تک تو وہیں کھڑے رہے۔ عصر کا وقت ٹلا جا رہا تھا۔ بڑبڑا کر نماز کو چلدیئے۔

ایک تھی شہزادی

"ہا ــ بیچاری ــــ" دادی بی کو شہزادی پر بڑا ترس آیا۔ سر وتہ ٹیخ کر وہ ساکت سی ہوگئیں
"تو آگے ہوا کیا ــ؟" کسی نے بیچ میں ٹوکا دیا۔
"ارے ہوتا کیا ــ؟" نصیبوں جلی کی قسمت میں تو ٹھوکریں ہی لکھی تھیں۔ کبھی تو بھول کے مسکرانا نصیب نہ ہوا اس کو ــ!

"بھئی اللہ ــ دادی بی ــ آپ تو ایسے ترس کھا رہی ہیں۔ وہ سچ مچ کی ہی شہزادی تھی جیسے ــ پھر آگے سُنایئے نا۔

"کیا سُناؤں؟ مجھے نیند آ رہی ہے اب" دادی بی نے منہ پھاڑ کر جمائی لی۔
"دادی بی اگر آپ نے کہانی پوری نہ کی نا تو یاد رکھئے ہم کل آپ کا پاندان چھپا دیں گے

پھر لیتی رہیئے گا جمائیاں ۔ ہاں !"

بی دادی نے پھر ڈوری پکڑی ۔

"اے ہے بڑی کرموں جلی تھی ۔ پیدا ہوتے وقت کوئی منحوس مارا کھڑا ہو گا۔ تبھی تو، اب آجا کے رانی کو یہی سوجھا کہ نہ سہی کوئی شہزادہ ۔ کسی وزیر زادے ہی سے نکاح پڑھوا دیں۔ اے کرتی بھی کیا بیچاری ! بال جو پکتے جا رہے تھے شہزادی کے ادھر رانی چپکے چپکے راجہ کی جان کھاتی ۔" اجی سنتے ہو ! لڑکی دکھائی نہیں دیتی سامنے ؟ جیسے سفید دانت ہیں ایسے ہی سفید بال بھی ہو لیں تب اٹھانا ۔ ہاں آگے تم جانو۔"

مگر راجہ کہاں سنتا اس کی بات ، وہ تو محل میں بھی بھولے بسرے ہی آتا ۔

" تو دادی بی، ۔ بیچ میں شجو بی نے بات کاٹی ۔" آخر اس غریب شاہزادی کی شادی ہوئی بھی کسی سے ۔؟"

"اے لو اور سنو ۔ کہانی کا انجام پہلے ہی سنا دیا تو کیا مزہ رہا ۔ ؟ ویسے تھی نصیبوں کی پوری بیچاری ۔

" ہاں تو رانی نے سوچا کہ یوں تو بات نہیں بنتی ایسا کریں گے کہ ایک دن ......"

" اجی سنتی ہو بھابی جان ! وہ مدن میاں نے اپنی خلیری بہن نوری سے شادی رچالی"

" ہائیں ۔ ؟ کیا کہتے ہو میاں ۔ ؟ " وہ نیند میں جھپکیاں لیتی پڑی تھیں ۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں ۔ "ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا ۔ ؟"

" ہو سکنے کی بات تو جانے دیجئے ۔ ہو چکا ہے !"

بڑی چچی چڑ کر بولیں :۔" موئی گن کی نہ ڈھنگ کی ، کس بات پر ریجھ گئے صاحبزادے سارا دن تو گلی کے پوتوں کے ساتھ ہڑبونگ مچاتی پھرتی ہے ۔ دکیسا زمانہ آ گیا ہے ۔ بچپن کی نسبت بغیر پوچھے گچھے توڑ پھینکی ، موئی نسبت نہ ہوئی پتنگ ہوئی ۔ جب دل چاہا ۔ اتار لی ۔ مگر یہ ہوا کیسے ۔ ؟

" بھائی جان ۔ اب لیلی کا جوڑ مل گیا ۔ جو ہونا سو ہوا ۔ مگر اب ہماری شجو ماں کا کیا ہو گا

اور پھر شجو ماں کی وجہ سے ربو ماں کا کیا بنے گا۔ ربو کے سسرال والے تو یوں ہی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں۔ جیسے تیسے تھاپ ُٹے دے کر انھیں روکے ہوئے تھے۔ اب تو وہ صاف کہہ دیں گے ۔۔ نا بابا، ہم اور انتظار نہیں کر سکتے ایسے کیا ہیرے جڑے ہیں تمہاری بیٹی میں، کیوں جھوٹ کہتا ہوں ۔۔؟"

بڑی چچی نے بڑی حسرت سے شجّو ماں کی طرف دیکھا۔ جو بدنصیب شہزادی کی کہانی، آنکھوں میں نمی لئے سُن رہی تھی۔

ابھی شجو ماں بغدادی قاعدہ ہی پڑھتی تھی کہ مدن میاں سے بات پکّی ہوگئی۔ رَبّو، جو شجّو ماں سے لگ بھگ تین برس بعد پیدا ہوئی تھی ابھی بالکل گڑیا جیسی تھی۔ مگر وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کو منگنی ہوئی تھی ادھر بغدادی قاعدہ سامنے دھرا ہوتا اور ادھر شجّو ماں کی مدن میاں سے نوک جھونک چلتی رہتی، پہاڑے یاد ہوتے رہتے اور مدن میاں سے ٹھولا ٹھالی چلتی رہتی دیکھنے والے دیکھتے رہتے اور ہنس دیتے۔ بڑی چچی کہتیں:۔

"اے تمہارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے ہنسی آتی ہے نا۔ ہمارے ماموں تو اپنی ہونے والی دلہن کو گودوں میں اُٹھائے پھرتے رہتے ہاں اور کیا! اور بھئی یہ تو ہونا چاہیئے میاں بی بی کی عمر میں اور کچھ نہیں تو دس برس کا فرق تو ہو۔ ورنہ یہ کیا ہے ۔؟ بی بی صاحبہ کے تو دانت بھی کھل کھلے ہوگئے اور میاں ہیں کہ وہی تنی ہوئی کاٹھی اور کوے کے پروں ایسا سر لئے گھوم رہے ہیں۔ اسی سے تو نا چاقی بڑھتی ہے۔ میاں تو دیکھنے میں جوان اور بی بی بوڑھی ۔۔ یوں نظروں سے بی بی گرے تو رنڈی کی ہنڈی تو تیار ہے ہی۔ مرد کی کاٹھی کو عورت کہاں پائے۔"

مدن میاں اور شجو ماں کا بھی اچھا خاصا فرق تھا۔ سب کے ساتھ شجو ماں بھی اپنا بھولا بھولا منہ اٹھا کر انھیں مدن بھائی کہتی ۔ مگر کوئی نہ کوئی اسے ٹھوکا دے ہی دیتا۔

اری کل جبھی! بھائی پکارتی ہے ہونے والے دولہا کو۔۔"

اب شجو ماں کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ دُلہا کیا ہوتا ہے مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ دولہے کے

نام پر شرمایا جاتا ہے ۔ بس وہ گٹھڑی سی بن جاتی ۔

مدن میاں وکالت پڑھ رہے تھے ۔ گویا بڑی انہونی بات کر رہے تھے ، مگر ساس سسرے خوش تھے ۔ پڑھے لکھے داماد تو ان دنوں بولتی سپاری اور ہنستی لونگ کی طرح عنقا تھے اب یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ شبو ماں کو تو وکیل دولہا ملے اور ربو بیچاری کو جاہل جٹ ، گنوار کا لٹھ ماں تو یہی سوچ کر نڈھال ہوئی جاتیں کہ کیسے یہ سیوٹ نبھے گی ۔ ؟ کیونکہ اور کچھ نہ سہی ربو خیر سے بغدادی قاعدہ اور کلام مجید تو پڑھ ہی چکی تھی ۔ دو کتابیں اردو کی اور پھر دس تک پہاڑے بھی تھے ۔ تو یاد تھے اُسے !

ادھر شبو ماں نے سولہویں میں اور ربو نے تیرہویں میں قدم رکھا نہیں کہ ادھر سے ربو کے سسرال والوں نے اودھم مچادی ۔

" اے ہے دیکھو تو سہی ! جان جوان بیٹی یوں ہی بٹھال رکھی ہے ۔ آخر کب تک اٹھانے کا ارادہ ہے ۔"

پیغام تو دونوں کے موجود تھے مگر مدن میاں کی اماں کہتی تھیں ، اماں کیا کہتی تھیں خود مدن میاں کہتے تھے کہ پہلے ایل ایل بی کی خلعت پہن لیں ۔ پھر کرلیں گے شادی وادی بھی ۔

ربو کے سسرال والوں نے کیا کیا گھائیاں نہیں گھالیں ؟

" اے ہم تو پچھتائے ان کے گھر بیٹی اٹھا کر ۔ نوج کوئی اس عمر کو ٹل جانے دے ۔ اب تو مانگ سے باندھ رکھا ہے ۔ پھر ڈھلتی میں اُٹھانا ۔ "

بڑی چچی نے انھیں بڑی صلاحیت سے ٹلا دیا ۔

" بات کرتے میں تین برس نکل جائیں گے ۔ پھر دیکھو دو منڈوے ساتھ ہی ساتھ پڑیں گے "

اے بہن ! تم اپنی والی ہو ، ذرا سوچو تو سہی ۔ چھوٹی کو وداع کر کے بڑی کو نہ اُٹھایا تو کہنے والے کیا تھوکیں گے میرے منہ پر ۔ کہ ہو گا بڑی میں کوئی عیب ۔ تبھی تو چھوٹی کو اُٹھا دیا ۔ اب اللہ مجھے تم لوگوں سے کیا پردہ ۔ بس ایک ہی مجبوری ہے ۔ اور اتنا تو تمہیں معلوم ہے کہ کرنے دھرنے والی اکیلی میں ہی میں ہوں ۔

یہ بڑی چچی کے میاں سید رزاق بھی بڑے گنوں کے تھے۔ اب بڑھاپے میں آکر بڑے ہی سیدھے بن گئے تھے ۔ کیا کیا جلاپے انھوں نے بڑی چچی کو نہیں دیئے ؟ بس کھولتے پانی میں ڈال کر جوش تو نہیں دیا۔ باقی سب کھیل کھیل ڈالے۔ ساس نندیں تو بیٹے بھائی کے کرتوت سے کاہے پردہ اٹھاتیں۔ مگر چھوٹی نند نے بھولپن سے ایک بار کہا بھی تھا کہ:۔

"بھائی میاں نے گوری بھاوج کے چرکے بھی لگائے تھے دست پناہ سے۔"

اب جھوٹ سچ تو اللہ ہی جانے کہ اس جھنجٹ کے پیچھے کیا گل کھلے ہوئے تھے" بات وہی ایک بات عشق اور محبت کی یہ وارداتیں، آج کل سے نہیں ،اس گھڑی سے چلی آرہی ہیں۔ جبکہ آدم نے بیوی حوا کی کھوج کی تھی، یہ رزاق میاں اپنی ماں کی گوری چٹی پکے پان جیسی اصلی بھانجی کے لئے وقف تھے۔ اب بہن دل پر کس کا بس چلا ہے ؟ یہ کھیتوں پر نگرانی کے لئے جاتے تھے وہیں جھونپڑیا پر کلوے کسان کی لونڈیا سے آنکھ لڑ گئی۔ ان کا تو کیا گیا ،برس پیچھے وہ ضرور ایک حرامی پلے کی ماں بن گئی۔ اس کو تھاپ پر تھاپ دیئے جاتے تھے کہ بس شادی کروں گا تو تجھی سے ورنہ زہر کھالوں گا۔ اس بیچاری کو تو یوں ہی برادری والوں نے نکال باہر کیا تھا۔ کرتی بھی کیا۔

" اب ادھر ماں باپ نے شادی کی بات اٹھائی۔ پہلے والے تو اپنی بات کے پورے ہوتے تھے۔ رزاق میاں کی ایک نہ چلی۔ باپ نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ" اسلام میں چار چار جائز ہیں۔ ارے میاں بہت ہوا تو اس سے نکاح پڑھوا لینا۔"

مگر کھلے بندوں چھٹی تو انھوں نے کبھی نہ دی۔ سید تھے۔ بات کیسے گرنے دیتے؟

بڑی چچی بیاہ کر بھی آگئیں مگر میاں کے تیور وہی رہے۔ اب بھی لپ جھپ کر جھونپڑیا پر جاتے۔ مگر مارے باندھے کے چار چھ بچے بڑی چچی سے بھی ہو گئے۔ یہ بیچاری بڑی صابر تھیں کبھی منہ سے نہ پھوٹتیں۔ جو پڑی وہ جھیل گئیں۔ کبھی بھولے بسرے ایک حرف شکایت کا زبان پر لاتیں بھی تو سننے والیاں یوں اچھالیتں۔

" اے واہ .یہ اچھی سنائی بوا۔ امحبت نہیں، پیار پیرت نہیں تو پھر یہ بچے کیسے ہوئے"

بڑی چچی ایک بار تو جل کر بول گئیں "اے بچوں کا نہ کہو۔ بچے تو کتے بلیوں کے بھی

ہو جاتے ہیں ہمارا کیا ہے ؟"

پورے سسرال میں وہ تھرڈی ہوئی کہ بڑی دلہن نے تو اپنے بچوں کو کتے بلیوں کے مقابل بٹھا دیا ۔ ایمان کی بات تو یہ تھی کہ کتے بلیوں کی بھی تو اپنی مرضی ہوتی ہوگی ۔ یہاں تو یہ حال تھا دادا حضرت زبردستی اندر بھیج کر باہر سے کنڈی چڑھا دیتے اور مارے باندھے کے جوں توں رزاق میاں کو رات بی بی کے ساتھ بسر کرنی پڑتی ۔ مگر سورج شام کو ڈھلتا ہی ہے ۔ دن بھر کتنا جگمگا لے اب تو رزاق میاں راستے پر آ گئے تھے ۔ جھونپڑیا والی سے بھی نیچے اوپر تین تین بچے ہوئے ۔ مگر پچھوڑی ہوئی ہڈی کو کون دسترخوان کی زینت بنا لیتا ہے ۔ ؟ دودھ جیسا بے داغ اور سنگ مرمر ایسا پتھریلا اور سفید جسم جب تک ساتھ دے گیا ۔ دے گیا ۔ پھر وہ آپ ہی آپ دل سے نظروں سے اُتر گئی ۔ گاؤں کے حاکم تھے کس کی مت ماری گئی تھی کہ فضول پوچھ گچھ کرتا پھرتا ۔

یوں تو ربو کے سسرال والے اس گھڑی مان گئے ۔ مگر اُدھر مدن میاں نے وہ ترقی پسندی دکھائی کہ بڑی چچی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ۔ اب تو کوئی ٹھور ٹھکان بھی نہ تھا ۔ منگنی ہوئی لڑکی کا پیغام ٹوٹ جانا تو یہاں ایسا سمجھا جاتا کہ حرام کا پلہ جننے والی اس سے اونچی تھی لوگ باگ یہی پوچھتے کہ آخر ایسی کون سی خرابی تھی کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹ گئی ۔ پھر وہ غیر کفو والے ہی بیاہ لے جائیں ۔ اپنے والے تو بھول کے بھی نہ کرتے ۔ بلکہ موقع ملے تو اور پرزے اُڑاتے اور یہاں تو سوال بڑی بیٹی کا آ پڑا تھا ۔ ربو ہوتی تو ایک بات بھی تھی ۔ وہ پھر بھی چھوٹی تھی ۔ پہلے تو نجو ماں یونہی بڑی اور اس پر سے پیام بھی جاتا رہا ۔ بڑی چچی تو حواس ہوتے بھی پاگل ہو کر رہ گئیں ۔ بلو پسار پسار کے مدن میاں کی کڑیل جوانی کو کوسنے دیتیں ۔ پھر آ جا کے نوری پر صلواتیں پڑتیں ۔

"اے بی ہمیں سب معلوم ہے ۔ آج کل موا یہی چلن ہو گیا ہے ۔ کھلے بندوں چڑھاوے کے بیلوں کی طرح جوان ہیلاٹ لڑکیاں چھوڑ دیتے ہیں ۔ آپ ہی لڑکوں کی نگاہ پڑے گی اور من مانی کریں گے ۔ کیا ہم نے دیکھا نہیں اتنی بڑی سنڈی کی سنڈی آنگن بیچ کدکڑے لگاتی پھرتی تھی ۔ اب میں کہوں خالہ کا چھوکرا ہوا تو کیا غضب ہو گیا ۔ ہے نامحرم ۔ معلوم ہے جی ۔

یہ سب چال پہلے ہی چلی ہوئی تھی۔"

اب یہ تو اوپر والے کو ہی معلوم تھا کہ چال واقعی چلی ہوئی تھی یا اچانک ہی وہ سیاہ تل شجوماں کی تقدیر کی سیاہی بن کر ان کے وجود کو کھا گیا۔ مگر کوسنوں سے ہونا بھی کیا تھا۔؟ چڑا تو ہاتھ سے اڑ گیا تھا!

کاگا رے کاگا — تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا۔
میرے بھاگوں کوئی مہمان آتا ہو تو — تو — اڑ جا

"ہائے بیچاری شہزادی روزانہ محل کے چھجے پر کھڑی ہو کر یہ آواز لگاتی۔ سینکڑوں کوے منڈیر پر بیٹھے کے بیٹھے ہی رہتے کوئی بھی تو نہ اڑتا۔"

"ہائے، تو دادی بی ایسا کہنے سے کیا ہوتا ہوگا بھلا؟"

یہ ریویو بیچ میں دادی بی کو ٹوک ٹوک دیتی تھی۔

"پھر مجھے ٹوک دیا نا! اری کلموہی، کوے کو پکار کر اس کے پیروں سونے کے دھاگے باندھنے کا لالچ دے کر اس سے پوچھو، میرے گھر کوئی مہمان آنے والا ہے؟ اگر اڑ جائے تو سمجھو بالم کو سندیسہ پہنچانے اڑ گیا۔ اور بیٹھا ہی رہے تو سمجھو بالم ٹالم کوئی ہے ہی نہیں — اڑے بھی تو سندیسہ کسے دے؟ ہاں! اب بیچ میں نہیں بولنا۔ تو بس بیچاری شہزادی کھڑے کھڑے تھک جاتی مگر اس کے نصیب کھلنے تھے نہ کھلے۔ اور بیچاری کو شہر ممنوع میں جانے کی اجازت کبھی نہ ملی۔ اللہ کا نام بڑا۔ اس کا کام بڑا۔ ایک دن۔"

"یہ شہر ممنوع کیا ہوتا ہے دادی بی۔؟" شجوماں نے بہت سادگی سے سوال کیا۔

دادی بی نے یوں ٹوکے جانے پر گھور کر دیکھا، مگر چونکہ شجوماں بہت کم کوئی سوال کرتی تھی، اس لئے پیار سے بولیں۔

"اے تم میں سمجھ بھی کیا! بادشاہ کی مملکت میں ایک بڑا سا باغ نما شہر ہوتا تھا، بڑا رنگ برنگا۔ وہاں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے، جن کی شادیاں ہو چکی ہوں اور پھر وہ جوڑے وہاں ایک رات گزار کر واپس آجاتے تھے اور پھر وہ شہر ان کے لئے شہر ممنوع نہ رہ جاتا تھا۔"

"تو دادی بی وہاں کنواری لڑکیاں تو جا سکتی ہوں گی۔"

"لو اور سنو! وہاں بھلا کنواریوں کا کیا کام؟ شہر ممنوع جو نام پڑا تو تم ایسی کنواریوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ کھلی بستی ہوتی تو کیا بیاہی، کیا ان بیاہی، سبھی دھول اڑاتی پھرتیں، مگر وہ تو شہر ممنوع تھا۔"

"توبہ ہے۔ بیچ بیچ میں سو رخنے پڑ جاتے ہیں۔ ہاں تو اللہ کا کرنا ہوا یہ کہ....."

اسحاق میاں ہمیشہ کلائمیکس کے لگ بھگ پہنچ کر ایک آدھ زوردار ہوائی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بولے۔

"اجی سنتی ہو بھابی! وہ جموں میاں کے ابا ملے تھے۔ ربو کی شادی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ یہ بھی صاف صاف سنا دیا کہ اگر جلد ہی شادی نہ کی تو سمجھو پیام ٹوٹا ہوا ہے۔"

"ہائیں!" بڑی چچی جھپکیاں سی لے رہی تھیں، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔؟"

"ہو سکنے کی بات جانے دو، اور جو ہو گیا تو سر پکڑ کر جھیکتی رہنا۔ میں کہتا ہوں کر ہی دو نا ربو کے ہاتھ پیلے۔ اب اس بیچاری کے نصیب تو دغا دے گئے، تم ہی سوچو۔ ایک تو یوں ہی بیٹھی ہی ہے۔ دوسری بھی چھاتی پر مونگ دلے گی۔ کیوں جھوٹ کہتا ہوں میں۔!"

"نا میاں ــ تم جھوٹ کاہے کو کہو گے! مگر یہ تو سوچو نجو ماں بڑی ہے۔ آنکھوں ہوتے دیکھے گی کہ چھوٹی گھر بار برت رہی ہے۔ بچے کھلا رہی ہے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی۔؟"

"بھابی جان اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، مگر تم گہرائی میں تو جھانکو۔ ایک کے ساتھ دوسری کی بھی زندگی تباہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس کے نصیبوں کا بھی کوئی بلخ کا شہزادہ آ ہی جائے گا۔ ہم ایک گنا فکر کرتے ہیں تو اوپر والا ہزار گنا کرتا ہے۔ ہاں آگے تم سمجھو۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو بیٹھی رہے گی تمہارے کلیجے سے لگ کر ــ شکر میں دب کر مکوڑا مر نہیں جاتا۔"

"کہتے تو ٹھیک ہو میاں۔ ابھی تو اللہ ہی جانے کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے۔ کنواری بیٹی اور پہاڑ کو تو لو، پھر بھی پہاڑ اوپر اوپر اٹھتا چلا جائے۔ پلڑا بھاری ہوتا ہے میاں۔"

اندھیرا

بچپن سے شجو ماں یہی سنتی آئی تھی کہ دو منڈھوے ساتھ ساتھ پڑیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہلدی چڑھے گی۔ مہندی لگے گی۔ اور دونوں ساتھ ڈولی میں چڑھیں گی۔ یہاں تو بیچ ہی میں ڈور کٹ کے رہ گئی۔ کان تو شجو ماں کے بھی تھے بڑے ٹھنڈے دلوں سُنا کہ ربو کی شادی ہو رہی ہے۔ جس کا ابھی صرف سولہواں ہی تھا اور یہاں شجو ماں تو اٹھارواں بھی پھلانگنے کی سوچ رہی تھی۔

سر جھکائے جھکائے شجو ماں نے ربو کی کرتی میں لچکے کا سرا لگایا اور ٹپ سے دو آنسو، اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی گود میں گر پڑے۔ وہ تو اچھا ہوا کسی نے یہ جگنو چمکتے دیکھے نہیں، ورنہ کہنے والوں کے منہ تو بند نہیں ہیں کچھ بھی اُڑ جاتی۔

"ادئی بہن کا سکھ دیکھا نہیں جاتا۔

"منہ زور جوانی ہے، سنبھالی نہیں جا رہی ہوگی۔"

وہ تو پہلا تیر تھا جو اس کے دل کو چھید گیا۔ اب تو یہاں دھڑا دھڑ چولیاں سل رہی ہیں اس پر بانکڑی ٹنک رہی ہے۔ کھڑے دوپٹے چنے جا رہے ہیں اور کرن ٹنک رہی ہے ــــ کرتے قطع کئے جا رہے ہیں اور گلے مونڈھے ٹنک رہے ہیں اور ان سب کاموں میں شجو ماں آگے آگے ہے۔ ربو تو دن رات پلنگ توڑتی یا پھر سکھی سہیلیوں سے کھسر پھسر کرتی رہتی سارا کام شجو ماں کے سر تھا۔ گھڑکیاں بھی سن رہی ہے۔ جا بے جا پڑتال بھی پڑ رہی ہے۔

"اے ہے شجو ماں! یہ دیکھو مونڈھے کے پاس سے لہر ٹیڑھی ٹانک دی۔"

"اے بی تمھیں آنکھیں نہیں ــ؟ یہ بانکڑی میں نے تمھیں کرتی پر لگانے کے لئے دی تھی ــ"

سرسر دن گزرے جا رہے تھے۔ جیسے پروائی کے جھونکے۔ دیکھتے دیکھتے شادی کا بھی دن آ گیا۔ شجو ماں نے اپنے ہاتھوں دلہا میاں کی سلامی کی تھالی سجائی۔ ادھر ربو دلہن بنی بیٹھی تھی اور آج کئی دنوں بعد پھر شجو ماں کی آنکھیں برسے جا رہی تھیں کون جانے یہ آنسو بہن کی جدائی پر

تھے یا اپنی بدنصیبی پر !

مہمان بی بیاں اُترتیں ۔ جان بوجھ کر بڑی چچی کے پاس رکتیں اور پوچھتیں

" اوئی بہن ، ہم تو سدا سے سنتے آرہے تھے کہ دو منڈوے پڑیں گے ۔ ہوا کیا ؟"

" اے بہن یہی وہ تمہاری بیٹی ہے جس کا ناتہ ٹوٹ گیا ۔"

"بڑی چچی چوٹ بنی ادھرادھر منہ چھپاتیں ۔ بہالوں سے منہ پھیر پھیر کے آنکھیں پونچھتیں اور ادھر شجو ماں پھرکی بنی سارا کام نبیڑ رہی تھی ۔ ہر احساس سے عاری ۔ ابھی جہیز کے کمرے میں ساڑیاں لائن سے جما رہی تھی تو ابھی باورچی خانے میں کھانے والوں کی خبر لینے جا پہنچی ۔ ابھی پھلواری سے سہرے کے لئے پھول لے رہی ہے تو ابھی عود دان میں انگارے لئے ربو کے بال سکھانے لپک رہی ہے ۔

شجو ماں کی نیند سے آنکھ کھلی تو کب کھلی ، جب میراسن نے ڈھولک پر تھاپ دی ۔

" تاروں میں جلوہ دو مت بابا ۔ جلدی گھر کو جانے دو ۔"

" سلامی کی تھالی لئے وہ بیر جھیر چلی جا رہی تھی اک دم اس کے قدم ٹھٹھک گئے ۔ ساتھ کی سکھی سہلیاں سب ربو کی جان پر ٹوٹ پڑ رہی تھیں ۔ جہاں آراء جس کی شادی کو سال بھر ہو گیا تھا اور اب تو گود بھی بھری پڑی تھی ، ربو کو ٹھیل رہی تھی ۔

" اری سنتی ہے ۔ جلوے میں اتنی بھی دیر نہ ہو ۔ ادھر بنے میاں انتظار جو فرما رہے ہیں"

ربو گٹھڑی تو تھی ہی اور بھی سمٹ گئی ۔

" اری یہ سب چالیں ہیں ۔ کوئی دوسری بولی ' ہم سب سمجھتے ہیں ۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ کب جائے اور کب دولہے میاں کو اپنے ہاتھوں پان بنا کر کھلائے ۔"

شجو ماں کے قدم سو سو من کے ہو گئے

" تجھے قسم ہے ربو جو دو گھنٹے خوشامد نہ کروائی تو ۔"

" ارے یہ رات ایک ہی بار تو آتی ہے ۔"

چھن چھن ...... چھن ... چھن ... تھالی گر گئی اور سلامی کے روپے پورے کے پورے

مع چکنی الائچی، لونگ کے برآمدے میں بکھر گئے۔

پھر شجو ماں کو معلوم نہ ہو سکا کہ کب ربو کی رخصتی ہوئی۔ واقعی تاروں کی چھاؤں میں ہوئی یا ابھرتے تاروں میں ہو کر وہ جلد ہی خوشامد کروانے چلی گئی۔ جب شجو ماں کو ہوش آیا تو اس کی آنکھوں تلے سیاہ سیاہ گھیرے تھے۔ دل چلتے میں رہ رہ کے زور زور سے دھڑک اٹھتا، چکر آتے تھے۔ ادھر ربو تھی کہ شادی کو ڈیڑھ دو ماہ بھی نہ ہوئے تھے۔ رتجگیاں بھی پوری نہ ہوئی تھی۔ شرم بھی نہ ٹوٹی تھی ساس نندوں سے کہ گھونگٹ کا پردہ اُٹھا اُٹھا کر وہ ابکائیاں لینے اور قے کرنے لگی

ربو کے میاں شہر میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ ہفتہ میں چار دن باہر گزارتے۔ چار دن گھر پر رہتے۔ داماد آتے تو شجو ماں ہی ان کا کمرہ سلیقے سے سجاتی۔ لاکھ صفائی۔ جھاڑ، جھٹکی کرتی مگر ربو صبح اُٹھتی تو وہی مچھروں کا رونا لے کر گال سہلاتی ہوئی زیر لب مسکراتی ہوئی۔

"اپی جان، غضب ہے اللہ کا! یہ مچھر کاہے سے ٹوٹ پڑے ہیں۔"

سلیمن ایک دن دیدے مٹکا کر بولی

"ہاں شجو بی بی، سچ مچ یہ مچھر۔ توبہ ہے! اتنا بڑا مچھر ہے۔ ایک دو نہیں پورے بتیس، دانت ہیں اس کے منہ میں اور کمبخت جب ڈنک لگائے گا تو چہرے پر۔ گالوں پر۔ ہونٹوں پر، کیوں نا ہے نا ربو بی بی ۔ ؟"

ربو بی بی مسکرا کر اور بن کر شرماتی ہوئی اُسے مارنے کو لپکیں اور شجو ماں کی آنکھوں میں رات کی بھرپور سیاہیاں تیر تیر گئیں۔

شجو ماں کو کب تک یوں ہی بٹھائے رکھو گی ۔ ؟ کہیں کر ڈالو نا بہن۔"

"اللہ رکھے چھوٹی تو جھولا جھلانے کو ہو رہی ہے اور بڑی ابھی تک بیٹھی ہی ہے۔"

آنے جانے والیاں جان بوجھ کر، جان جان کر، سوئیاں سی، چبھوتیں اور بڑی چچی کا منہ نہ اُٹھتا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں۔

"سلیمن، توبہ ہے! اتنی شکر کیوں بھر دی حلوے میں ۔ ؟ دیکھتی نہیں۔ ربو کو ابکائی پر ابکائی چلی آ رہی ہے۔"

" ابی بی بی، یہ ابکائی پھیکا کھانے سے نہیں رکنے والی ہے۔ ہماری بی بی کی اللہ رکھے گود ہری ہونے والی ہے۔ سلیمن ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔

ننھو ماں اپنی بڑی آنکھوں میں حیرت لئے کبھی رلو کا منہ دیکھتی تو کبھی سلیمن کا۔ دوسرا قدم جو اس کا اُٹھا تو وہ مشین پر جا بیٹھی۔ دبلے پتلے کانپتے ہاتھوں سے اس نے پھول دار گلابی ریشم اُٹھایا اور چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرنے لگی۔

بڑھاپا

بلی اور وقت چلتے ہیں تو پاؤں کی آواز نہیں پیدا ہوتی۔ مگر چلتے دونوں ہی ہیں۔ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا، بالکل دبے پاؤں، بلی کتنی ہی اونچائی سے گرے۔ پنجوں کے بل گرتی ہے آواز نہیں پیدا ہوتی۔ وقت اور زمانے کے کوڑے بھی دل پر کیسے ہی برسیں آواز نہیں پیدا ہوتی۔ ہاں آنکھیں ضرور دھندلا جاتی ہیں۔ اور بالوں پر راکھ جم جاتی ہے۔

باورچی خانے سے ننھو ماں نکلی تو سلیمن بولی۔

" بی بی! سر تو جھاڑ لیجئے۔ راکھ جم گئی ہے۔ ننھو ماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مگر یہ آخری تیر تھا۔ چپکے سے یوں ہی ننھو ماں نے آئینہ تھاما تو کئی زمانے اس کی آنکھوں کے آگے سے گزرتے چلے۔ گزرتے چلے گئے۔ گزرتے چلے گئے۔ اور اپنے نظر نہ آنے والے قدموں کی سفید سفید سی دھول چھوڑ گئے جو اور کوئی مناسب مقام نہ پاکر ننھو ماں کے سر پہ جم گئی"

وقت گزرتا ہے تو اپنے ساتھ وہ ولولے اور آرزوئیں بھی لئے جاتا ہے۔ جن سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔ مگر ننھو ماں کا دل کیسا نگر تھا کہ کبھی تو ویران نہ ہوا۔ آگے سے، پچھواڑے سے جہاں موقع ملتا وہ گھر کے چھجے پر چڑھ جاتی اور گھگھیا گھگھیا کر ایک ایک کوے سے مخاطب ہوتی۔

" کاگا رے کاگا! تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا۔

میرے بھاگوں کوئی مہمان ہو تو اڑ جا۔"

مگر سونے کی پائل کا لالچ بھی اُنھیں نہ رہتا۔ مزے سے بیٹھے کائیں کائیں کئے جاتے کوئی تو ایسا نہ تھا جو اُڑ کر پالم کا سندیسہ لاتا۔ اور اس شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے کھُل جاتے۔

"ہا۔ بیچاری۔ دادی کی شہزادی کو اب تک شہزادہ نہ ملا تھا۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے اب بھی پان چباتے ہوئے۔ ہائے۔ بیچاری شہزادی۔" کہہ کر پھر سے کہانی شروع کر دیتیں۔

کبھی کبھی شجو ماں محسوس کرتی کہ اس کہانی کی شہزادی اور کوئی نہیں ہے، وہ خود ہے۔ جسے کبھی شہزادہ نہیں ملا۔ نہیں ملے گا۔ دل میں ڈر لئے کبھی کبھی وہ چاہتی کہ اس کہانی کا انجام پوچھ لے۔

"دادی بی! پھر اس شہزادی کے لئے شہر ممنوع کے دروازے کھلے۔؟" مگر یہاں پہنچ کر وہ آس بھی دھواں بن کے اڑ جاتی تھی جس کے سہارے وہ جی رہی تھی۔ شجو ماں کے منہ کا تالا کبھی تو نہ کھل سکا۔

"ہا۔ بیچاری شہزادی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ گزرا۔ اور ایسا گزرا کہ شہزادی کے بالوں پر برف سی پڑ گئی۔"

شجو ماں نے گھبرا کر اپنا مرجھائے پھول ایسا چہرہ پاندان میں لگے آئینے میں دیکھا۔

"دادی بی۔" وہ چلا اُٹھی۔ "کوئی دوسری کہانی سنائیے دوسری کہانی سنائیے دادی بی یہ کہانی تو برسوں سے ادھوری ہے۔ شہزادی کو شہزادہ نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں ملے گا مجھے معلوم ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے، دادی بی۔"

اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

سہارا

بچپن میں شجو ماں نے بغدادی قاعدہ پڑھا تھا۔ پھر اردو کی چار چھ، کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ماموں، چچا سے پہلے رفت، رفتن کی گردان پڑھی، پھر شیخ سعدی کی "گلستان" "بوستان" بھی پڑھ ڈالی۔ ماں نے منع بھی نہ کیا، کیونکہ معلوم تھا کہ ہونے والے دولہے میاں بھی پڑھ رہے ہیں۔

دو سے شروع کیا اور بیس تک پہاڑے بھی رٹ ڈالے ۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ تختہ ہی اُلٹ جائے گا۔
اور پڑھا لکھا سب خاک میں مل جائے گا۔ اب گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی کام تو تھا نہیں۔ اسحاق چچا کی
بیٹیوں کو الف، بے کی تختی یاد کرانی شروع کردی ۔ اسحاق چچا کی بیٹیوں کے ساتھ کھیلنے والیاں بھی تھیں
وہ بھی پاس آکر بیٹھنے لگیں۔ پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ شجو ماں کی اچھی خاصی جماعت جڑ گئی۔ دس برس
کے اندر کے لڑکے بھی آنے لگے۔ اور یوں ادھر ادھر کے ملا کے بیس پچیس بچے ہو گئے اور شجو ماں باقاعدہ
"آپا جی" بن گئیں ۔ بڑے پیار سے وہ ہر ایک کو بغیر گھُڑکے، جھڑکے پڑھاتی ۔ دل تو سدا کا پھوڑا
تھا دکھتا ہوا۔ جس کا دل دکھا ہوگا وہ کسی کو کیا کچھ کہے گا۔ سارے بچے ایسے ہل مل گئے گویا آپا جی
سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ پڑھانے کا وقت صبح دس بجے سے پانچ بجے تک تھا۔ مگر ادھر
صبح ہوئی نہیں کہ اکدم دو دو تین تین بچوں کی ٹکڑیاں آنی شروع ہو جاتیں۔ اور سب آ آ کے دیوان
خانے میں بیٹھتے جاتے اور شام کو پانچ تو کیا سات آٹھ بھی بج جاتے تو بچے جانے کا نام نہ لیتے
اتنے دل جمعی سے پڑھنے لگے اور گھروں کو بھولتے وقت اتنے ڈھیٹ بن جاتے کہ شجو ماں کو مجبوراً
رات کو بھی پڑھانا پڑتا۔ جس میں دادی بی کی کہانی بھی شامل ہوتی ۔

اتنی مصروفیت میں بھی شجو ماں کو کوئی خیال ایسا بھی تھا کہ کبھی بھلائے نہ بھولتا اور یوں
جیسے وہ بھی نماز روزے کی طرح زندگی کا اہم فریضہ ہو۔ آپ ہی آپ وہ چھجے پر جا کھڑی ہوتی اور
ہولے ہولے پکارتی ۔

"کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا"

کوے دھوم مچاتے "کائیں، کائیں، کائیں ۔۔ مگر وہیں بیٹھے رہتے ۔ بالم کا سندیسہ
کبھی نہ آیا اور اب تو شجو ماں کی آنکھیں بھی روتے روتے دھندلا گئیں ۔ ایک طرف آنسو تھے
ایک طرف انتظار کس کا انتظار ؟ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس روئے جاتی اور پکارے
جاتی ۔ "تو ۔۔ تو اڑجا ۔ کاگا رے کاگا۔"

مگر کوؤں کو چھجے کی منڈیر ایسی بھائی تھی کہ اڑنا تو در کنار کبھی نہ پھٹ پھٹاتے ۔
"ہا ۔ بیچاری شہزادی ۔! بڑی کرموں جلی تھی بیچاری ۔ راجہ رانی کی تو کبھی بنی نہیں

ارے جس کے سر پہ باپ کا سایہ ہو اُسے کاہے کا ڈر — ؟ یہ چھتر چھاؤں تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ مگر راجہ تو بس اپنی ہی جگہ مست تھے۔ اُنھیں کیا فکر! بیچاری باپ کے ہوتے بھی یتیم ہی تھی۔

" وہ کیوں دادی بی ؟ " جماعت کی کوئی معصوم سی بچی پوچھ بیٹھتی۔

.بی دادی گھورتیں — " پھر ٹو کا دیا نہ مجھے —؟ ارے راجہ کی پسند کی رانی کہاں تھی ؟ بس تبھی سے یہ کھوٹ چلی آتی تھی۔ پھر دادی بی اس خیال سے بیگانہ کہ سامعین ننھے ننھے بچے ہیں بکے چلی جاتیں۔

" اور کھوٹ بھی ایسی ویسی تھی! ارے اُلٹے سیدھے دو چار بچے ہی کیسے ہو گئے، سو ہو گئے ورنہ اب تو یہ حال تھا کہ راجا جی اپنی رانی سے باقاعدہ ماں بہنوں جیسا برتاؤ رکھتے۔ ہاتھ تک نہ لگاتے ارے بازو تک نہ بیٹھتے تو بچوں کچوں کا کیا سوال ؛ مزید ثبوت کو وہ سب کی طرف گردن گھما گھما کر دیکھتیں اور ریلیتیں۔

" ارے پاس آکے بیٹھیں گے ہی نہیں تو پھر اولاد کیسے ہو بھائی۔ ہاں تو پھر یہ دوری اتنی بڑھی — اتنی بڑھی کہ راجہ باہر کے ہو کر رہ گئے اور رانی اندر کی — اب ماں کو جتنا درد بیٹی کا تھا اتنا باپ کو کہاں تھا۔ ؟ ماں گھلتی رہتی مگر فکر دور نہ ہوتی —

" ہاں، تو پچھلی بار میں نے کہاں تک کہی تھی کہانی — ؟

" ہاں، تو اللہ کا نام بڑا۔ اس کا کام بھی بڑا۔ ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک مصیبت کا مارا کوئی شہزادہ، شہزادی کے محل تک آنکلا —"

شجو ماں ربو کی چوتھی بیٹی کیلئے اون کے موزے بُن رہی تھی۔ اکدم چونک پڑی۔ سلائیاں اور اون کا گولہ اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا کیا شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے، شہزادی کے لئے کھُل سکتے ہیں —؟

" تو دربان نے آکے اطلاع دی کہ کوئی شہزادہ مصیبت کا مارا آیا کھڑا ہے۔ اور شہزادی کی خدمت میں باریابی چاہتا ہے۔ شہزادی نے اسے خاص اپنے حرم میں بلوایا۔"

"اور اس نے شہزادے سے پردہ نہیں کیا۔ ؟" عائشہ بول اُٹھی جواب دسویں میں تھی۔
اور اسے بار بار سینے پر دوپٹہ رکھنے کی تاکید اور گلی میں نکلنے کی ممانعت کی جاتی تھی۔
"اے تو بی بی اب شہزادی خود جو اتنی سمجھدار تھی، بھلا اسے پردے جھروکے کی کیا ضرورت؟ ہاں تو بھئی شہزادی نے شہزادے کو بلا ہی لیا۔ مگر شہزادی کو یقین نہ ہوا کہ یہ شہزادہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بدن پر بڑے بُرے کپڑے تھے اور سفر سے اس کی صورت بھی بڑی ہونق ہو گئی تھی۔ بال بھی بڑھ گئے تھے۔ شہزادہ تو کیا، ہاں۔صورت سے قیدی ضرور لگتا تھا۔"
دادی بی نے خود ہی زور کا قہقہہ لگایا اور سب کی طرف دیکھا۔ بچے بھی ہنسنے لگے۔ مگر شنجو ماں منہ کھولے کہانی کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔
" اب تم جانو، شہزادی، سو عقلمندوں کی ایک عقلمند، اس نے سوچا۔ اونہہ۔ ایسے نہیں۔اس کا امتحان لیا جائے کہ واقعی یہ شہزادہ ہے۔ بس تو شہزادی نے نوکروں کو حکم دیا کہ راتوں رات کپڑا خرید لائیں۔ ہر ہر قسم کا کپڑا۔ اور اس کے گدے تیار کریں۔ بس بھئی نوکر خریدی کے لئے دوڑے۔ پورے شہروں میں ستر رنگوں کا کپڑا ملا۔ جھٹ پٹ اس کے گدے تیار کئے گئے۔ شہزادے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے گئے اور پھر شہزادی نے بطور خاص یہ اہتمام کیا کہ اپنے ہاتھوں بستر لگوایا۔ معلوم ہے کیسا بستر۔؟"
دادی بی کی کہانیوں میں دل بھر کے ناقابل یقین باتیں ہوتی تھیں۔ پھر بھی سب بڑے چاؤ سے سنتے۔
ہاں تو بستر کیسا تھا۔؟ معلوم ہے شہزادی نے ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے پر تیسرا۔ تیسرے پر چوتھا۔ ایسے ستّر گدے ایک پر ایک رکھوا دیئے اور ان کے نیچے چنے کا ایک دانہ الٹا کر کے رکھ دیا۔"
"چنے کا دانہ وہ کیوں۔؟" ججو حیرت سے بولا
"ارے آگے سنو نا بیچ بیچ میں منہ کیوں مارتے ہو رے۔؟ تو بھئی شہزادی نے چنے کا دانہ ستر گدوں کے نیچے رکھ دیا رات ہوئی سب سو گئے۔ صبح ہوئی شہزادی نے منہ

ہاتھ دھویا نہ کپڑے بدلے اور شہزادے کی خبر لینے اس کے کمرے میں جا پہنچی ۔ پوچھا :۔
"کیوں جی ، آپ کی رات کیسے گزری ۔"
شہزادے نے سر جھکا کر جواب دیا :
"جی رات تو آپ کی بدولت بہت اچھی گزری ، ۔ مگر .... " اور اتنا کہہ کر وہ رک گیا
"کیا ۔ ؟ شہزادی نے پوچھا ۔
" مگر کوئی چیز رات بھر میری پیٹھ میں چبھتی رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں ۔ اس کی وجہ سے میری پیٹھ میں نیل بھی پڑ گیا ہوگا ۔ "
شہزادی نے اس کی قمیص الٹ کر دیکھی تو واقعی پیٹھ نیلی ہو رہی تھی تب شہزادی کو یقین آگیا کہ واقعی یہ سچا شہزادہ ہے ۔ کیونکہ شہزادے اور شہزادیاں ہی اتنے نازک مزاج ہو سکتے ہیں کہ ستر گدوں کے نیچے سے بھی ایک چنا ان کے نیل ڈال دے ۔
جب شہزادی کو پتہ چل گیا کہ یہ سچ مچ کا ہی شہزادہ ہے اور اس نے جھوٹ موٹ نہیں کہا تھا تو شہزادی کے دل میں شہزادے کی محبت پیدا ہوگئی ۔ شہزادی خود اچھی عمر کی تھی اور شہزادہ بھی خاصی بڑی عمر کا تھا ۔ تو تم جانو دھان کا پودا گھٹنے گھٹنے پانی ہی میں پروان چڑھتا ہے ۔ ادھر شہزادی نے یہ چلن اٹھا رکھا تھا کہ چوڑیاں ، زیور اور رنگ برنگی کپڑے وپڑے پہننا سب ترک کر دیا تھا ۔ گویا بیوگی اٹھالی تھی ۔ اب تو اس نے رنگ برنگی ، جھبکا جھبول کپڑے پہنے ، چم چماتی ، کھنکھناتی چوڑیاں پہنیں ، جھومر لگایا ۔ شہزادے نے بھی یہ سب کچھ دیکھا اور اس وقت تو بڑا مزا آیا جب ...... "
اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری ، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بہت تیز لہجے میں بولے ۔
" اجی بھائی جان سنتی ہو ۔ غیر کریں تو پھر غیر ہیں ۔ یہ تو اپنے والے ہیں نا ۔ کیا کیا اتراتے پھر رہے ہیں ۔ سالے کہتے ہیں ..... ایکدم وہ رک سے گئے ۔
"کیا کہتے ہیں ۔ ؟" بڑی چچی نے ہولا کر پوچھا

دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھی شجوماں انھیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آواز نیچی کرکے بولے "کہتے ہیں ربو سدا اپنے میکے رہتی ہے اور وہاں اس کے میاں کا بھی آنا جانا ہے۔"

اور وہ معنی خیز انداز میں خاموش رہ گئے۔

"اور وہ تمہاری میری بہن -" وہ پھر بول اُٹھے۔ "کیسی کدھر کی، کہتی تھی شجوماں کی آنکھوں میں یہ حلقے کیسے پڑگئے ہیں۔ اور کھانا تو برائے نام کھاتی ہے۔"

"میاں -!" بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "اللہ ہی ان سے سمجھے تو سمجھے مگر تمہیں کہو میری شجوماں ایسی ویسی لڑکی ہے!"

"ارے نہیں جی بھابی جان -! میں یہ کب کہہ رہا ہوں؟ میں تو تمہیں ذرا سنانا چاہ رہا تھا کہ تمہارے والے ایسے گنوں کے ہیں۔"

"میاں!" بڑی چچی پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولیں، جس میں گھگھیاہٹ بھی شامل تھی۔ "بلا سے عمر ڈھل گئی۔ آج بھی کوئی ملے تو ہاتھ پیلے کردیں اس کے۔ تمہاری نظر میں کوئی نہیں -؟"

"بھابی جان، بھلے کو شجوماں کوئی حرامی پلّہ ہی جن ڈالتی تو اتنی خرابی نہ ہوتی، مگر منگنی ہوئی بیٹی کی بات ٹوٹ کر تو — اونہوں، یہ تو بڑی ناممکن سی بات ہے۔"

جلتے تیل کی بوندیں سی شجوماں کے کانوں میں گر رہی تھیں۔

"اوہ خدا - یہ جوانی، کیا میں اب بھی جوان ہی دکھائی دیتی ہوں کہ یہ لوگ نام دھرسکیں" اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ ڈھلتا سورج زبان حال سے کہہ رہا تھا "بس شام ابھی ہوا چاہتی ہے۔" پھر یہ دنیا اور دنیا والے۔

اماں نے ایک بار پھوپھی بی کے رنڈاپا چڑھایا تھا۔ پھوپھا میاں راتوں رات چٹ پٹ ہوگئے تھے۔ اماں بی نے پھوپھی بی کی کھنکھناتی ہری ہری چوڑیاں پتھر مار کے پھوڑی تھیں۔ گلابی ریشم کی پھولدار ساڑی نوچ کر بیوگی کی موٹی سی چادر اوڑھادی تھی۔ کالی کالی پوت کا لچھا کھینچ کر گلا سونا سونا کردیا تھا اور کلیاں کرواکے مسی کی دھڑی چھڑوائی تھی۔

"میں بھی رنڈاپا چڑھالوں گی ۔"

مگر وہ کہاں ہے، جس کے نام سے مجھے رنڈاپا اور رنڈاپے کی ویرانی مل رہی ہے ۔ ؟

اس نے بھرے دل سے سوچا ۔ پھر پچھواڑے کے آنگن میں جاکر اس نے پتھر سے کاسنی کاسنی چوڑیاں کرچی کرچی کر ڈالیں ۔ بالوں میں گلابی موباف تھی ۔ اُسے پھاڑ پھینکا ۔ پھر کمرے میں آکر زعفرانی اوڑھنی اتار کر سفید کفنی جیسی موٹی ململ کی اوڑھنی اوڑھ لی ۔

اتنا ہی ہونا تو بس نہ تھا ۔ مگر دوسرے دن سارا کیا دھرا اپنی جگہ رہ گیا ۔

نصیرالدین کا بھانجا بڑا نکھٹو تھا ۔ پڑھنے لکھنے میں بڑا بودا ۔ اسکول میں چھپن مرتبہ تو بٹھایا تھا ۔ مگر اٹھ اٹھ کر بھاگ آتا ۔ نصیر میاں باجری کے بھٹوں کی طرح اسے دنادن کٹھو کتے ۔ آٹھ چوروں کی مار اس اکیلے کو پڑتی، مگر وہ الف، بے کی تختی کے آگے نہ بڑھ سکا ۔ نو برس کا ہو رہا تھا ۔ نویں برس تو بچے چوتھی اور پانچویں بھی پاس کر لیتے ہیں ۔ شجو ماں کی میٹھی زبان کی ہر جگہ تعریف ہو رہی تھی کہ دو کلاسیں ہو رہی ہیں ۔ ماں نے بھائی سے کہا ۔

"بٹھا دو لے جا کے شاہجہاں بیگم کی جماعت میں ۔ لگ جائے گا راستے سے ۔"

نصیر میاں کے دل کو بھی بھا گئی ۔ ستھرے کپڑے پہنائے ۔ بغل میں بستہ دبوا کے شجو ماں کے گھر آئے ۔ دیوان خانے میں اپنی فوج کو پڑھاتی بیٹھی تھی ۔ دروازے پر دستک دی ۔ شجو ماں نے ایک منٹ سب بچوں کو ہاتھ بتا کر خاموش کیا اور دستک دینے والے کو کہا ۔

"اندر آجاؤ ۔"

آگے آگے رؤف میاں اور پیچھے پیچھے ماموں نصیر میاں ۔ ایک دم شجو ماں سٹ پٹا کر کھڑی ہو گئی ۔ الف، بے کا قاعدہ ہاتھ سے گر گیا ۔ اور نگاہیں جھکی جھکی رہ گئیں ۔ سفید آنچل سر پر لرز رہا تھا ۔ اور وہ سمٹی سمٹائی کرسی کا ہتھا تھامے کھڑی تھی ۔

"یہ ..... ب ..... ب ... بچہ پڑھتا ہی نہیں ..... ب ... بالکل وہ ہے ۔"

نصیر میاں کی زبان تالو سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہی تھی ۔

"جی ..... م ..... م ..... پڑھالوں گی ... یہاں تو سبھی ڈھیٹ آتے ہیں ۔" وہ

گھبرا کر ہنس پڑی۔

نصیر میاں بھی مسکرا دیئے۔ "جی ہاں"۔ ذرا دھیان سے پڑھا دیجئے گا۔ آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔" اور وہ سلام کرکے، جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئے۔

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے!"

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے!!"

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے!!!"

شجو ماں کے دل سے ایسی خوشی پھوٹی کہ وہ پاگل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

"ہاں بچو، تم نے بھی میری تعریف سنی ہے؟"

"ہاں آپا جی - آپ بہت - بہوت اچھی ہیں۔" سب آگے پیچھے بول اٹھے۔

یہ نصیر میاں جو تھے، اب تو جیسے کچھ بھی تھے۔ مگر جوانی میں ان کا بڑا زور تھا۔ جانے کون سی عینک آنکھوں پر چڑھائے بیٹھے تھے کہ کوئی صورت من کو نہ بھاتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے اوپر ہونے آئے مگر اب تک بھی آدم بنے کسی گمنام حوا کو کھوجتے رہے۔ ہزاروں ہی بھلی بری صورتیں تو آنکھوں سے گزری ہوں گی۔ مگر دل پر کوئی نہ چڑھی۔ بڑی چچی کے قریبی سگوں میں آتے تھے۔ بڑے پڑھے لکھے تھے۔ ان کی بیٹھک میں ایسی بڑی بڑی آڑی چوڑی کتابیں تھیں کہ ضرورت پڑنے پر چاہو تو تکیہ بنا کر لے لو۔ کتے والے سید صاحب کے بیٹے تھے۔ قریبی عزیزداری تھی مگر آنا جانا سب موقوف تھا۔ بات کچھ بھی تو نہ تھی۔ نصیر میاں کے باپ علی گڑھ جا کر پڑھ آئے تھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ جانا لندن جانے سے کم نہ تھا۔ اور پھر یہ یوں ہی کورے تو نہ چلے آئے تھے، ایم اے، ایل ایل بی کی لانبی چوڑی ڈگری ساتھ لائے تھے۔ اور ایک فوٹو بھی تھا۔ کالا کالا۔ جبہ سا پہنے، سر پر ترچھی سی ٹوپی لگائے۔ پورے خاندان والوں میں وہ فوٹو گھومتا پھرا۔ اور کئی لوگوں نے تو کچھ آس بھی باندھ لی۔ مگر بیچ میں کتے آن پڑے۔ علی گڑھ سے آتے آتے انور میاں اپنے ساتھ ایک ولایتی کتا اور کتیا بھی لے آئے تھے۔ جو ان کے کسی انگریز دوست نے بطور تحفہ دیئے تھے۔ یہ بڑے بڑے جھابڑے کتے کہ دور سے دیکھو تو شیر نظر آتے۔ اس زمانے

میں پورے خاندان پر دادا حضرت کی حکومت تھی۔ نماز روزے کے وہ بڑے پابند تھے۔ دو دو حج کئے وہ الگ۔ چار پانچ روزے تو کہیں کہیں نہیں گئے تھے۔ ہر جمعہ کو روزہ ہوتا جب انھوں نے دیکھا کہ میاں انور اپنے ساتھ کتے بھی اٹھا لائے ہیں تو پہلے پیار دلار سے سمجھایا کہ "دیکھو میاں جس گھر میں کتے ہوں، رحمت کے فرشتے نہیں اترتے۔ فضول ناپاکی ہوتی ہے۔ بڑا نحس جانور ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔" مگر انور میاں نے ایک نہ سنی۔ بس دادا حضرت کو تاؤ آ گیا انور میاں کا گھر میں آنا جانا ہی بند ہو گیا۔ اب یہ بات اتنے غصے پتے کی بھی نہ تھی۔ مگر غصہ میں تو ایک فرشتہ بھی شیطان بن جاتا ہے۔ دادا حضرت نے جڑ ہی اکھاڑ پھینکی۔ اور ان کو گویا ذات باہر کر دیا۔ انور میاں بھی دھن کے، زیادہ صحیح لفظوں میں اپنی ضد کے، ایسے پکے تھے کہ ذرا بھی تو اثر نہ لیا، اور اوپر سے غیر کف کی بیگم بیاہ لائے۔

انور میاں کا جب بھی ذکر نکلتا تو بڑے گھر والے طعنے سے۔ "اجی وہی کتے والے سید انور۔" کہہ کر یاد دلاتے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ مٹتے مٹتے انور میاں کا نام ہی کتے والے سید صاحب پڑ گیا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ کتے تو پالے، مگر کیا ہے جو اپنے معمولات میں ذرا فرق آیا ہو۔ دیوان خانے کے باہر ہی ایک چبوترہ بنا لیا گیا تھا۔ جہاں دن بھر یہ کتا کتیا بیٹھے آنے جانے والوں کی پریڈ لیا کرتے تھے۔ یوں، علی گڈھ سے انگریزی پڑھ آئے تھے۔ ڈھیر ساری کتابیں، چاٹ ڈالی تھیں، مگر تھے وہی سچے سید تھے مسلمان اور خود ہی تو بولتے:۔

"ارے میاں یہ علم ہمیں یہ تھوڑی سکھاتا ہے کہ اپنا دین اور مذہب چھوڑ کر عیسائی بن جائیں" یوں پہننے کو کوٹ پتلون بھی کبھی کبھار پہن لیتے مگر مرتے مرتے، وضع داری نہ چھوڑی وہی شرعی پائجامہ کھلی آستینوں کا کرتا۔ چار کلی والا۔ سر پر رام پوری کالی ٹوپی اور ہاتھ میں نانا یا دا کی دی ہوئی چھڑی۔ صبح کی نماز بھی شاذ ہی قضا ہوتی۔ ہاں عشاء کی نماز میں اکثر غچہ مار دیتے۔ بولتے "کھانے کے بعد کم بخت کسی کام کا نہیں رہ جاتا میں۔ بڑی گنگی آجاتی ہے آنکھوں میں۔"

انہی کی اولاد یہ نصیر میاں تھے۔ جیسا بیج ویسا پودا۔ ان کے دماغ میں بھی ڈھیر سارا علم بھرا پڑا تھا۔ عمر کہاں کی کہاں پہنچ رہی تھی مگر اب تک کنوارے سانڈ بنے پھر رہے تھے

باپ چڑچڑاتے

"ارے کمبخت تجھے تیرے علم نے یہی سکھایا ہے کہ سونگھ سونگھ کر چھوڑ دے۔"

ہنس کر رہ جاتے۔ باپ تو اس عمر میں چھ چھ بچوں کے باپ بھی ہو گئے تھے، یہ ابھی تک پتنگیں اڑاتے پھرتے تھے۔ کہتے تھے۔

"جب تک کنوارے ہو، بچے ہو۔ ! شادی ہوئی کہ بڑھاپے نے آگھیرا۔" اپنے بھلے اب تک بھی بچے ہی بنے پھر رہے تھے۔

شام کو رؤف میاں گھر لوٹنے لگے تو شجو ماں نے کہلوا بھیجا :-

"اپنے ماموں میاں کو سلام کہہ دینا ہمارا۔" رؤف میاں نے گردن اُٹھا کے اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

یہ سلام کلام یہاں تک بڑھے کہ شجو ماں جان جان کر پہاڑے بھولنے لگیں۔ حساب غلط کر کر جاتیں، تو پھر نصیر میاں ہی ایسے ہوتے جو غلطیاں نکالتے۔

واہ بھئی واہ — یہ کوئی حساب ہوا۔ سولہ دونی بتیس ۳۲ ہوتے ہیں آپ چھتیس بتا رہی ہیں۔" یہ جھینپ کر رہ جاتی۔ مسکراہٹوں پر سے راشن اٹھ گیا۔ جی کھول کر مسکراتی، قہقہے لگاتی، مگر حیرت کی بات یہ تھی، شجو ماں سوچتی، کہ ہزار منتوں سے پکارنے کے باوجود ایک بھی کوا تو نہ اڑا تھا۔

اور پھر بڑی انہونی بات یہ بھی ہوئی کہ شجو ماں نے بقر عید پر اپنی پسند سے ہری بانکیں پہنیں ان کے آگے پیچھے سرخ رنگ کے گوٹ چڑھوائے۔ اور پیسے ادا کر کے منہارن کو جب سلام کیا تو اس نے بھی دل بھر کر دعائیں دیں۔

"اللہ سہرے کے پھول کھلائے، دلہن بنائے، جی کے ارمان نکالے۔ ہمارا بھی بھلا ہووے ـ" اور شجو ماں جو کسی کے بھی منہ سے یہ دعائیں سن سن کر سفید پڑ پڑ جاتی تھی۔ شرم سے تپ کے دودھ میں آبلی گاجر کی طرح لال لال ہو گئی۔

اور بڑی بات یہ کہ شجو ماں، جو پورے خاندان میں گھر گھسنی مشہور تھی، ٹھیل ٹھیل کر ماں

سے کہتی :۔

"اماں۔ آخر انور چچا نے کتے پال لئے تو کیا گناہ کر ڈالا تھا۔؟ مذہب تو نہیں بدل لیا تھا نا؛ اب کرنے والے تو مر کھپ کر مٹی میں مل گئے۔ فضول آپس کی برائی سے کیا فائدہ۔ آپ ان کے گھر آتی جاتیں کیوں نہیں ۔۔؟"

نصیر میاں جو بھابی کی خبر لینے آتے تو گھنٹوں خبریں لیتے رہتے۔ کبھی کھانا کھا جائے اور کبھی یہ نہیں تو خالی پان ہی سہی۔ شجو ماں، جو ساری دنیا سے منہ موڑے راہبہ بنی بیٹھی تھی پھر آدم دحوا کی ہنستی گاتی دنیا کو پلٹ رہی تھی۔

اور اب تو ایسا ہوا کہ نصیر میاں کو کھانے پر روک لیا اور خود بھی کوئی میٹھا بنانے لپک پڑی۔ بات چیت کا موضوع بدلتے بدلتے اس پر بھی آگیا۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی ۔۔؟"

"پسند کی کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ اور جب لڑکی مل گئی تو اپنی عمر ڈھل گئی۔ مگر کوشش کریں گے کہ تقدیر بدل جائے ۔۔" نصیر میاں مسکرا کر بولے ۔۔ "آپ بھی دعا کیجئے۔"

صاف اشارہ تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا کر سکتا ہے۔ شجو ماں شرما گئی۔ منہ تپ گیا۔ آنکھیں اٹھا کر بولی۔

"آپ کوشش کیجئے، میں دعا کروں گی، آپ کے لئے ۔"

پورے خاندان میں اڑ گئی کہ رزاق میاں والوں اور کتے والے سید صاحب کی آپس میں ملاقات ہوگئی۔ اور جو ذرا سنسنی خیز خبریں سننے اور سنانے کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے یہ بھی اڑا دیا کہ نصیر میاں گھنٹوں رزاق میاں کی جوان بیٹی، جو اَن بیاہی ہے، کے یہاں جا جا کے بیٹھتے ہیں۔ اب آگے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سنا ہے کچھ بات بھی ہونے والی ہے۔

لاکھ بات بھی ہونے والی تھی، مگر تھی کنواری ہی شجو ماں۔ ماں نے اونچ نیچ سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈے بھی، مگر ملے نہیں۔ شجو ماں ایسی ویسی عمر اور چال کی تو تھی نہیں کہ بجھانے بجھانے کی ضرورت پڑتی۔ بولتیں بھی کیا؛ پھر بھی دبی زبان سے کبھی کبھار کہہ دیا کرتیں۔

"زمانے والوں کے منہ کھلے ہیں بیٹی - ہماری پھوپھی بی بیاہی بھری - دو بچوں کی ماں. صاف لگا ہی دیا لگانے والوں نے کالو میاں سے ہنستی ہیں۔ انو میاں ان کے رشتوں کے بھائی آتے تھے۔"

شجو ماں نے سنا ضرور مگر یہ نہ سمجھا کہ یہ صاف ان پر ہی چوٹ ہے۔

نصیر میاں بھی مسکرا مسکرا کر بات کرتے ، تعلیم یافتہ تھے۔ ڈگری یافتہ تھے۔ ہزاروں میں اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دل کے کھوٹے نہ تھے۔ ورنہ ہزار بار تو کفر توڑ تنہائیاں میسر آئیں. کوئی جیسے ہوتے تو کچھ نیت میں فتور آتا. مگر انھوں نے کبھی نہ ہاتھ تک نہ لگایا۔ پان بھی یہ بنا کر دیتیں تو کہتے ۔

"وہاں میز پر رکھ دیجئے - ابھی میں حساب میں الجھا ہوا ہوں ۔"

نصیر میاں کی قدر و قیمت انہی باتوں سے شجو ماں کے دل میں دگنی ہو گئی تھی ۔

شجو ماں کی دھندلائی آنکھیں، جو نیند سے بیگانہ تھیں، اب سپنے دیکھتیں۔ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا شہزادہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ یہ دروازہ کھولتی ہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا مسکراتا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ اتنی پھیل جاتی کہ خواب ٹوٹ جاتا۔ پھر نظر آتا کہ چھجے پر کھڑی کوؤں کے پیروں میں سونے کی پائیں باندھ رہی ہے۔ اور ہزاروں کوے اپنے کالے کالے پر پھڑپھڑاتے، کائیں، کائیں کرتے اُڑے چلے جا رہے ہیں۔ پیروں کی پھٹ پھٹ اتنی تیز ہوتی کہ شجو ماں کی آنکھ کھل جاتی ۔

شہر ممنوع

دادی بی نے ادھر کئی دنوں سے کہانی نہیں سنائی تھی - آج پھر وہ پاندان گود میں لئے کہانی سنا رہی تھیں ۔

"ہا - بیچاری شہزادی - تھی نا نصیبوں کی پوری ، شہزادے کو ہر ہر طرح ناز و نعمت سے رکھا، کھلایا، پلایا؛ اس کی محبت دل میں پالی اور آخر کو وہ دغا دے گیا ـــ پیارو بیٹا کبوتر کی طرح پھر سے اڑ گیا یہ کہہ کر کہ ۔

"چین دیش کی شہزادی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تیرے لوہے کے جوتے گھس جائینگے تب شادی کرلوں گی۔ اب اس کے جوتے سفر میں گھس گئے تھے۔ چلو شہزادہ چین دیش کو چلا گیا اور کہانی ختم ـ !"

آج اسحاق چچا کلائمیکس میں گڑبڑ پیدا کرنے عین موقع پر ٹپکے، بڑے آرام سے آئے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بولے:

"کیا زوردار شادی کی بھئی ـ دلہن والوں نے مسہری کے ڈنڈے سونے کے دیئے اور سونے کے پازیب کے علاوہ پاندان بھی سونے کا دیا۔"

کس کی شادی کا ذکر ہے میاں نـ ؟" بڑی چچی جھپکیاں لیتی پڑی تھیں، کروٹ بدل کر بولیں ـ "ارے آپ کو نہیں معلوم! نصیر میاں کی شادی سے تو آرہا ہوں ـ"

"ہائیں! بڑی چچی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ نصیر میاں کی شادی؛ ہیں تو رقعے بھی نہیں آئے مگر....."

اسحاق میاں نے بہن کی زوردار گالی دی۔ وہ کتے کے بچے حمید میاں کے ہاتھوں میں انتظام تھا نہ ـ وہ تو ہم سے کلٹے کھاتا ہے۔ مجھے تو جلیل میاں راستے سے پکڑ لے گئے "کس کی بیٹی ـ ؟" بڑی چچی نے ڈوبتے لہجے میں پوچھا۔

" خیر کف کی ہے ـ نواب جانی کی پوتی ہے نا۔ اتنے دنوں سے یہی تو جھنجٹ چل رہی تھی۔ بڑی کوشش سے ہوا یہ پیام!

"ہاں تو بھئی، وہ کہانی ختم ہوئی ـ اب یہ دوسری سنو ـ ایک تھا....."

" دادی بی بی! "، آنسو بھری آنکھیں لئے دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑے شمو ماں پوری طاقت سے چلا اٹھی ـ" آپ یہ کہانیاں مت کہا کیجئے۔ آپ اپنا وقت الگ برباد کرتی ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کرتی ہیں ـ"

شمو ماں اتنی زور سے چلائی تھی کہ بچوں نے سہم کر اپنے چہرے قاعدے کی آڑ میں کرلئے۔

"ادئی — میں نے کس کی زندگی تباہ کی —؟ کہانی جیسی کہانی ، سُنادی —

اے لو اور سُنو —" اور وہ منہ میں پان دبا کر کٹ کٹ چھالیہ کاٹنے لگیں۔

اک دم شجوماں کے سارے بال سفید پڑ گئے۔ چوڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور گالوں پر جھریاں پڑ گئیں۔ اور پھر کانپتے ہاتھوں سے شجوماں نے بغدادی قاعدہ اُٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز سے پڑھانے لگی۔

پڑھو میرے بچو!

الف سے انار

بے سے بکری

ت سے تلوار۔"

~ ❖ ~

نکہت کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔ اندر اسلم صاحب درد سے
کراہتے پڑے تھے۔ اور وہ خود باہر ہاتھ ملتی کھڑی تھی۔ اس نے لپک کر شانو کا ہاتھ پکڑ کر اپنی
طرف کھینچا۔ اور اس کے کان میں بولی۔

"ڈاکٹر صاحب کا فون نمبر یاد ہے تمہیں۔؟

"جی ہاں — 96437" وہ حیرت سے بولی۔ کیوں مگر

"تم جلدی سے جا کر ڈاکٹر صاحب کو فون کر دو کہ وہ کسی وقت گھٹی پر سے چلے آئیں۔"
شانو بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور نکہت دھیرے دھیرے کمرے میں داخل
ہو گئی —!

اسلم صاحب نے ایک لمحے کو آنکھیں کھول کر نکہت کو آتا دیکھا اور پھر سے آنکھیں
موند لیں۔

نکہت دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

(کتنے دلوں پیچھے آج اسلم صاحب کا دماغ جا رہا تھا)

لمبا سا قد ۔ سانولا رنگ ۔ بھورے بالوں کی دو چار پریشان لٹیں پیشانی پر آئی ہوئیں ۔ اور وہ آنکھیں ۔۔۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ کوئی چیز نمایاں تھی تو یہی آنکھیں ۔ بڑی بڑی اور اس قدر غم سے بھری کہ لگتا ابھی ابھی ان میں آنسو امڈ آئیں گے ۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر خواہ مخواہ ان آنکھوں والی سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا ۔ نکہت کے سراپے کو دیکھتے ہی اسلم صاحب کے دماغ میں اس کا خط گھومنے لگا

محترمی !

میں نے آج صبح کے اخبار میں آپ کا دیا ہوا اشتہار پڑھا ہے آپ کو اپنے بچوں کے لئے ایک گورنس کی ضرورت ہے ۔ اور مجھے اپنے لئے ، اپنی ماں اور اپنی ضروریات کے لئے ایک معقول رقم کی ضرورت ہے آپ نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ گورنس کی ماہانہ تنخواہ دو سو روپلے ہوا کرے گی مگر اسے اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں بہت ہی اسمارٹ ہونا چاہیئے (جس کے لئے ۳۰ سال سے اوپر ہونا بھی لازمی رکھ دیا ہے) میں اکثر سوچتی ہوں جناب ، خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اتنی ناانصافی کیوں ہے ۔ کس نے پیدا کی ۔ ہم بندوں نے یا خود خدا نے ۔؟؟

دیکھئے نا آپ محض اتنے سے کام کے لئے دو سو روپلے خرچ کرنے کو تیار ہیں کہ کوئی آپ کے بچوں کو کھلائے پلائے ، کپڑے بدلوائے اور ڈھنگ سے دیکھ بھال کرے ۔ جب کہ یہاں یہ حال ہے کہ ایک بار کھانا مل جانا ہی معجزہ ہے ۔

آپ کے پاس بہت ساری درخواستیں آ رہی ہوں گی ۔ اور ان میں سے یقیناً کسی نہ کسی کو آپ چن بھی لیں گے ۔ مگر آپ سے اپنی مجبوریوں کا کیا بیان کروں ۔۔۔ کاش میری عمر آج سے بیس سال زیادہ ہوتی

(دو سو روپلے خوبصورت جنت) میرا دل چاہ رہا ہے کہ کسی بھی طرح آپ کے دل میں اپنے لئے رحم بھر دوں اور یہ نوکری حاصل کرلوں ۔ صبح سے جب سے آپ کا اشتہار پڑھا ہے ، میں نے اتنی کم مدت میں اس قدر رنگین خواب دیکھ ڈالے ہیں ۔ کہ پوچھئے نہیں۔ صبح سے میں نے کئی ساڑیاں بدل ڈالی ہیں ۔ کانوں کے ٹوپس نہیں جچے تو جھولتے ہوئے لمبے ایرنگ پہن لئے ۔ گلے میں ہلکی سی زنجیر پسند نہیں آرہی تھی تو چمکدار نیکلس پہن لیا ۔ چپل ناپسند ہونے لگی تو اونچی ایڑی کی سینڈل پہن ڈالی ۔ کئی دنوں سے جو گھڑی کا اسٹریپ بدلوانے کے بارے میں سوچ رہی تھی ، فوراً ہی بدل ڈالا ۔ اب میری کلائی پر سنہرا اسٹریپ جھل مل کر رہا ہے میں نے اپنے کمرے میں رنگین پردے لٹکا دیئے ہیں ۔ ہلکی نیلی مسہری کے سامنے کرسی اور میز دھری ہے ۔ اور یہاں بیٹھ کر میں آپ کے تینوں بچوں کو انگلش پڑھا رہی ہوں (جی ہاں میں بی اے پاس کر چکی ہوں)

بہت سی دعائیں اور محبتیں ! نیاز مند

نکہت

اسلم صاحب کو خط لکھنے کا اسٹائل بری طرح بھا گیا ۔ نوکری کے لئے کئی عرضیاں آئی رکھی تھیں ، مگر اب وہ کسی کے بارے میں نہیں سوچ رہے تھے ، اتنی معصومیت ، اتنی سچائی ، اتنی سادگی ، اور اس قدر موہ لینے والے لہجے اور انوکھے اسٹائل کی کوئی تحریر آج تک اُن کی نظر سے نہ گزری تھی ۔ سکریٹری نے جب سارے خطوط ان کے سامنے ڈالے تھے تو انھوں نے نکہت کے خط کو الگ رکھتے ہوئے کہا تھا ۔

" مس نکہت آئیں تو انھیں سے اپوائنٹمنٹ کر لینا ۔"

" مگر جناب ۔۔ " وہ رکتے رکتے بولا ۔ " وہ تو صرف بیس سال کی ہیں اور آپ نے تو چالیس ..... "

"بکو مت -" اسلم صاحب جھلا کر بولے - "جو کہا جائے اُسے پورا کیا کرو -"

نگہت آئی تو اسلم صاحب نے اسے سرسری نگاہ سے دیکھا اور لا پروائی سے بولے
" آپ کل کام پر آرہی ہیں -"
اس اچانک اور غیر متوقع خوشی سے نگہت لڑکھڑا سی گئی اور رُکتے جھجکتے بولی.
"مگر جناب میں — میں تو......"
" میں تو صرف بیس سال کی ہوں — یہی کہہ رہی تھیں نا آپ " وہ ہنس کر بولے
"کوئی بات نہیں - مجھے عمر کی قید اس لئے لگانی پڑی تھی کہ گورنس تجربہ کار اور ذمہ دار ہو — میں نے پہلے تو آپ کا خط دیکھا اور اب آپ کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں عمر ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی —"
نگہت نے کچھ نہ کہا — کچھ بھی تو نہ کہا. بس اسلم صاحب کو دیکھا اور دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں .
جب وہ جانے کے لئے مڑی تو اسلم صاحب نے اس کے پچھانویں کو دیکھا - اتنی حسین جسامت (اتنا ذہین دماغ) اتنی اچھی لڑکی اور غریبی بھی کیا شے ہوتی ہے - صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس نے اس قدر اہتمام سے جو ساڑی پہنی ہے - دو پیسے کا صابن لگا کر دھوئی ہو گی اور استری بھی نہ کر سکی ہو گی - تبھی تو یوں ملگجی ملگجی دکھائی دے رہی تھی جیسے پہلی پہلی برسات کے پیلے پیلے بادل — !

نگہت نے کمرے کو بار بار دیکھا - دیواروں کو دیکھا - میز کو دیکھا، کرسی کو — پھر پلنگ اور مسہری کو — نیلی مسہری کو - اور اسی سے میچ کرتے ہوئے نیلے جیسبری رنگین پردے وہ اپنا بکس رکھ کر تیز تیز قدموں سے چلتی اسلم صاحب کے کمرے تک پہنچی اور چوکھٹ پر رُک کر بولی -

"بوس — میں اندر آسکتی ہوں ــــ"

اسلم صاحب نے سر ہلا کر اندر آنے کی اجازت دی۔ تو وہ آتے ہی بچوں کے سے معصوم لہجے میں جلدی جلدی بولنے لگی۔

"وہ آپ کے سکریٹری صاحب میری بات سنتے نہیں ہیں۔ جانے کون سا کمرہ میرے لئے وقف کردیا۔ اب میں انھیں غلطی پر شرمندہ کرنا چاہتی ہوں۔ تو ڈھٹائی سے بولتے ہیں کہ "نہیں وہ کمرہ میرا ہی ہے ــ" بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے"

اسلم صاحب ذرا سا مسکرا کر بولے۔

" تمہارے لئے وہ کمرہ میں نے ہی مخصوص کروایا ہے ــ"

نکہت حیرت سے انکے منہ کو تکنے لگی۔ تو غم آمیز مسکراہٹ سے بولے۔

"تم نے اپنے خط میں کمرے کا جیسا نقشہ کھینچا تھا ویسا ہی پایا یا نہیں ــ"!

(کسقدر مہربان — کتنا شفیق کتنا اونچا ہے یہ انسان!)

نکہت نے گھبرا کر کہا ــ"مگر جناب وہ میرا ایک نا ممکن خواب تھا۔ زندگی کی سب سے بڑی، اور سب سے ناقابل حصول تمنا تھی۔ وہ۔ وہ.....

اسلم صاحب اسی لہجے میں بولے ــ"اب تمہارے خواب کی تعبیر تو تمہارے سامنے ہے ہی — کیا خدا کو اب بھی نا انصاف ہی کہو گی؟"

یقیناً یہ کوئی انسان نہیں۔ دیوتا ہے۔ بھلا انسان اس قدر رحم دل، اتنے خلیق، اس قدر شفیق کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ شخص جو دیکھنے میں انسانوں جیسا ہی نظر آتا ہے اس کے سینے میں کس کا دل ہے ــ؟ کل اس نے مجھے آپ کہہ کر پکارا ــ آج تم کہہ رہا ہے اور اس قدر پیار اور خلوص سے۔ کیا یہ حقیقت ہے یا سچ مچ میرا خواب ہی ہے ــ

اس نے چونک کر اپنے بوس کو دیکھا۔

بوس .... وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسلم نے ہاتھ اٹھا کر اُسے منع کر دیا ــ

"مجھے بوس نہ کہو — اس لفظ سے مجھے دکھ ہوتا ہے ــ ہم سب ایک ہی خدا کے

پیدا کئے ہوئے انسان ہیں۔ کوئی چھوٹا نہیں کوئی بڑا نہیں۔ ہمارا بوس تو وہ ہے۔ اور انہوں نے اپنی انگلی (جس میں بڑا سا پکھراج چمک رہا تھا) آسمان کی طرف اُٹھائی۔ نگہت یونہی تصویر حیرت بنی کھڑی تھی۔ وہ سادگی سے بولے

"میرا نام اسلم ہے ——"

احسانوں کے بوجھ تلے دب کر نگہت خود اتنی بوجھل ہوگئی کہ قدم تک نہ اُٹھا سکی۔ بڑی مشکل سے اس نے ساری طاقت سمیٹ کر اپنے پیر ہلائے اور دھیرے دھیرے کمرے سے باہر نکل گئی۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں

اب اس نے مالکانہ احساس کے ساتھ پھر سے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ اُسے یہ دیکھ کر بڑی طرح حیرت ہو رہی تھی کہ ہر چیز بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ اس نے تصور میں سوچ رکھی تھی۔ اور خط میں جس کا ذکر کیا تھا۔ اسلم صاحب نے صرف ایک دن میں یہ سب کچھ کیسے کر لیا۔ کیوں کر لیا۔ یہاں سچ مچ کے رنگین پردے تھے۔ روالونگ چیئر تھی —— اس کے ساتھ ٹیبل۔ کھڑکی باہر باغ میں کھلتی تھی اور کھڑکی سے لگ کر گلابوں کے پودے تھے۔ ہوا کے جھونکے نے خوشبوؤں کو اندر لوٹ دیا۔ اور نگہت پیچھے مڑکر دیکھنے پر مجبور ہوگئی اپنے جسم کو گھما کر جب وہ پیچھے دیکھ رہی تھی تو سامنے والی دیوار میں اسے ایک لڑکی نظر آئی۔ اس لڑکی کو اس نے آج سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لمبے سے قد، سانولی رنگت الجھے بکھرے بالوں اور نمناک آنکھوں والی وہ لڑکی جو ایک ملگجی سی ساڑی میں ملبوس تھی اور حیرت سے آئینے کو تک رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر اسے غور سے دیکھا اور پوچھا۔

"یہ تم ہو نگہت بی بی —— تم —— اس محل میں تم رانی بن کر کیسے آگئیں ——"

ہوا کے جھونکوں سے اس کے بال اور کپڑے لہرا رہے تھے اس نے ہر ہر چیز کا جائزہ لیا اور پھر اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے کپڑے کس قدر بُرے تھے۔ ایسے کپڑوں کے

ساتھ وہ کیوں کر اس شاندار مسہری پر قدم دھر سکتی تھی؟ مارے احساس کے اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس نے اپنے اُڑتے ہوئے بالوں کو اپنے پتلے پتلے ہاتھوں سے پیچھے کی طرف سمیٹا اور جوڑا باندھ کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئی ۔۔۔ اس کے تصور میں رنگین ساڑیاں لہرانے لگیں۔ اور پھر ایک ساڑی جو پوری سبز تھی اور جس پر بڑے بڑے کالے کالے پھول تھے، آئینے سے نکل کر اس کے گالوں کو چھونے لگی۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ اسلم صاحب کھڑے ہوئے تھے ۔۔ اور ذرا جھجک جھجک کر بول رہے تھے۔

"نکہت تم یہ نہ سمجھنا کہ اس طرح میں نے تمہارے احساسات کو ٹھیس پہنچانی چاہی ہے، بلکہ تم سوچو کہ اب تم اس گھر کی ایک فرد سی ہو۔ میرے کئی ملنے جلنے والے آئیں گے اور اگر وہ تمہیں ان کپڑوں میں دیکھیں گے تو یہ تمہاری ہی نہیں میری اپنی بھی بے عزتی ہو گی۔"

وہ حسب عادت بالکل ہولے سے مسکرائے۔

"یہ پیسے تمہاری تنخواہ سے کاٹ لئے جائیں گے۔" اور اُنہوں نے ایک بڑا سا بنڈل اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اس میں کچھ کپڑے ہیں۔"

نکہت بالکل بے دست و پا ہو گئی۔ اس نے تھوڑی دیر تک تو یونہی اسلم صاحب کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر بنڈل ایک طرف پھینک کر وہ اسلم صاحب سے چمٹ گئی ۔۔۔ اسلم صاحب نے محبت سے اس کے سر پر تھپکیاں دیں اور وہ سسک سسک کر روتی رہی۔

"آپ کتنے اچھے ہیں ۔ آپ انسان نہیں دیوتا ہیں ۔ آپ ۔ آپ....."

اسلم صاحب نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔ بلکہ ایک بزرگانہ انداز سے اس کے سر پر ہاتھ رکھے رہے۔ جب نکہت کے دل کا غبار نکل گیا تو وہ سہم کر دور کھڑی ہو گئی۔ پھر بھی وہ نوکر تھی اور وہ اس کا آقا، یہ کیسی حرکت اس سے سرزد ہوئی۔؟ اس نے سہم کر اسلم کو دیکھا، شائد وہ کچھ تنبیہ کریں۔ مگر وہ یونہی خاموشی سے چلے گئے ۔۔۔ "مگر ان کی آنکھوں میں آنسو کیوں چمک رہے ہیں!" اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔!

اب دل کا سارا غبار نکل چکا تھا اور وہ خود کو پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ گلابوں کی خوشبو اس کے دل تک اتر چکی تھی۔ اس کا جوڑا ڈھلک کر کھل چکا تھا۔ آنکھیں جو اب تک بار بار بھر بھر آ رہی تھیں صاف شفاف ہو چکی تھیں۔ اس نے ڈھیر سے بنڈل کھولا اور کپڑے دیکھنے لگی۔ چار چھ ساڑیاں تھیں اور اُسی کے جوڑ کے بلاؤز۔ بھلا انھیں میرا ناپ بھی معلوم ہو گیا۔! اس نے حیرت سے کپڑے اُلٹ پلٹ کئے۔ یہ کپڑے کئی بار دکانوں پر لٹکتے دیکھ چکی تھی۔ جھل مل کرتے، باغ و بہار لباس، تیار شدہ کہ بس خرید اور پہن لو۔ اس نے ہزاروں بار تمنا ضرور کی تھی مگر خرید کبھی نہ سکی تھی۔ آج مسرتوں کے دروازے اس پر کھل گئے تھے گویا الہ دین کا چراغ مل گیا تھا کہ سوچو وہ حاضر۔!

اس نے ساتھ والا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ اس نے بڑی معصومانہ حیرت سے دیکھا کہ حمام کے ٹائلز کس قدر صاف شفاف اور اجلے اُجلے اور شاور پاتھ ذرا چھیڑنے پر ہی برسات کی پھوار کا سا منظر پیش کرنے لگا۔ اس نے اپنا لباس اتار دیا اور شاور کے نیچے اپنے لمبے لمبے بال کھول کر کھڑی ہو گئی۔ بارش کی اولیں پھوار سے جیسے اس کا جسم بھیگ اُٹھا اور وہ لہک لہک کر گنگنانے لگی۔

وہ اپنا بھیگا بھیگا جسم لئے آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے بڑی مسرت کے ساتھ وہ کپڑے پہنے۔ اپنے لمبے لمبے بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتے پانی کو بڑی خوشی کے ساتھ دیکھتی رہی اور جب وہ پوری طرح تیار ہو گئی تو اس نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ وہ بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔

اب اس کے دل میں ایک عجیب سی تمنا جاگی کہ اسلم صاحب اسے اس لباس میں ضرور دیکھیں۔ لیکن وہ ان کے پاس جائے کیسے۔؟! بڑی دیر تک کوئی بہانہ سوچتی رہی۔ آخر اس نے ایک حل سوچ ہی لیا۔

"اب آپ یہ بتا دیجئے کہ میرے ذمہ کیا کیا کام ہوں گے۔" بس میں یہی جا کر پوچھوں گی۔

وہ اسلم صاحب سے اجازت لے کر ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چڑ کر بولے۔

"مجھے بار بار اجازت لے کر تمہارا آنا بالکل پسند نہیں ۔"

وہ گھبرا گئی ۔ اس کا چہرہ اُتر سا گیا ۔ وہ بول رہے تھے۔

"میں بھی آخر انسان ہوں غصہ مجھے بھی آتا ہے اور بڑی عجیب عجیب باتوں پر آتا ہے تم سے کس نے کہا ہے کہ جب آؤ تب اجازت لے کر ہی آؤ ـــ"

نگہت نے سکون کا لمبا سانس لیا ـــ

"میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ میرے ذمے کیا کام ہوں گے ۔" !

اسلم صاحب نے اسے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور صاف سیدھے لہجے میں بولے

"ہاں اب تم بہت اسمارٹ نظر آ رہی ہو ـــ کپڑے پسند آئے ـ ؟"

اس نے سر ہلا دیا ـ" "اور کمرہ کیسا لگا ـــ" ؟

"جی بہت اچھا ـ"

انھوں نے اطلاعاً کہا ـ" ساتھ ہی باتھ روم بھی ہے ۔"

"جی ہاں ـ وہ خوشی سے بولی ـــ وہیں تو میں نے باتھ لیا ہے ۔"

اسلم صاحب نے گھنٹی بجائی اور نوکر آیا تو بولے

"بچوں کو لے آؤ ـ"

تھوڑی دیر بعد اس کے سامنے تین بچے کھڑے تھے۔

"یہ میری سب سے بڑی بیٹی سلمیٰ ہے ـ" انھوں نے ایک دبلی پتلی اور لمبی سی گوری سی بچی سے نگہت کا تعارف کروایا ۔ سلمیٰ نے سفید اسکرٹ پہن رکھا تھا ۔ بال انگریزوں کی طرح کٹے ہوئے تھے ۔ اور صورت سے بالکل انگریزی لگتی تھی ـــ

"یہ جونیر کیمرج میں پڑھتی ہے ـــ چودہ سال کی ہے ـــ" پھر انھوں نے بیٹے سے متعارف کروایا ـ "یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے انوار ـــ سیونتھ میں ہے ـــ اور پھر ایک چھوٹی سی بچی کا ہاتھ پکڑ کر بولے ـ

"اور یہ میری سب سے چھوٹی بٹیا نجمی ہے — فورتھ میں - بہت بھولی بھالی اور سادہ طبیعت — البتہ یہ انوار میاں تمہیں بہت دق کریں گے -" وہ ہنس کر بولے -

نگہت نے باری باری ان تینوں کو دیکھا - تینوں نے باپ کی طرف — گویا پوچھتے ہوں —"یہ کون ہے -"

اسلم صاحب بچوں سے کہہ رہے تھے -"دیکھو بچو! اب یہ تمہارے ساتھ ہی رہا کریں گی ان ....

ابھی اسلم صاحب کی بات منہ میں ہی تھی کہ انور پھٹ سے بول اٹھا.

"اچھا تو آپ نے ہمارے لئے جس گورنس کا اشتہار دیا تھا یہی ہیں وہ -"

اسلم صاحب نے اُسے بری طرح گھُورا. ایسی بد تمیزی کی بات نہیں کہا کرتے — یہ آنٹی ہیں تمہاری، —"

نگہت نے ذرا سا مسکرا کر نجمی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا - نجمی نے اسے بھولپن سے دیکھا اور پھر شرما گئی.

جب وہ چاروں کمرے سے باہر نکل رہے تھے تو اسلم صاحب نے نگہت سے کہا "نگہت آج سے یہ تینوں تمہاری نگرانی میں ہیں - تم ان سے جیسا چاہو ویسا سلوک کر سکتی ہو — یہ تمہارے ہی بچے ہیں —"!

"یہ تمہارے ہی بچے ہیں —"!

"یہ تمہارے ہی بچے ہیں -"!

"یہ تمہارے ....

نگہت نے سر گھما کر اسلم صاحب کو دیکھا جو بالکل بے تعلقی سے سر جھکائے اپنے کاغذات میں اُلجھ گئے تھے -!

"نگہت نے الماری کھول کر اندر نظر ڈالی تو کپڑوں کا ایک انبار تھا۔ مگر بے حد بے ترتیب۔ شلواریں، غرارے، اسکرٹ، کانونٹ یونی فارم۔ ساڑیاں۔ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور زیورات کا بکس الگ کھلا پڑا تھا۔ اس نے بڑی الجھن سے سر جھٹکا اور سلمیٰ سے بولی۔

"سلمیٰ یہ کپڑے کس نے بے ترتیب کئے ہیں۔"

"آیا نے۔" سلمیٰ بالوں میں کنگھا پھیرتی ہوئی بولی

"عجیب واہیات آیا ہے۔"

سلمیٰ اسٹول پر سے اٹھ کر نگہت کے قریب آئی اور بولی۔ "آنٹی اسی لئے تو ڈیڈی نے ایک گورنس کی ضرورت محسوس کی ابھی تو آپ گھر کے دوسرے کمرون میں جا کر دیکھئے تب پتہ چلے گا کہ کس طرح افراتفری مچی ہے۔

نگہت نے ذرا ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اور تمہاری ممی کیا کرتی رہتی ہیں پھر۔"؟

"سلمیٰ تھوڑی دیر تو بالکل چپ رہی پھر بولی۔" ممی۔ ممی کو مرے تو سال سے بھی زیادہ ہو گیا۔

"اوہ۔" وہ شرمندگی سے بولی۔" اُف کتنی بڑی ٹریجڈی، تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ تبھی ڈیڈی اس قدر خاموش اور بے زار سے رہتے ہیں نا۔"!

سلمیٰ نے گویا الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کی اور پھر بڑی صاف دلی سے بولی۔"

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ دراصل ممی اور ڈیڈی کی کبھی بنی ہی نہیں۔"

"ہائے۔ وہ کیوں۔" نگہت بے تابی سے پوچھ بیٹھی۔

"بس یونہی ممی ذرا تیز مزاج تھیں نا۔ اسی لئے۔ اور وہ کبھی گھر کے کام کاج میں زیادہ دخل نہ دیتی تھیں۔ سارا کام نوکر ہی سنبھالے رہتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ

گھر کی مالکہ کی موجودگی کے احساس کو وہ کبھی اپنے دل سے نہ ہٹا سکتے اور یوں زیادہ مستعد رہتے مگر ادھر جب سے ان کی ڈیتھ ہوئی ہے۔ یہ سب لوگ بالکل نکمے ہو گئے ہیں۔

ماں غیر ذمہ دار ہوں تو بیٹیاں آپ ہی آپ ذمہ دار اور سمجھدار ہو جاتی ہیں ——
یوں تو ایک لڑکی کے لئے چودہ سال کی عمر ایسی کم نہیں ہوتی، تب بھی یہ سلمیٰ کتنی سمجھدار ہے

"تم انھیں ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتیں —" وہ سوچتے سوچتے بول پڑی۔"

"آپ سے ایک بات بتاؤں آنٹی" ۔ وہ بڑے سیدھے لہجے میں بولی ۔"ممی اس قدر تیز مزاج تھیں، دن بھر اس قدر الجھی رہتی تھیں کہ اس تیزی تندی سے مجھے خود بخود چڑ سی ہو گئی ۔ اب کوئی کچھ بھی کرے مجھے زبان ہلانا بار ہوتا ہے۔ ویسے اپنے طور پر میں خود ہی اپنا کام کر لینے کی کوشش کر لیتی ہوں مگر آنٹی آپ جانیں ماحول کا بھی تو ہاتھ ہوتا ہے؟..
نگہت اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی اور وہ کہے جا رہی تھی —" ہمارے یہاں تو بچپن ہی سے ایسا ماحول ہے کہ جو کریں نوکر کریں — پھر بھی میری یہ ذمہ داری اور سگھڑاپے کو یہ انوار گدھا الٹ پلٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور پھر یہ آیا تو سب سے بڑھ کر ہے اگر کبھی یہ کہوں کہ نیلی اسکرٹ نکال لا، تو جب تک ساری الماری کو تہ و بالا نہ کر ڈالے تب تک اسے اسکرٹ نہیں مل سکتی —"

نگہت نے کچھ نہ کہا — یہ بچی ماں کی محبت کی ٹوٹی ہوئی۔ کس قدر عقل مند — سمجھدار اور ذمہ دار تھی ۔ اس نے سلمیٰ کے دبلے پتلے اور قدرے لمبے جسم کو دیکھا اور بولی "اب تو آنٹی آ گئی ہیں —" اور مسکرانے لگی — نگہت بھی مسکرا دی — اور پھر سے الماری پر جھک گئی

"آج کیا پہنو گی —" نگہت نے مڑ کر پوچھا۔

"آج تو سٹرڈے ہے — یونی فارم کی قید نہیں — ساڑی باندھ لوں گی۔"

نگہت نے پنک کلر کی ساڑی اور ویسا ہی بلاوز نکال کر میز پر رکھا اور پیچھے کھڑی ہو کر سلمیٰ کے فراک کے ہک کھولنے لگی۔

"کیا کر رہی ہیں آپ ۔" سلمیٰ ایکدم مڑ کر بولی
نگہت حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ "کپڑے نہ پہنو گی
ہائے مجھے شرم لگتی ہے ۔ میں آپ ہی بدل لوں گی۔" اس نے گلابی ہو کر کہا
اب کے نگہت نے غور سے سلمیٰ کو دیکھا ۔ اس کے گلابی پڑتے ہوئے گالوں کو
اس کے سراپے کو ۔ اور پھر اس نے سوچا کہ عورت بیدار ہو رہی ہے ۔

اس نے پھر ایک لفظ بھی نہ کہا اور ذرا ذرا مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل آئی
تینوں بھائی بہنوں کے کمرے ایک ساتھ لگے ہوئے تھے ۔ کوٹھی اس قدر بڑی اور کشادہ
تھی کہ اگر بیک وقت سو آدمی بھی اس میں آ کر رہ جاتے تو کسی قسم کی اڑچن یا شور شرابہ نہ ہوتا ۔
نگہت حیرت سے ادھر ادھر دیکھتی انوار کے کمرے میں داخل ہو گئی ۔ انوار کا کمرہ بھی سلمیٰ
کے کمرے سے مختلف نہ تھا ۔ وہی بے ترتیبی وہی افراتفری اور یہاں تو ڈھیر سارا الم غلم
بھی بھرا پڑا تھا۔ کرکٹ، بیٹ، وکٹ ٹینگ پانگ کی گیندیں ۔ بیڈمنٹن نیٹ، ہاکی ۔
فٹ بال، نگہت نے گھبرا کر سارے اٹمبر کو دیکھا ، پھر خود ہی ہنس پڑی ۔

اس نے جھٹک جھٹک کر ایک ایک چیز اٹھانی شروع کر دی ۔ انوار بڑی دیر
سے جوتوں کے بند باندھتا بیٹھا تھا ۔ نگہت کی طرف اس کی پیٹھ تھی ۔ اس نے نگہت کی آمد
کو محسوس ہی نہ کیا تھا ۔ پٹکنے، جھٹکنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ مڑا ، اور وہیں سے
بیٹھے بیٹھے شرارت سے چیخ کر بولا ۔

"ارے مس نگہت ایسا غضب بھی نہ کیجیے ۔

ابھی آگے جانے وہ کیا کہتا کہ ہلکی سی ، رپ ، رپ کی آواز کے ساتھ اسلم صاحب
اس کے کمرے میں آ گئے ۔ اور بغیر نگہت کا نوٹس لئے وہ تیزی سے بولے ۔

"مس نگہت نہیں ۔ آنٹی ۔" اور جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے
نگہت نے جلدی سے ان کے پیچھے پیچھے باہر جا کر دیکھا تو باغ کو ہوتے ہوئے اپنے کمرے
کو جا رہے تھے ۔ نگہت اندر آئی تو انوار سراسیمہ سا بیٹھا تھا ۔

"بھول ہوگئی —" وہ ندامت سے بولا۔

"کوئی بات نہیں — آپ لوگ تو میرے آقا ہیں۔"

انوار نے اس کے لہجے کی آزردگی کو بھانپ لیا اور اٹھ کر اس کے قریب آکر بولا —

"آنٹی آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا — ؟؟"

نگہت نے اس کے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے گلے میں ڈال لئے۔ اور وہ اپنی باہوں کے سہارے اس کی گردن سے جھول گیا۔

نجمی سب سے خاموش، بھولی اور الگ تھلگ رہنے والی بچی تھی۔ جب نگہت نے اس کے کپڑے بدلوائے اور کنگھی کر کے اونچی سی پونی ٹیل باندھدی تو وہ مارے خوشی کے اس سے لپٹ پڑی۔

"آنٹی آپ کتنی پیاری ہیں — سو سویٹ —"

تینوں تیار ہو گئے تو وہ ان کے ساتھ باہر پورچ میں نکل آئی۔ شوفر نے گاڑی (لمبی سی گاڑی۔ ایسی انہونی تمنا جسکا خواب بھی نگہت کے بس کا روگ نہیں تھا) پورٹیکو میں لاکر کھڑی کر دی اور وہ تینوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ان کے ساتھ کانونٹ چلدی انوار کو دوسرے کانونٹ میں چھوڑا۔ اور دونوں لڑکیوں کو الگ الگ کانونٹ میں چھوڑ کر پھر وہ گاڑی میں آبیٹھی۔ اب گاڑی میں کوئی نہ تھا — آگے شوفر پیچھے وہ۔ اس نے شیشے گرا کر دروازے سے کہنی ٹکادی — بڑی معصوم نگاہوں سے وہ دروازے کو دیکھنے لگی — گاڑی بالکل نئی تھی اور خوب تیز اُڑی جارہی تھی — ابھی کسی چیز پر اس کی نگاہ ٹکتی بھی نہ تھی کہ گاڑی آگے نکل جاتی۔ اُسے یہ سب کچھ اتنا اچھا لگ رہا تھا — مگر یہ ننھا سا وسوسہ اس کے دل کو کچوکے دئے جارہا تھا کہیں اس سے یہ جنت چھن تو نہ جائے گی — ؟!!

موٹر پورٹیکو میں آکر ٹھیری تو اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ کوٹھی آگئی ہے۔

شوفر نے پٹ کھول کر کہا۔

"اُترئیے میم صاحب —" وہ بُری طرح چونکی اور ساڑی کا پلو سنبھالتی ہوئی،

نیچے اُتر آئی۔

بچوں کو کانونٹ چھوڑ آنے کے بعد وہ پھر سے اُن کے کمروں میں پہنچ گئی۔ ہر ہر چیز ٹھاؤں ٹھکاؤں پر رکھی، نوکر کو بلوا کر گرد صاف کرائی۔ میزیں، کرسیاں جھاڑن سے صاف کروائیں ۔ میلے کچیلے کپڑے دھوبی کو دلوائے ۔صاف کپڑے ترتیب سے جمائے ۔ اُسے کام کرتے ذرا بھی تکان محسوس نہ ہو رہی تھی۔ بلکہ اس کا جی یہ چاہ رہا تھا کہ کام اور بڑھتا ہی جائے اور وہ مصروف ہی رہے ۔ عمر بھر ۔ ہر لمحہ ۔ ہر وقت ۔

کمرے صاف ہو گئے تو وہ پھر بیکار ہو گئی ۔ بیکاری بھی کس قدر خوشگوار تھی، وہ اٹھی اور کوٹھی دیکھنے کی خاطر اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔

نگہت نے اپنی زندگی میں فلمیں بہت کم دیکھی تھیں ۔مگر جو کچھ بھی دیکھی تھیں ان کی، شان و شوکت اسلم صاحب کی کوٹھی سے بڑھ کر ہرگز نہ تھی ۔ آخر اسلم صاحب کرتے کیا ہیں کہ اس قدر امیر ہیں ۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ امیر ہونے کے باوجود، غرور اور اکڑ نام کو نہیں ۔ کسقدر میٹھے سبھاؤ میں بات کرتے ہیں ! چلتے چلتے نگہت رکی - اس لمحہ وہ باغ میں سے گزر رہی تھی کہ ناگہاں اس کی نظر گلاب کے ایک گملے پر جا پڑی گملا اس قدر گندا ہو رہا تھا - اف پتیاں اسمیں ٹوٹ گری تھیں ۔ اور کچرا پھولوں کی خوبصورتی کے لئے داغ ثابت ہو رہا تھا ۔ یہ پھول تو یقیناً بدیسی ہو سکتے ہیں ۔ گہرے زرد اور اس قدر بڑے بڑے کہ اگر میں اپنی دونوں ہتھیلیاں جوڑوں تو بھی ان میں ایک پھول نہ سما سکے۔

وہ پتیاں چُنتی ہی بیٹھی تھی کہ ادھر سے اسلم صاحب کسی کام سے آنکلے ۔ وہ رک گئے ان کے چہرے سے ترشی مترشح تھی۔

"نگہت ۔" وہ تیزی سے کہہ کر رک گئے

"جی ۔" وہ گھبرا کر پلٹی اور ہاتھ جھٹکتی اُٹھ کھڑی ہوئی

"یہاں کیا کر رہی ہو تم ۔"

"جی کچھ بھی تو نہیں ۔"

اسلم صاحب نے کچھ نہ کہا ۔ بس اتنا کہہ کر چلے گئے ۔
"تمہیں بچوں کے کام کے لئے رکھا ہے ۔ نوکر نہیں بنایا ہے کہ گھر بھر کو سمیٹتی پھرو۔"
نگہت اُن کے نگاہوں سے اوجھل ہوئے تک یونہی کھڑی رہی ۔ پھر ہنستی ہوئی گملے پر جھک گئی ۔ ایک دو گھنٹے میں اس نے تمام گملے صاف کر دیئے ۔ جاتے جاتے مالی کو تھوڑی سی تنبیہ کرتی گئی کہ سرکار نے اتنے پیارے پیارے قیمتی پھول یوں برباد کرنے کے لئے تو نہ منگوائے ہوں گے ۔

اب ایک بج رہا تھا ۔ وہ بالکل بیکار تھی ۔ بچوں کے آنے کا وقت قریب ہو رہا تھا ۔ وہ ڈائننگ ہال میں جا پہنچی ۔ صبح تو ناشتے کے وقت بچوں نے اُسے کچھ کرنے کی مہلت ہی نہ دی تھی ۔ ٹوسٹ اور مکھن کھا کر یونہی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اسلم صاحب ۔ان کی تو اس نے کچھ خبر ہی نہ لی تھی ۔ ۔ جانے کیا کھایا ہوگا ۔ بیرا یہ بتا رہا تھا کہ صاحب بیڈ ٹی لینے کے بعد بالکل ہلکا ناشتہ کرتے ہیں ۔ وہ اس خیال کے آتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسلم صاحب کے کمرے میں جا پہنچی ۔ یہ ان کا لونگ روم تھا ۔ باہر والا کمرہ جہاں انھوں نے نگہت کو پہلی بار وزٹ کیا تھا ان کے آفس کا بھی کام دیتا تھا ۔ اور ملنے جلنے والے وہیں آکر ملتے جلتے تھے ۔ وہ کمرے میں پہنچی تو اُسے یہ دیکھ کر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی کہ ان کا اپنا کمرہ بھی بچوں کے کمروں کا کاربن تھا ۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنے ڈھیر سارے نوکر کس کام کے ہیں ۔ جبکہ ہر ہر چیز سلیقہ طلب ہے ۔ اُمّی سچ ہی تو کہتی ہیں کہ گھر کی مالکن کے بغیر گھر گھر نہیں کانجی ہاؤس ہو جاتا ہے ۔
اس نے وہ ہی کارروائی شروع کر دی ۔ واہ یہ کوٹ تو دیکھو ۔ بجائے ہنگر کے یونہی شولڈر کے سہارے کیل سے لٹک رہا ہے ۔ اُف کتنی شکنیں پڑ گئی ہیں ۔ اس نے کوٹ اُٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا ۔ اور زور سے جھٹکا ۔ ایک تصویر نکل کر نیچے گر پڑی ۔ نگہت نے جلدی سے تصویر اُٹھا لی ۔ اب وہ دونوں ہاتھوں میں تصویر تھامے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی ۔ ہو بہو سلمٰی ۔ !؟ اونہوں اس نے پھر سے

تصویر دیکھنی شروع کی۔

اب اس نے دیکھے کہ تصویر کے نقوش بالکل اسلم ایسے ہیں۔ آنکھیں، ناک، بال مسکراہٹ کا انداز۔ اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ یہ ہر بار آنکھوں کے آگے اسلم صاحب کیوں اُبھر رہے ہیں۔ میں ان کی مسز کی تصویر میں بھی انہی کے نقوش تلاش کر رہی ہوں۔ پش۔!

اس نے ہر قسم کے خیالات کو جھٹک کر پھر سے تصویر دیکھنی شروع کی۔ یہ تصویر کسی کی بھی ہو سلمٰی سے حد درجہ مشابہت رکھتی تھی۔ یقیناً یہ مسز اسلم رہی ہوں گی۔ اس نے بڑی احتیاط سے تصویر پلو سے صاف کی اور اسے یونہی کوٹ کی جیب میں رکھ دیا۔ ابھی وہ کوٹ ہینگر سے لگا ہی رہی تھی کہ کسی کام سے اسلم صاحب اندر چلے آئے وہ بری طرح سراسیمہ ہو گئی۔ اسلم صاحب بھی کچھ پریشان سے ہو گئے اس کے ہاتھ میں کوٹ دیکھ کر مسکرا دیئے۔ اور اس کے بہت قریب آکر بولے

"مگر میں تو بچہ نہیں ہوں نگہت۔"

"نگہت نے اپنا پورا چہرہ اُٹھا کر پوری ہمت کے ساتھ ان کے چہرے کو دیکھا اور بولی۔

"مرد تو فطرتاً بچہ ہی ہوتا ہے۔"

"اسے بھی دیکھ بھال کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی ایک ننّھے کو۔ آپ نے کبھی اپنے کمرے اور اپنے بچوں کے کمروں میں کوئی فرق بھی محسوس کیا ہے۔"؟ وہ صاف دلی سے ہنس رہی تھی۔ اسلم صاحب ذرا جھینپ کر بولے

"ہاں۔ اُف۔ وہ تو ہے مگر نوکر جو ہیں۔"

نگہت جھلا گئی۔ جسے دیکھو وہی نوکر نوکر کی رٹ لگائے ہے۔ الجھ کر بولی. "حد ہے۔ بھلا نوکر بھی کوئی کام گت سے کرتے ہیں۔" پھر اس نے صبح سے لے کر اب تک کے کاموں کی ساری رپورٹ دے ڈالی۔ آخر میں وہ بولی۔

"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ مجھے واقعی ایک ایسی نوکری مل گئی ہے کہ میں
رانی جیسی ہوگئی ہوں۔ بھلا دو سو روپے اس زمانے میں کم ہوتے ہیں ۔ کئی جگہ درخواستیں
دے دے کر ہار گئی تھی ۔ اب تک مجھے اپنے نصیب پر اپنی اس زندگی پر یقین نہیں آرہا
ہے ۔" اس نے کھلی کھلی آنکھوں سے اسلم صاحب کو دیکھا اور لجاجت سے بولی ۔"
" دیکھئے آپ مجھے کسی کام سے نہ روکا کریں، ورنہ میں احساس ندامت سے
گھٹ کر مر جاؤں گی ۔"

"تم عجیب و غریب قسم کی لڑکی ہو نگہت ۔" وہ تنک کر بولے ۔" میں
تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا ۔ تم نوکروں سے کام ضرور لے سکتی ہو مگر
خود نوکر بن کر نہیں رہ سکتیں ۔"!

"تم نوکر بن کر نہیں رہ سکتیں ۔"

"تم نوکر بن کر نہیں ....

"تم ۔ تم ....

اسلم صاحب غصہ ہو کر چلے گئے تھے اور وہ خوشی اور غم کے ملے جلے احساسات
تلے دب کر اتنی بے بس ہوگئی تھی کہ اپنا وزن آپ سنبھال بھی نہ سکی اور دھم سے صوفے پر گر پڑی

دوپہر کو کھانے پر ایک عجیب و غریب حادثے نے جنم لیا ۔ اسلم صاحب نے
آج تک کھانے کی میز پر کسی کو نہ بلایا تھا۔ بس تینوں بچے اور وہ خود ۔ آج جب میز
لگ گئی تو انھوں نے بیرے سے کہا ۔

"جاکر میم صاحب کو بلا لاؤ ۔"

بیرے نے پہلے تو حیرت سے انھیں دیکھا اور پھر چل دیا ۔ نگہت ڈری ڈری
آئی اور ان کے بازو آکر کھڑی ہوگئی ۔

"آپ نے مجھے بلایا ۔" ؟

"کیوں کھانا کھانے کا ارادہ نہیں ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولے

ان کی اتنی بھرپور سنجیدگی سے نگہت خواہ مخواہ ڈر سی گئی۔ جانے کیوں ایک شکایت اس کے ہونٹوں سے پھسل پڑی

"پھر ناشتے پر بھی بلایا ہوتا مجھے۔"

اسلم صاحب نے کچھ حیرت سے کچھ محبت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ہنس کر بولے۔ "آج میں نے ناشتہ کیا ہی نہیں۔"

نگہت اس بری طرح شرمندہ ہوئی کہ اس کی ناک پر مارے ندامت کے پسینہ آگیا۔ اس کے پیر کانپنے لگے۔ اسی دم سلمٰی نے اپنے بازو کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آنٹی آپ یہاں آجائیے۔"

انور شرارت سے بولا۔" آنٹی گیسٹ آف آنر ہیں اس لئے ان کو ٹیبل ہیڈ پر جگہ ملنی چاہیئے۔"

اتنے میں نجمی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"آنٹی سچ آپ یہاں بیٹھ جائیے۔ پلیز۔"

نگہت کچھ نہ بول سکی اور جا کر سرے پر بیٹھ گئی۔

اس کے سیدھے ہاتھ پر سلمٰی تھی اور بائیں ہاتھ پر اسلم صاحب کی چیئر۔ نوالے اس کے حلق میں پھنستے رہے۔ وہ کوشش کر کے نوالہ نگل بھی لیتی تو حلق میں، کوئی چیز پھنسی پھنسی محسوس ہوتی

اسے حلق میں کوئی چیز پھنسی محسوس ہو رہی تھی۔

اسی دم شانو آکر بولی

"آنٹی میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر دیا ہے۔"

بیٹی کی آواز پر اسلم صاحب نے ذراسی آنکھیں کھولیں تو سامنے نگہت کو بیٹھا پایا

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ۔" نگہت نے بے تابی سے پوچھا۔

"اچھا ہی ہوں ۔ وہ ذرا اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے

"کیا میں سو گیا تھا ۔ ؟ مجھے اتنا تو یاد ہے کہ تم کمرے میں داخل ہو رہی تھیں، اس کے بعد آنکھ لگ گئی شائد ۔"

نگہت جانتی تھی کہ اسلم صاحب یہ بالکل پسند نہیں کرتے کہ وہ ان کی ذرا بھی دیکھ بھال کرے ۔ ایک طرف ان کے غصّے کا خیال اور ایک طرف خود اپنے دل کا خیال ۔ اس کا دل عجب کشمکش میں گرفتار تھا ۔ وہ اپنے محسن کا خیال کیسے نہ کرے جس نے اسے زندگی اور زندگی کی ہر نعمت بخش دی تھی ۔ وہ زیادہ سے زیادہ ڈانٹ ہی تو دیں گے نا ۔ ؟ اپنے محسن کی ایک آدھ بات سن لینا ایسا کیا بُرا ہے۔

وہ دھیرے سے اُٹھ کر ان کے پلنگ تک پہنچ گئی اور سرہانے بیٹھ کر سر دبانے لگی۔

اسلم صاحب نے ناگواری سے اسے دیکھا ۔ مگر پھر درد کی شدت کے سامنے بے بس ہو کر آنکھیں موند لیں ۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بھر آئیں ۔ آنسو چھلکنے کو بے قرار ہو رہے تھے۔

وہ کھانا کھا کر میز پر سے اُٹھی تو اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں ، وہ کیسے احسانوں کو بھولے گی ۔ اسے ایک غم یہ گھیرنے لگا کہ احسانوں کے بوجھ تلے وہ دب کر دم ہی نہ چھوڑ دے ۔

بہت سارے دن گذر گئے

جب پہلی تاریخ آئی تو اسلم صاحب نے دو نوٹ اس کی ہتھیلی میں ٹھونس دیئے ۔ نگہت نے تعجب سے انھیں دیکھا ۔

"آپ نے کہا تھا کپڑوں کے پیسے تنخواہ پر کاٹ لیں گے۔"

"ہاں کہا تو تھا۔"

"پھر۔"؟

"یہ تو نہیں کہا تھا کہ پہلی تنخواہ پر کاٹ لیں گے۔ ابھی تو عمر پڑی ہے۔"

"یہاں آکر تو اس کی زبان ہی جیسے کسی نے چھین لی تھی۔ کوئی بات ہی نہ سوجھتی۔ آج بھی وہ خاموش رہ گئی۔ اس کی اُمی کتنی خوش ہوئی تھیں۔ اس نے اسلم صاحب کی کسقدر تعریفیں کر ڈالیں ان کی زندگی سے متعلق ہر ہر چھوٹی بڑی بات اُمی کو سنا ڈالی۔ اکدم امی چونک کر بولیں

"ان کی بیوی مر چکی ہیں۔"؟

"جی ہاں۔ پھر؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اس میں بھلا ایسی کون چونک جانے ایسی بات تھی۔

بڑی دیر تک اُمی خاموش ہی رہیں۔ پھر بولیں۔

"زمانہ بُرا ہے بیٹی۔ ہر انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے۔"

وہ اتنی نادان تو نہیں تھی۔ امی کی بات اس کے دل میں جا کر چبھ گئی۔ بھلا اس قدر دیوتا صفت آدمی اور اس کے تعلق سے ایسی رکیک بات سوچی جائے۔؟

مارے غم اور غصے کے اس نے امی سے کچھ بھی نہ کہا۔ مہینے کے مہینے تنخواہ دینے، ایک دن کی چھٹی کی بات طے کی گئی تھی۔ آج پہلے ہی مہینے امی نے کیسی عجیب بات سنا ڈالی۔ اگر وہ ایسے ویسے آدمی ہوتے تو ایک مہینہ تو خیر لمبی مدت ہے۔ ایک دن میں ہی شیطانی حرکت کر سکتے تھے۔ مگر امی کو کون سمجھائے دن بھر اپنے چھوٹے سے بے رنگ کمرے میں اکیلی پڑی رہی۔

دوسرے دن بھی وہ یونہی پڑی رہی۔ شام کو جب گلی میں سناٹا چھا رہا تھا۔ موٹر کے تیز ہارن کی آواز گونجی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ آواز نگہت کی جانی پہچانی تھی۔ اسلم صاحب کا دھیمے دھیمے انداز سے دروازہ پیٹنا۔ کئی بار جب وہ دروازہ

بند کئے لیٹی رہتی تو بجائے نوکروں یا بچوں کے خود اسلم صاحب اُسے کھانا کھانے کے لئے بلاتے
ایسے میں آکر وہ ہلکے ہاتھ سے دستک دیتے وہ سمجھ جاتی ۔ اس نے دروازہ کھولا اور اسلم صاحب
بغیر کسی تکلف کے اندر چلے آئے ۔ اس نے اتنی صاف دلی سے نہ آنے کی وجہ بتا دی ۔ اس
کا سارا غصہ اپنی امی پر تھا ۔ اسلم صاحب کس قدر دلنواز صفت آدمی تھے ۔ ذرا تو نہ چڑے ۔
بلکہ الٹا اس کی امی کی ہاں میں ہاں ملانے لگے کہ "آپ ٹھیک سوچتی ہیں ، زمانہ ہی ایسا ہے ۔"
پھر انھوں نے دبی زبان سے یہ کہا کہ آخر وہ خود بھی کیوں نہیں نکہت کے ساتھ رہنے
آجاتیں ۔ وہ ٹھیں سید صاحب کی بیوی ، ان کی غیرت کہاں برداشت کرپاتی ۔ ویسے وہ اسلم
صاحب کے اخلاق سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ پھر کبھی تو ان کے بارے میں کچھ نہ کہا ۔
وہ کار میں بیٹھ کر ان کے ساتھ کوٹھی چلی آئی ۔ اور دن پھر اسی انداز سے بہاریں کر
گزرنے لگے ۔

ایک دن اسلم صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نکہت تینوں بچوں کو بڑے عجیب
انداز سے سمجھا رہی تھی ۔

"بچو ! تمہیں معلوم ہے ڈیڈی اتنے امیر کیوں ہیں ۔" ؟

بچوں نے کوئی معقول جواب نہیں دیا تو وہ بولی ۔ تمہارے ڈیڈی کبھی اللہ کو
نہیں بھولتے نا ۔ اس لئے ۔ بھلا بتاؤ تو تم میں سے کسی نے کبھی ڈیڈی کی طرح نماز پڑھی
ہے ۔ یا خدا کا شکر ادا کیا ہے ۔" ؟

بچے شرمندگی سے سر ہلانے لگے ، تو وہ بولی ۔ آخر تمہیں اور کسی سے نہیں تو ڈیڈی سے
ہی کچھ سیکھنا چاہیئے ۔ تہدیدی انداز میں انگلی اٹھا کر بولی ۔ آج تک میں نے کسی کو مارا نہیں ہے
لیکن اگر کسی نے نماز قضا کی تو اسے بید سے ماروں گی ۔"

بچے یہ محبت بھری دھونس سن کر ہنسنے لگے ۔ ساتھ ہی نکہت بھی ہنسنے لگی ۔
اور پھر انھوں نے دیکھا کہ ان کے کمرے سے ملا ہوا ان کا اپنا نماز کا کمرہ تھا وہاں اب
دن میں دو تین بار بچے نماز ادا کرتے دکھائی دیتے ۔ نکہت خوشبودار اگربتیاں سلگا کر گردان

میں رکھ دیتی اور کمرہ عجیب مقدس خوشبو سے مہکتا رہتا،

اسلم صاحب بڑی خوشی سے یہ سب کچھ دیکھا کرتے اور سوچتے کہ انھوں نے نگہت کو رکھ کر کتنا اچھا کام کیا ہے۔ نگہت جو بہت اچھی اور بہت شریف لڑکی تھی، جو بڑے معصوم انداز سے انھیں دیکھا کرتی تھی۔ اور خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا بالکل بچوں کے سے انداز میں اعتراف کرتی

اس دن کام سے بور ہو کر وہ روالونگ چیئر پر آدھے لیٹے آدھے بیٹھے کوئی ناول دیکھ رہے تھے۔ یونہی پڑھتے پڑھتے انھوں نے کرسی گھمائی تو ان کی نگاہیں سامنے اُٹھ گئیں۔ نگہت خوشبودار دھوئیں میں گھری بڑی عاجزی سے کہہ رہی تھی۔

"خداوند عالم —— میں اپنا یہ گناہ کبھی نہ بھولوں گی۔ آج میری وجہ سے کسی معصوم کے آنسو بہے ہیں —— تو مجھے معاف کر دیگا نا۔؟"

شاید اس نے بچی کو ڈانٹا ہو گا۔ اور وہ ضرور روئی ہو گی۔ تبھی تو۔

اسلم صاحب کو سچ مچ ہنسی آ گئی جب وہ کمرے سے نکل کر جانے لگی تو انھوں نے اسے بلا کر پوچھا۔

"تم خدا سے باتیں بھی کرتی ہو —— ؟"

وہ معصوم لہجے میں بولی —" جب کبھی میں اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کرتی ہوں، خدا کے سامنے سر جھکا کر سب کچھ کہہ ڈالتی ہوں۔ میرے دل کو بڑا سکون مل جاتا ہے —"

وہ ہنسنے لگے —کس نے سکھایا تمہیں اس طرح بوجھ ہلکا کرنا۔ وہ آنکھ جھپکا کر بولی — "کسی نے بھی نہیں —— دراصل مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا اس طرح ہماری بات سن لیتا ہے —"

اور پھر کیا ہوتا ہے؟

وہ کچھ دیر یونہی ساڑی کا پلو انگلی پر لپیٹتی رہی پھر بولی

اگر ایسا نہ کروں تو شائد دل پھٹ کر رہ جائے —" اس نے ایک اچٹتی نگاہ سے دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

اب نگہت کوٹھی کے ماحول سے، اس گھر کے باسیوں سے، ان کے عادات واطوار سے اس قدر واقف ہو چکی تھی کہ گھر کی فرد بن کر رہ گئی تھی۔ اسے ہر ہر بات معلوم ہو چکی تھی۔ ہر پروگرام اسی کی مرضی سے بنتا۔ اب خود وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اس گھر کا سب سے اہم فرد ہی وہ ہے۔ ایک دن اس بات پر اس نے اپنے آپ میں بہت دیر تک حیرت کی کہ آخر اس کے بغیر اب تک کوٹھی والے زندہ کیسے تھے۔

ماں باپ کو اپنی پہلی اولاد سے بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ اسلم صاحب بھی سلمیٰ کے دیوانے تھے۔ یوں وہ ایک سنجیدہ مزاج رکھتے تھے مگر ان کے چہرے پر ہنسی اسی وقت آتی تھی جب وہ بچوں کے ساتھ یا سلمیٰ کے ساتھ باتیں کر رہے ہوتے۔ (یا پھر آجا کے ان کی مسکراہٹ کا راز نگہت تھی)

ادھر نگہت کی مسلسل دیکھ ریکھ نے بچوں کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ سلمیٰ جو ایک اونچی سی دُبلی پتلی لڑکی تھی اب ایکدم ایک تندرست جوان لڑکی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ غیر محسوس طریقے پر وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ ایکبار دل ہی دل میں اسلم صاحب نے یہاں تک سوچ لیا کہ اب اس کی شادی کر دینی چاہیئے۔

اسلم صاحب نے جب نگہت کے سامنے یہ سوال ڈالا تو نگہت پہلے تو خوب زور سے ہنسی۔ پھر ایکدم سنجیدہ ہو گئی۔ سلمیٰ کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ جب کہ وہ خود اکیسویں میں تھی۔ کیا اسے خود بھی ایک ساتھی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلم صاحب نے اس سے ہنس دینے کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔

"ابھی سے۔ اتنی چھوٹی تو ہے سلمیٰ۔"

"لڑکیاں کبھی چھوٹی نہیں رہتیں۔ میں تو آج کل اس مسئلے پر شدت سے غور کر رہا ہوں۔"

نگہت چپ رہ گئی۔ سلمیٰ جلدی جلدی قدم اٹھاتے اٹھاتے اب نگہت کے بازو ضرور آکھڑی ہوئی تھی۔ مگر عمر تو نگہت ہی کی زیادہ تھی نا۔ پھر اسے امی کا کہنا یاد آیا کہ بیٹیوں کو زیادہ دن بٹھانا نہیں چاہیئے۔ پھر اسے اپنے منگیتر کا خیال آیا۔ (جسے پہلے وہ اس قدر چاہتی تھی)

پھر اکدم امی کا رویہ یاد آ گیا۔ پتہ نہیں اس دن کیسے اس کی شادی کا ذکر چل نکلا تو وہ اسکی کسی سہیلی کے سامنے کہہ اٹھی تھیں "ابھی جلدی کیا ہے۔" نگہت کو کس قدر حیرت ہوئی تھی ۔؟ پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ آخر امی نے بھی اپنی عمر میں آنسو ہی رولے ہیں۔ اب کہیں عمر کے اس دور میں آ کر انہیں عیش میسر ہوا ہے۔ تو وہ یہ نہیں چاہتیں کہ گھر آئی لچھمی یوں چلی جائے۔ نگہت جائے گی تو اس کی دولت بھی چلی جائے گی۔ اور داماد کے یہاں رہنا انہیں کب قبول تھا۔ (وہ سید صاحب کی بیوی تھیں)

اس دن نگہت اتنی اداس رہی۔ اس کا دل کسی کام میں نہ لگا۔ یونہی دل بہلانے کو وہ گڑیا بنانے بیٹھ گئی جس کے لئے ایک مدت سے نجمی اصرار کر رہی تھی۔

"ہائے اللہ آپ کس قدر خوبصورت گڑیا بنا لیتی ہیں۔"

سلمیٰ بیٹھی نٹنگ کر رہی تھی وہیں سے سر اٹھا کر بولی۔

"آنٹی کون سا کام بُرا کرتی ہیں۔"

نجمی ہنس کر بولی۔ آنٹی اپنے بچوں کو تو خوب گڑیا بنا کر دیں گی۔ ناں۔"؟

گڑیا نگہت کے ہاتھ سے چھوٹ گری۔ مگر اس نے پھر سنبھال لی اور بے دلی سے ہنس دی۔ نجمی سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔

"کیوں آنٹی آپ شادی نہ کریں گی۔"

نگہت چپ رہی۔

"ارے ہاں آنٹی۔ سلمیٰ ہنس کر بولی۔" اس دن کون صاحب تھے وہ۔ جو آپ سے ملنے آئے تھے۔"

"میرے فیانسی تھے۔" وہ ٹانکے لگاتے ہوئے بولی۔

"بے حد اسمارٹ ہیں۔ مجھے تو بہت پسند آئے بھئی انکل۔"

ابھی ابھی تک کی بات تھی کہ کوئی سلمان کی تعریف کرتا تو نگہت اسے اپنی خود کی تعریف سمجھ کر جھوم جایا کرتی۔ مگر آج یہی بات سلمیٰ کے منہ سے سن کر اُسے ذرا بھی خوشی نہ ملی۔ یونہی بے دلی

سے وہ گڑیا مکمل کرتی رہی ۔ اسے یہ سوچ کر بے حد خوشی ہوئی اور سکون ملا کہ امی اس کی شادی کے بارے میں ابھی بالکل تیار نہیں ہیں)

"وہ آپ کو اس قدر چاہتے ہیں آنٹی ۔" سلمی اس سے دوستوں کا سا رویہ رکھتی تھی اور مذاق بھی کرتی تھی ۔ "اس دن آپ کسی کام سے اٹھ کر اندر آئیں تو کہنے لگے ۔ میری نکہت جیسا کوئی تو ہولے ۔ ہائے اتنے جولی فیلو ہیں ۔ سدا ہنستے ہی رہتے ہیں اور سنئے انٹی" سلمی نے اسے خوشخبری سنانی چاہی ۔ "وہ بیچارے آجکل کام نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں نا تو ڈیڈی انھیں اپنی فرم میں کوئی کام دینے کا سوچ رہے ہیں ۔"

سلمی نے مسکرا کر آنٹی کو دیکھا ۔ مگر آنٹی بیٹھی گڑیا کی آنکھیں بناتی رہی ۔

اس دن اسلم صاحب اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے کہ نماز کے کمرے سے خوشبودار دھوئیں میں لپٹی ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی ۔

"تو میری مسکراہٹوں کا امین ہے ۔"

نکہت کی آنکھوں سے آنسو گرے اور اسلم کی پیشانی پر ٹپک پڑے ۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا ۔ نکہت اب تک ان کا سر دباتی بیٹھی تھی ۔

"تو مجھے رلا کیوں رہا ہے خداوند ۔ تو میری مسکراہٹوں کا امین ہے ۔ ایک چھوٹی سی دعا تجھ سے مانگی تھی کیا وہ بھی قبول نہ ہوگی ۔؟ دل ہی دل میں نکہت دعائیں مانگ رہی تھی ۔ اسلم صاحب بڑی دیر سے اس سے پوچھ رہے تھے ۔

"تم کیوں رو رہی ہو نکہت ۔"

نکہت بوکھلا کر بولی ۔ "آپ کے لئے ۔ آپ جلدی سے اچھے ہو جائیے ۔ گھر کتنا سنسان دکھائی دینے لگا ہے ۔

اسلم صاحب مسکرائے ۔ "گھر تو اس لئے سنسان ہے کہ سلمی اپنی بچی کو لے کر چلی گئی ہے ۔"

"سلمی کی بچی کی وجہ تو گڑبڑ تھی ہی ۔ مگر آپ ادھر پلنگ سے جو لگ گئے ہیں ۔" نکہت آنسو روک کر بولی ۔

"عمر بھی کہاں تک ساتھ دے آخر ۔" وہ بے بسی سے بولے

"عمر؟ آپ کی عمر ۔ ؟" نگہت حیرت سے بولی ۔ "میرے خیال سے آپ کسی طرح چار پینتالیس سے زیادہ نہیں ۔"

انھوں نے اپنا سر ہلایا ۔ "ادھر دیکھو ۔ یہ چمکتا ہوا سفید بالوں سے بھرا سر دیکھو ۔ یہاں غم اور عمر نے ساتھ ساتھ نشان چھوڑے ہیں ۔"

"غم ۔ ؟" نگہت کی حیرت دو چند ہو گئی ۔ آپ کو کون الغم ہیں ۔ خدا نے اتنی آسائشیں دے رکھی ہیں ۔ عزت، شہرت، اولاد، دولت سبھی کچھ تو دیا ہے ۔ یہ بھی کیا کم بات ہے کہ اپنی اولاد کی شادیاں بھی آپ اپنے ہاتھوں کر رہے ہیں ۔ سلمیٰ اپنے گھر ہے اور بہت خوش ہے آپ کو کون سے غم ہیں ۔

اسلم صاحب ریکارڈ کی طرح بجتے چلے گئے ۔

نگہت تم ان باتوں کو سمجھنے کے لئے بہت چھوٹی ہو ۔ ایک مرد اپنی زندگی میں صرف دولت، عزت، اور شہرت ہی کا خواہش مند نہیں رہتا اسے سب سے پہلے عورت کا پیار چاہئے شادی میری بھی ہوئی ۔ ازدواجی زندگی میں نے بھی گزاری ۔ مگر وہ زندگی کہاں ملی کہ جسے پاکر خوش ہو سکتا ۔ شاہینہ نے کبھی مجھے وہ مسرت دینے کی کوشش ہی نہیں کی ۔ جو ایک مرد اپنی بیوی سے چاہتا ہے ۔ پھر بھی میں سوچ کر خوش تھا کہ اچھی خاصی زندگی ہے ۔ بیوی ہے، بچے ہیں ۔ کہ بیوی بھی چھوڑ گئی ۔ بچوں کا کیا ہے ۔ سلمیٰ کی شادی ہو گئی ۔ انوار لندن جانے کی دھن میں ہے ۔ اور رہی شانو تو کسی دن وہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی ۔"

نگہت نے کچھ بھی جواب نہ دیا ۔ آنسوؤں نے اس کا گلا دبوچ رکھا تھا ۔ ابھی وہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھول ہی رہی تھی کہ جوتوں کی رپ رپ ہوئی اور ساتھ ہی افضل صاحب کمرے میں چلے آئے ۔ اسلم صاحب نے ذرا سا سر اٹھا کر انھیں دیکھا ۔ اور نحیف آواز سے بیٹھنے کو کہا جانے اس ایک لمحہ میں کیا بات ہوئی ۔ کہ اسلم صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا اور انھوں نے ناگواری سے آنکھیں بند کر لیں ۔

دو تین دن اس قدر خاموشی سے گزرے کہ کئی بار نگہت نے یہ محسوس کیا کہ جیسے وہ کوٹھی نہ ہو قبرستان ہو۔ اور چوتھے دن اسلم صاحب نے اچانک نگہت سے کہا۔

"اب میں سمجھتا ہوں کہ اس گھر کو تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اگر تم سروس چھوڑ دو۔"

اگر کوئی نگہت کے جسم سے بجلی کا تار لگا دیتا۔ تب بھی وہ اس بری طرح نہ چونکتی جتنا کہ اس جملے سے چونکی۔

"جی۔" وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بس اتنا بول سکی

"ہاں۔ اب تم سروس چھوڑ دو۔"

مگر کیوں۔ ؟ ؟ وہ ڈھٹائی سے پوچھ رہی تھی۔

کہہ جو دیا۔ تمہاری ضرورت نہیں۔"

اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "مگر مجھے تو آپ کی ضرورت ہے۔"

اسلم صاحب نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے بات پلٹ دی۔ گھر کو ہو نہ ہو، آپ کو میری ضرورت ہے۔ ابھی آپ کے گھٹنے کا زخم بھرا نہیں ہے۔"

گھٹنے کا زخم۔" ؟ ؟

"ہاں اور جب تک آپ صحت مند نہیں ہو جاتے میں یہاں سے قدم بھی نہ اٹھاؤں گی چاہے آپ دھکے دیکر ہی کیوں نہ نکالنے کی کوشش کریں۔"

اسلم صاحب سر سے پیر تک ایک کمزور خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز لرز کر رہ گئے یہ نگہت کیوں اس قدر ڈھیٹ ہے۔ کیوں اس قدر مخلص ہے۔ انھیں تو آج تک کسی نے اتنی محبت سے اتنی ضد سے مجبور نہ کیا تھا۔ یہ کیسی پاگل لڑکی ہے۔

"مجھے معلوم ہے آپ مجھے کیوں نکال دینا چاہتے ہیں۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"وہ کیوں بھلا۔" ؟ اسلم صاحب نے ٹوہ لینی چاہی۔

"دراصل میں کام کچھ نہیں کرتی اور مفت میں دو سو روپے لے لیتی ہوں۔"

"ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔ اسلم صاحب جل کر بولے۔ کتنی سچی بات کہی کہ

جی خوش ہوگیا۔ وہ نگہت کو گھور کر بولے ۔" اب تم دنیا والوں کی آنکھوں میں کھلنے لگی ہو۔ افضل صاحب تمہیں میری .... آگے اسلم صاحب کچھ نہ کہہ سکے ۔ان کی زبان گنگ سی ہوگئی ۔

"جی ۔" نگہت آنکھیں پھیلا کر بولی۔

وہ دھیرے دھیرے بول گئے ۔" وہ تمہیں میری بیوی سمجھتے ہیں ۔"

نگہت بالکل نہ چونکی ۔ گویا یہ بات خود بھی مدت سے اس کے دل میں رہی ہو۔ جیسے ۔ اس میں اتنی پریشانی اور غم اُٹھانے کی کیا بات ہے۔ اگر انھوں نے ، یا ساری دنیا نے ہی ،ایسا سمجھ بھی لیا تو کیا برا کیا ۔ کیا میں آپ کی بیوی نہیں بن سکتی ۔ کیا میں اس قابل نہیں۔ کہنے والے اور سمجھنے والے کچھ بھی کہتے اور سمجھتے رہیں ۔ اس سے ہمارا کیا بنتا اور بگڑتا ہے" وہ رسان سے بولی۔

اسلم صاحب بپھر گئے ۔" کچھ بگڑتا ہی نہیں ۔؟؟ تمہاری کوئی عزت ہے یا نہیں ۔ میں بڑا آدمی اور پھر بوڑھا آدمی ۔ کوئی میری طرف انگلی اُٹھائے بھی تو کچھ نہ بگڑے گا۔ مگر تم اکیلی لڑکی ہو۔ تمہیں اپنی زندگی شروع کرنی ہے ۔ابھی تمہاری شادی ہونی ہے ۔ تمہیں دوسرے کے گھر جانا ہے ۔ اس سے تمہارے جیون پر کتنا بُرا اثر پڑے گا ۔ اور پھر سلمان سنے گا تو کیا سوچے گا۔"

نگہت کو جیسے کسی نے آسمان سے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسلم صاحب کو دیکھنے لگی۔ اس انسان میں فرشتوں کی سی پاکی آئی کہاں سے ۔ یہ انسان ہے یا کوئی آسمانی مخلوق ۔ وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں کھولے انہیں دیکھتی رہی ۔ بڑی دیر بعد جیسے اسے ہوش آیا تو وہ جاتے جاتے بولی

"مجھے دنیا کی کوئی پروا نہیں ۔ مجھے اپنے محسن سے بڑھ کر کوئی بھی عزیز نہیں ۔"

رات کو سب سو گئے ۔ مگر نگہت کے کمرے کی لائٹ دیر تک جلتی رہی ۔ اسلم صاحب کے زخم میں آج رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھی ۔ اس قدر اچانک وہ گر گئے تھے کہ وزن ہی نہ سنبھال

سکے اور ٹیک سے نیچے لڑھک پڑے۔ اس دن موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کے بعد سنہری دھوپ نکل آئی تھی ۔ ایسے میں بچوں نے نکہت سے پکنک کا کہا تو اس نے اسلم صاحب کو بھی گھسیٹ لیا۔ کمپنی گارڈن سے لگ کر ایک ٹیک تھا۔ جو کافی اونچا تھا۔ چوٹی پر پیلے نیلے جنگلی پھولوں کے پودے تھے۔ اور دھوپ میں چمکتی ہوئی سبز گھانس ۔ وہ سب پھولوں کی تلاش میں اوپر جا رہے تھے ۔ اور پھر جانے کیسے ان کا پاؤں پھسلا اور لڑھکتے ہی چلے گئے ۔ جب انھیں موٹر میں لا کر گھر لایا گیا تو تکلیف کی شدت سے تب تک ان کا پاؤں اچھا خاصا سوجھ چکا تھا۔ کنپٹی کے پاس ایک ہلکی سی چوٹ آئی تھی۔ جس سے ان کا سر دھمک رہا تھا۔ نکہت اپنے آپ کو بھول بیٹھی تھی۔ اسلم صاحب نے اسے کبھی اجازت نہ دی تھی کہ وہ ان کا کوئی کام کرے۔ پہلے تو نکہت ہاتھ مل مل کے بےبسی سے باہر کھڑی رہی ۔ پھر اس سے صبر نہ ہو سکا۔ تو ۔ نجمی سے کہہ کر ڈاکٹر کو فون کروا دیا، اور خود بے تابی کے ساتھ ان کے سرہانے جا بیٹھی ۔ وہی لمحہ ایک ایسا لمحہ تھا جب ان کے سرہانے بیٹھ کر اس نے اپنی زندگی کے ہر ہر دن کے بارے میں سوچا تھا۔ اشتہار سے لے کر آج تک کی زندگی ۔ اس کا آنا ۔ رہ جانا، سب میں گھل مل جانا ۔ گھر کی ایک اہم ہستی بن کر رہ جانا، پھر سلمیٰ کی شادی اپنا کنوارپن ۔ سلمان کی محبت ۔ اسے سب کچھ یاد آیا ۔ وہ ذہن کی آنکھوں سے ہر منظر کو گزرتا دیکھتی رہی۔ اور پھر وہ لمحہ اسلم صاحب نے گھر چھوڑ دینے کو کہا۔

بھلا وہ اس گھر کو چھوڑ سکتی تھی ۔ ؟؟

پھول کبھی ڈال سے جدا ہوا ہے۔ ؟؟ ہوتا کیوں نہیں ۔ ضرور ہوتا ہے مگر پھر مر بھی تو جاتا ہے نا ۔ ؟؟

نکہت کے دل میں گویا بے غیرتی نے گھر کر لیا تھا۔ وہ دن رات اس تندہی سے اسلم صاحب کی خدمت کر رہی تھی کہ ساری دنیا کو بھول کر رہ گئی تھی ۔ اس نے اسلم صاحب کی اس قدر بے لوث خدمت کی ۔ ان کو اتنا سکھ دیا، ان کے لئے اتنی جاگی کہ خود اپنی صحت برباد کر ڈالی ۔ اور ایک دن اسلم صاحب نے اسی خوشبودار دھوئیں میں لپٹی وہ بھرائی ہوئی دعا

سنی۔ "میرے مالک تو میری عمر بھی انہی کو دیدے۔"

میں یہ سمجھتی ہوں کہ عورت صرف محبت سے عبارت ہے۔ میں عورت ہوں میرا وجود بھی محبت ہی محبت ہے۔ میں کیسے اپنے منہ سے اقرار کروں، مگر محبت بھی کہیں چھپائے چھپ سکی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اگر صحیح معنوں میں کسی کو چاہا ہے تو صرف اسلم صاحب کو، ۔ مگر میرے سینے میں یہ خلش کانٹا بن کر کھٹکتی ہے کہ میں ان کا دل کیوں نہ جیت سکی ۔ مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے، جب ٹوٹے ہوئے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر میں نے اسلم صاحب کو ایک خط لکھا تھا۔ میں نے کوئی چاپلوسی نہیں کی تھی، کوئی خوشامد نہیں کی تھی، مگر ہوا یوں کہ جب میرا خط ان تک پہنچا تو اوروں کے خط بھول گئے اور مجھے اپنے بچوں کے لئے رکھ لیا۔

محبت کا دیوتا کیوپڈ، سنا ہے اندھا ہوتا ہے۔ جانے کیا بات تھی، جب میں نے اسلم صاحب کو پہلی بار دیکھا۔ تبھی میں نے محسوس کیا کہ میں کچھ کھو رہی ہوں، کچھ پا رہی ہوں۔ میں نے کیا کھویا تھا ۔ شاید اپنا دل ۔ مگر کیا پایا ۔ آج تک نہ سمجھ سکی ۔ شائد محبت پائی ۔ مگر یہ تو میرا وہم ہے۔ میں نے صرف کھویا، پایا کچھ نہیں۔ وہ دن وہ لمحہ مجھے آج تک نہیں بھولتا۔ جب پہلی بار میں مجبور سی ہو کر اسلم صاحب کے گلے لگ گئی تھی ۔ اس لمحے میں نے یوں محسوس کیا تھا کہ میں آسمان کے محفوظ سائے تلے آ گئی ہوں ۔ اب مجھے کوئی ڈر نہیں ۔ کوئی فکر نہیں ۔ سچ مچ اسلم صاحب میرے لئے آسمان تھے ۔ وہ میرے سر پر آسمان بن کر تن گئے اور میں سب کچھ بھول گئی۔

سب کچھ بھول گئی اور یہ بھی بھول گئی کہ وہ ایسی چیز نہ تھے کہ جسے میں پا سکتی ۔ میں بیس سال کی ایک لڑکی، ۔ جس نے دنیا میں صرف غم ہی غم دیکھے تھے۔ خوشیوں کے گہوارے میں جھولنے لگی، مجھے ان کے سفید بال، ان کے قدرے جھکے جھکے اعصاب، ان کا دھیما دھیما انداز تکلم ۔ ان کی چال ڈھال ہر ہر چیز سے کسقدر گہری محبت تھی۔؟ (تھی ۔؟؟

میں صیغۂ ماضی میں کیوں استعمال کر رہی ہوں ؟)
میں تو پہلے لمحے ہی بھانپ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو کر رہے گا۔ کتنے پیار سے انھوں نے
مجھے ساڑیاں لا کر دی تھیں ۔ وہ محض ایک بات تھی اور اب مجھے ایک ساتھ کتنی باتیں یاد آتی ہیں
آرہی ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ تنخواہ پر کپڑوں کے پیسے کاٹ لیں گے۔ مگر کبھی وہ لمحہ نہ آیا۔
جب وہ اپنا وعدہ پورا کرتے ۔ یوں ان کا وعدہ سے پھر جانا بھی کتنا بھلا لگتا تھا مجھے۔ ؟
میں آج تک نہ جان پائی کہ ان کی فطرت میں یہ نیکی کہاں سے آ کر پڑی تھی۔ پہلی بار جب
میں نے ان کی کوٹھی میں قدم دھرا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ کبھی مجھے ان سے شکایت کا موقع نہ ملا۔
کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ وہ مجھے کسی بات پر ڈانٹ دیں۔ یہ نہیں تو مجھے ہی ان کی کوئی بات بُری
لگنے لگے۔ کہ میں انہیں چھیڑ سکوں (شاید اسی طرح محبت کا سویا دیوتا جاگ پڑتا!) مگر وہ تو برف
کی چٹان تھے ۔ کبھی میں نے اس بات پر لڑنا بھی چاہا، کہ آخر آپ مجھے دو سو روپے کاہے کے
دیتے ہیں ۔ کچھ کام دھام میں نہیں کرتی۔ موٹر میں گھومتی ہوں ۔ نت نئے کپڑے اور زیورات
پہنتی ہوں اور پھر بھی تنخواہ جوں کی توں برقرار ۔ بچوں کا بے حد کم کام میرے ذمہ تھا (میں تو
جیسے اس گھر میں رانی بن کر ہی آگئی تھی) اسلمیٰ سب سے بڑی تھی اور وہ بہت کم میری مدد لیا کرتی تھی۔ پہلے
ہی دن میں نے اس کا کام کرنا چاہا تو اس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ لڑکیاں جب بڑی ہو جاتی ہیں تو اپنی
تنہائیوں کا کسی کو بھی ساتھی نہیں بنانا چاہتیں ۔ اور پھر بعد میں تو اس کی شادی ہو گئی ۔ رہے انوار
نجمی (نجمی جسے اسلم صاحب اپنی مرحومہ بیوی کے نام پر اکثر شالو کہہ کر پکار لیا کرتے تھے) ان کا کام ہی
کیا تھا ۔ بس نگرانی ۔ نوکر تو خود ہی ڈھیر سارے موجود تھے۔ اور پھر اسلم صاحب جو اتنی بڑی
تجارتی فرم کے مالک تھے۔ وہ بھلا مجھے کسی کام کو ہاتھ لگانے دیتے۔ ؟؟ وہ تو چاہتے تھے کہ میں
پھول تک نہ توڑوں (مگر ہائے انھوں نے میرا پھول جیسا دل توڑ دیا ۔)
بیماری میں انسان ایسی تنہائی اور ویرانی محسوس کرتا ہے کہ سارے کفر ٹوٹنے لگتے ہیں
جب وہ ٹیک پر سے گرے تھے اور درد سے بے حال تھے۔ اس لمحے میں نے ان کے سارے حکم
بھلا دیئے اور ان کی تیمارداری میں جت گئی۔ وہ مجھے بار بار منع کرتے۔ مجھے گھور بھی لیتے۔ مگر

کبھی وہ نگاہ نہ پھینکی کہ جسے میں محبت کا نام دے سکوں۔ اندھیرے اجالے کتنے ہی ایسے موقعے آئے ہوں گے مگر انھوں نے کبھی میرا ہاتھ پکڑ کر اسے چومنے تک کی بھی کوشش نہ کی۔ یہ جان کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کہ میں اتنے سال ان کے ساتھ رہ کر بھی ان کی محبت حاصل نہ کر سکی۔!

کیا میں اتنی بری تھی۔؟؟

میرے لانبے لانبے بال ہیں۔ مدھ ماتی آنکھیں ہیں۔ اونچا سا ڈولتا ہوا قد ہے۔ سانولی رنگت ایسی روشنی لئے ہے جیسے برسات کی شام کو بادل برس چکنے پر سورج نکل آئے۔ عریبی کے دنوں کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو ان دنوں کی بات سنا رہی ہوں، جب محبت کا تیر کھا کر میرے نینوں کے چراغ ستاروں سے بھی بڑھ کر روشن ہو گئے تھے کیا ان چراغوں میں اتنی روشنی بھی نہ تھی کہ کسی کو اپنی طرف کھینچ سکتے۔ میں نے تو یہی سنا ہے کہ اندھیری راتوں میں بھٹکنے والے سدا روشنی کی طرف لپکتے ہیں۔ پھر۔ پھر۔

وہ مجھے نیلی گاڑی کے فرنٹ سیٹ پر اپنے بازو بٹھا کر شاپنگ کو لے جاتے ہیں۔ پکچر دیکھنے لے جاتے ہیں۔ سب لوگ ہم دونوں کو دیکھتے تو مجھے کبھی یہ غم نہ ستاتا کہ میرے جوان اور تنے ہوئے اعضا کے مقابلے ان کا جسم قدرے جھکا جھکا سا دکھائی دیتا ہے۔ میرے سیاہ لچھے دار بالوں کے مقابل ان کے بال چاندی کے تاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ یہ ایسی غم کی بات بھی کہاں تھی، اندھیرے اجالے سدا ہی ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ جب شاپنگ کر چکنے کے بعد وہ مجھ سے کہا کرتے۔

"نکہت ذرا بل تو پے کر دینا۔"

اس لمحے مجھ میں ایک بیوی کی سی فرمانبرداری آجاتی تھی۔ اور جب کبھی پکچر دیکھتے ہوئے وہ مجھ سے کسی سین کے بارے میں رائے پوچھتے تو میں خود ہی مغرور ہو جاتی۔ لیکن میری خوشیاں اور میرا غرور کس قدر چھوٹا تھا۔!؟

اور پھر اس دن میری خوشیوں کی آخری کرن بھی دم توڑ گئی۔ اس دن اسلم صاحب کی رشتے کی کوئی بہن ان سے ملنے آئی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ بیٹھے ڈرائنگ روم میں باتیں کرتے

ہے اور میں ادھر سلمیٰ کی بچی کو بہلاتی رہی۔ کسی کام سے اُٹھ کر میں ادھر گئی تو میرے کانوں نے مدھم سی بھن بھناہٹ سنی، میرے قدم یوں ہی رک گئے۔ آپا کہہ رہی تھیں۔

"اسلم میاں مجھے تو وہ لڑکی بہت پسند آئی ہے جو تمہارے بچوں کا کام کرتی ہے۔"

"جی ہاں بہت اچھی لڑکی ہے۔" وہ سیدھے اور مدھم لہجے میں بولے

"پھر یہ تو بہت اچھا ہے کہ تمہیں بھی پسند ہے۔"

"جی —" وہ ذرا چونک پڑے۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ تم اسے ہمیشہ کے لئے ہی اپنے ہاں رکھ لیتے تو۔"

وہ جیسے اچھل کر بولے۔ "آپ کا مطلب — اس سے شادی کر لوں۔"

"اور کیا کہہ رہی ہوں۔" وہ ذرا ہنس کر بولیں۔

تھوڑی دیر بڑی عجیب خاموشی رہی، پھر بولے۔ "مگر مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔"

میں وہیں کھڑی کئی بار جی اور کئی بار مری۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"اس کی عمر کا فرق بھی آپ نے دیکھا ہے آپا۔ اور پھر آپا اس کی خود شادی ہونے والی ہے۔ اس کا منگیتر سلمان، میری ہی فرم میں کام کرتا ہے۔ بڑا اچھا لڑکا ہے، اسے بے پناہ چاہتا ہے۔"

اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" آپا بولیں۔ "سوال لڑکی کی پسند کا بھی ہوتا ہے۔"

وہ بولے۔ "آپا آسمان پر ایک ساتھ چاند سورج نہیں جگمگا سکتے۔ یا تو چاند چمک لے یا سورج ہی۔"

"تو سورج ہی چمک جائے۔" آپا ہنس کر بولیں۔

وہ بھپر گئے۔ "یہ تو میں نے بات جیسی بات کہی آپا۔ آپ خواہ مخواہ کسی کو میرے سر لادنے کی کوشش کیوں کر رہی ہیں۔"

اور تب میں نے جانا کہ دنیا میں خوشی کے لمحے کس قدر کم ہوتے ہیں۔ مجھے برسات کی وہ شامیں بہت پسند ہیں جب ہلکی ہلکی پھوار آسمان سے گرتی ہے۔ اور چہرہ بھیگ جاتا ہے۔ اور پھر یوں ہوا کہ میری آنکھیں خود برسات برسانے لگیں۔ اور چہرہ سدا بھیگا رہنے لگا۔

اس دن جب انھوں نے افضل صاحب کی کسی رکیک حرکت پر چڑ کر کہا تھا کہ وہ ہمارے تعلقات کو غلط رنگ میں دیکھنے لگے ہیں۔ تب میں کس قدر خوش ہوئی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اس طرح وہ خود کو اور مجھے دنیا والوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے بچانے کے لئے کوئی ایسا راستہ اختیار کر لیں گے جہاں کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔" شاید — شاید ہم ایک ہو جائیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے سوچا تھا۔ مگر۔ مگر!؟

میں نے یہ بھی تو سوچا تھا کہ چونکہ انھوں نے بیوی کی محبت دیکھی ہی نہیں ہے۔ تو شاید اس طرح وہ میری خدمت گزاری اور بے پناہ پیار کو دیکھ کر میری طرف جھک جائیں گے۔ مگر وہ تو یوں ہی آسمان بنے میرے سر پہ تنے رہے۔ بھلا آسمان بھی کہیں زمین پر جھکا ہے۔ ؟ نہ آسمان زمین تک آسکا ہے۔ نہ زمین کبھی اتنی اونچی ہو سکتی ہے کہ بڑھ کر آسمان کو چھو لے۔

مجھے آج نہ کل، کبھی نہ کبھی سلمان کا ہونا ہی ہے۔ مگر کلیجے میں ایک پھانس سی اٹکی ہوئی رہتی ہے۔ میں کیوں ان کی محبت حاصل نہ کر سکی۔ انھوں نے مجھ سے شادی نہ کی، نہ کرتے۔ مگر کبھی اتنا تو کہہ دیتے — "میں تم سے محبت کرتا ہوں

" میں نکہت سے محبت کرتا ہوں۔"

ادھر جب سے سلمٰی کی شادی ہوئی تھی کوٹھی کی رونق اک دم کم ہو گئی تھی۔ اور پھر جب سلمٰی کی بچی ہوئی اور وہ بچی کو لے کر بار بار آنے اور جانے لگی تو بے رونقی میں اور اضافہ ہو گیا سلمٰی اسلم صاحب کی بے حد لاڈلی تھی۔ وہ دن بھر اپنے کاموں میں مشغول رہتے۔ مگر کبھی بات کرتے تو بچوں سے اور کھیلتے تو بس سلمٰی کے ساتھ۔ بیڈمنٹن ان کا پسندیدہ گیم تھا۔ سلمٰی کی شادی ہوئی تھی تو وہ کھیل کود بھی ختم تھے۔ انوار نے پرموشن حاصل کر کے سینئر کیمرج پاس کر لیا تھا اور اب لندن اڑنے کی دھن میں تھا

کوٹھی میں رونق اور زندگی تھی تو نکہت کے دم سے۔

اس نے یہاں ہر کام میں اس قدر پابندی پیدا کر دی تھی۔ ساروں کی زندگی کو اس طرح

اپنے بس میں کر لیا تھا کہ ہر جگہ وہ ہی وہ براج رہی تھی۔ اسلم صاحب کس قدر خوش اور مطمئن تھے بچے صاف ستھرے رہتے۔ کمرے ترتیب سے سجے رہتے اور بڑی بات یہ کہ اب بچے نماز بھی پابندی سے ادا کرتے۔ یہ بڑی بات تھی کہ وہ سب اب اس قدر ذمہ دار ہو گئے تھے۔!

پھر ایک دن وہ سب بمبئی میں تھے۔ انوار لندن جا رہا ہے۔ اسلم صاحب نے نکہت کو بمبئی کا چپہ چپہ گھما دیا۔ تاج محل میں ایک بار ڈنر کھلا دیا۔ ڈانس پارٹیوں میں لے گئے سمندر کے کنارے لے گئے۔ بوٹنگ کے لئے لے گئے۔ جو ہو پر اسے تیرنے کے لئے کہا۔ اگر اس نے کسی چیز کی تعریف کر دی اور وہ چیز جھٹ اس کے لئے خرید لی۔

اب تو تمہاری شادی ہو جائے گی۔ کون جانے پھر گھومنے پھرنے کا موقع ملے نہ ملے۔ وہ دکھا ہوا دل لئے، ہنس کر ان کی باتیں مانتی رہی۔ آنکھوں میں آنسو چھپائے وہ لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتی رہی۔

حیدرآباد واپس پہنچ کر اس کا دل سدا اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا۔ انوار اس کا بہترین دوست تھا۔ یوں ان کی عمروں میں خاصا فرق تھا، مگر نکہت اس کی موجودگی میں سدا ہنستی رہتی۔ (لاکھ وہ ہنسی جھوٹی ہی سہی) انوار اپنے ساتھ اس کی مسکراہٹیں بھی لیتا گیا۔ اسلم صاحب شاید اس کی اداسی بھانپ رہے تھے۔ ایکدن اسے ذرا غور سے دیکھ کر بولے۔

"تم آجکل کچھ غمگین نظر آتی ہو۔ کیا بات ہے۔"؟

اس وقت وہ شانو کو انگلش پڑھاتی بیٹھی تھی۔ کوئی فیری ٹیل تھی۔

"تب پری ہاتھ جوڑ کر بولی کہ تم سمجھے ہی نہیں۔ شاہزادے میں تو تم سے دل ہی دل میں پریم کرتی آرہی ہوں۔"

جواب میں نکہت نے شانو کو سمجھا سمجھا کر پڑھانا شروع کر دیا۔

تو تم سمجھیں شانو بٹیا کہ پری دراصل شہزادے......

ہی ہی کھی کھی.... شانو منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے ہنسی۔ "مگر آتی اچھی پری کو ایسے بوڑھے

شہزادے سے محبت کیسے ہوگئی آنٹی ۔"

"شہزادہ تھا تو بوڑھا مگر بہت نرم دل تھا شانو ۔ اگر ...... ۔

اسلم صاحب نے شانو کے ہاتھ سے کتاب لی اور دھیرے سے میز پر رکھ کر بولے

"آج سلمان کہہ رہا تھا کہ اس کی ماں بہت جلد گھر میں بہو لانا چاہتی ہیں ۔" وہ ہلکے ہلکے مسکرا رہے تھے ۔

نکہت کچھ نہ بولی ۔ سر جھکائے یوں بیٹھی رہی ، جیسے پتھر کی مورتی ہو ۔

" نکہت ۔" وہ ذرا زور سے بولے ۔" سلمان تمہیں بے حد چاہتا ہے ۔ بُری طرح پیار کرتا ہے ۔ تمہیں کسی کی محبت کی قدر کرنی چاہیئے ۔ میں نے بھی زمانہ دیکھا ہے نگاہوں کے مزاج پہچانتا ہوں ۔

تمہیں ۔ نکہت نے چونک کر سر اٹھایا ۔ وہ کہہ رہے تھے ۔

" تمہیں گلاب اور دھتورے میں تمیز کرنی چاہیئے ۔"

وہ کانونٹ میں چھٹیاں ہوگئی تھیں ۔ شانو سلمیٰ کی بچی بچی پر جان دیتی تھی ۔ اب پڑھائی کا بار تو تھا نہیں ۔ سلمیٰ جانے لگی ، تو شانو کو بھی اپنے ساتھ لیتی گئی ۔

کوٹھی میں اب ویرانیوں کا راج تھا ۔

ایک دن اسلم صاحب نے نکہت کے کمرے پر دہی ہلکی سی مخصوص دستک دی ۔ اور نکہت نے دروازہ کھولا تو دو چار بڑے بڑے پیکٹ سنبھالے وہ اندر چلے آئے ۔

" نکہت ۔ آج میں تمہاری امی کے پاس گیا تھا ۔ ہم نے شادی کی تاریخ طے کرلی ہے ۔ اور دیکھو یہ کچھ کپڑے ہیں ۔ زیورات کا آرڈر میں نے آج ہی دیا ہے ۔ آٹھ دس دنوں میں بن کر آجائیں گے ۔ پھر ضروری کپڑا بھی بعد کو خرید لیا جائے گا ۔ نکہت نے بے بسی سے سر اٹھا کر انھیں دیکھا تو وہ مسکرا کر بولے ۔

" ارے بھائی مجھے معلوم ہے کہ تمہاری امی سید صاحب کی بیوی ہیں میں نے ان سے بہت منتوں کے بعد یہ وعدہ لیا ہے کہ نکہت کی شادی میں ہی کروں گا کیوں کہ اس کے مجھ پر کتنے احسان

ہیں کہ شمار ہی نہ کئے جاسکیں گے ۔ یہ میری ننھی خوشی ہے جس کا پورا کرنا آپ کے بس میں ہے ۔

نکہت جیسے آپ ہی آپ بول پڑی ۔

"کاش آپ بھی کسی کی ننھی سی خوشی پوری کر دیتے ۔"

مگر تب تک اسلم صاحب جا چکے تھے ۔

اس کے چند دنوں بعد کی بات ہے کہ اسلم صاحب اسی ریوالونگ چیئر میں بیٹھے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے کہ دھوئیں میں لپٹی تھرتھراتی دعا ان کے کانوں سے ٹکرائی ۔

کیا واقعی تو جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے ۔ اب تو دعاؤں نے بھی ہاتھ اُٹھا لیا ہے خداوندا ۔ "!

یہ شائد زندگی کا خاتمہ تھا کیوں کہ اس دن کے بعد پھر کبھی نکہت نہ مسکرا سکی ۔ البتہ اسلم صاحب سدا مسکراتے رہتے ۔ انھوں نے بڑی منتوں سماجتوں کے بعد سید صاحب کی بیوی کو صرف چند دنوں کے لئے کوٹھی بلوا لیا تھا ۔ شادی کے ہنگامے عروج پر تھے ۔ اِدھر اُدھر کے بلائے اور بن بلائے مہمانوں سے کوٹھی اٹی پڑی تھی اور یوں بھی بڑی جگہ کوئی ہنگامہ ہوتا ٹھہرتا ہے تو آس پاس والے تو یوں کھنچ آتے ہیں جیسے گڑ پر مکھیاں ۔

جب زوردار بینڈ بجا اور بچوں نے شور مچایا کہ برات آگئی ۔ برات آگئی ۔ نکہت کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ اس کا پورا جسم لرز اٹھا ۔ اس گھڑی کی تو بہت دنوں سے منتظر تھی " تو یعنی کہ یہ سب کچھ اب ہو ہی رہا ہے ۔ اب وہ اپنے اصلی گھر جا رہی ہے ۔ اور یہ جو سب کچھ تھا ۔ خواب تھا ۔ جھوٹ تھا ، ایک سراب تھا اور وہ جو خوابوں کا شہزادہ تھا بجائے تاج کے جس کے سر پر سفید بالوں کا سورج جگمگاتا تھا ۔ اب اس کے لئے محض ایک خیال ہے ۔ اُسے ہنسی آگئی ۔

اسلم صاحب نے پھولوں میں لپٹے ہوئے سلمان کو دیکھا ۔ وہ اس قدر خوش تھا کہ اس کا چہرہ چاندنی کر چمک رہا تھا ۔ بعض لوگ اسقدر خلوص سے کوئی دعا مانگتے ہیں کہ

اللہ میاں کو قبول کرتے ہی بن پڑتی ہے ۔ تو آج وہ اس کی ہے ۔ (بالآخر تم نے اسے جیت ہی لیا مسٹر سلمان ایم ایس سی ۔ نا ؟ ؟)

نکہت آج میں بہت خوش ہوں کہ سلمان جو تمہیں بہت چاہتا تھا، آج تمہارا ہے اور تم اس کی ہو ۔ بہت خوبصورت جوڑا ہے تم دونوں کا ۔ دیکھو جس طرح تم نے کوٹھی کے ہر ہر فرد کا دل جیت لیا ہے اسی طرح اپنی سسرال میں بھی کرنا ۔ یہاں کا تو خیر چپہ چپہ تمہیں یاد کرے گا ۔"

تو یہ آپ کہہ رہے ہیں اسلم صاحب کہ یہاں کا چپہ چپہ مجھے یاد کرے گا ۔ کیا سچ ۔ ؟ اور کیا چپے چپے میں آپ خود شامل نہیں ہو جاتے ۔ ؟ ؟

یہ کوٹھی ہے یا قبرستان ۔ ؟ ؟

ہر چیز ساکن تھی ۔ پرسکون ۔ جیسے ہر روز طوفان کے بعد سمندر کی سطح چپ چاپ ہو جاتی ہے ۔ وہ باجوں کی ڈھما ڈھم ۔ باراتیوں کی دھوم دھام ۔ بچوں کا شور شرابہ سب کچھ ختم تھا ۔ اور اب وہ کمرہ جہاں کئی سالوں سے ایک جنت آباد تھی اب خاموش آوازوں سے پوچھ رہا تھا ۔" وہ کہاں گئی ۔ وہ کہاں چلی گئی ۔

اور خوشبودار دھواں بل کھاتا یونہی کمرے میں آوارہ آوارہ سا پھر رہا تھا ۔ اب کوئی دعا کانوں میں رس نہیں گھولتی تھی ۔ اور یہ کم بخت دل کا بوجھ

جب کبھی میں اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کرتی ہوں، خدا کے سامنے سر جھکا کر سب کچھ کہہ ڈالتی ہوں ۔ اگر ایسا نہ کروں تو شائد میرا دل پھٹ جائے ۔"

خداوندا میرا دل پھٹ کر رہ جائے گا ۔ مگر یہ تو اچھا ہی ہوا نا کہ میں نے سلمان کا دل نہ توڑا ۔ کتنی اچھی جوڑی ہے ۔ بھلا پرانے گیرج میں کہیں نئی گاڑی اچھی لگتی ہے مسٹر اسلم ؟

انھوں نے اپنا دل زور سے پکڑ لیا ۔ خوشبودار دھواں کمرے میں چکر لگا رہا تھا ۔ وہ بے تابی سے اٹھے اور کمرے میں جا کر سجدے میں گر پڑے ۔ تھرتھراتی دعا ان کے لبوں پر مچل اٹھی ۔

" میں ۔ نکہت سے محبت کرتا ہوں خداوندا ۔ میں نکہت سے محبت کرتا ہوں ۔"

گولو باہر سے بھاگتا ہوا آیا اور رجی کی گردن میں جھول گیا۔

"آپا، آپا آپ تی اَجل آئی ہے۔"

رجی کمرے کے بیچ میں میز کے پاس کھڑی چائے دان میں چمچہ ہلا رہی تھی۔ گولو کو یوں، سراسیمہ دیکھ وہ حیرت سے بولی،

"میری اجل — ؟ کیا بک رہا ہے رے۔" اور وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی باہر باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ باغ کی روشوں اور درختوں سے الجھتی۔ ٹکراتی اس کی نگاہ، سیاہ رنگ کی چھوٹی سی موٹر سے جا ٹکرائی۔

"یا خداوندا — یہ کیا مصیبت آئی؟" وہ دل میں حیران ہوتی ہوئی زیرِ لب بولی۔ گولو اب تک کھڑکی میں بیٹھ چکا تھا۔ اور تتلا تتلا کر اپنا مطلب واضح کئے جا رہا تھا۔

"وہ آپا — وہ میں بھیل لہا تھا کہ نئی...."

"اتنے بڑے ہو گئے گولو تم — ابھی تک توتلی باتیں کرتے ہو —" رجی کے کچھ کہنے نہ

پڑ رہا تھا۔ سوائے گولو پہ جھلّانے کے چارہ بھی کیا تھا۔

باہر ہارن پہ ہارن بجتا جا رہا تھا۔ جیسے کوئی شرارت پر اُتر آیا ہو۔ رجّی پیر پٹختی اپنے لمبے لمبے دامنوں کو سنبھالتی کمرے کے وسط میں آ کھڑی ہوئی۔

"شمّو ——" وہ ایک کپ میں چائے اُنڈیلتے ہوئے چلّائی "چلو چائے پی لو، آگے ہی کمبخت ٹھنڈی پالا ہو گئی ہے۔"

شمّو چوٹیاں گھماتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو رجّی سر جھکائے ہی جھکائے بولی ——

—" اور جناب جاوید کہاں غائب ہیں —" وہ پیالی میں شکر ہلاتی آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ صوفے کے قریب جہاں شمّو سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

" جاوید صاحب غائب نہیں حاضر ہیں ۔" شمّو کی بجائے خود جاوید نے کمرے میں آتے آتے بڑی بشاشت سے جواب دیا۔ رجّی نے سر اُٹھایا اور ٹھٹھک سی گئی —— جاوید کہہ رہا تھا۔

"وقت پر پہنچے ہیں نا آپا ہم —" پھر مڑ کر بولا

" چلیئے اظہر بھائی آپ بھی ڈٹ جایئے۔"

اظہر بڑی بے باکی سے ہنس رہا تھا —— اس کی کسی ادا سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس گھر میں نو وارد ہے اور ابھی چند لمحے پہلے ہی اس نے اس گھر میں قدم رکھا ہے —— رجّی اس کی بے باک ہنسی سے ایسی گھبرائی کہ چائے کی پیالی پہلے تو ڈگمگائی اور پھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک چھناکے کے ساتھ فرش پر گر کر کرچی کرچی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر خوف، حیرت، اور بالکل خفیف سی مسکراہٹ تھی، مگر اس مسکراہٹ کو خوف نے دبا سا دیا تھا۔ اور سب سے شدید اور گہرا تاثر اس کے چہرے پر حیرت کا تھا۔ حیرت جو آنکھوں میں ایک سوال کر رہی تھی اس مصیبت کو کہاں سے پکڑ لائے۔؟

جاوید جو اتنی کم مدت میں بڑی اپنائیت سے اس بھلے آدمی کو بھائی کا رشتہ لگا چکا تھا، ہنس کر بولا

"بس یونہی رات دن پیالیاں ٹوٹتی رہتی ہیں اور جب پیالیوں سے جی بھر جاتا ہے

تو ہمارے سر توڑتی ہیں۔"

شمو کو اس بات پر اس قدر زور سے ہنسی آئی کہ باوجود کوشش کے بھی اس کی کھاٹ۔ کھک کھی کھی کی آواز رک نہ سکی۔

رجی نے سر جھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور جیسے ہمت سمیٹ کر بس اتنا ہی بولی:۔

"بدتمیز"

شرمندگی اور خوف سے رجی کے چہرے کا رنگ ہلکا گلابی ہو گیا تھا۔ اور اُترتے سورج کی کرنوں کی سنہری شعاعوں نے اس کے بالوں کو سونے کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی کرنیں سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ سر جھٹک کر مڑی اور اس کے ساتھ لمبے لمبے دامن بھی چلنے لگے۔۔ اظہر نے بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھا!

چائے دان پر جھکے جھکے وہ بولی

"موٹر میں تو تھا جاوید ـ"

"جی ہاں اور اظہر بھائی بھی ۔"

اب کے اظہر بھائی نے بھی زبان کھولی۔ اس کے چہرے کی رنگت کو بھانپ کر وہ بولے:۔

اور اسی لئے جب گو لو نے پوچھا اندر جا کر کیا کہوں کہ کون آیا ہے تو مجھے اس کی تتلاہٹ پر ایک بہت اچھی بات سوجھ گئی۔

رجی نے حیرت سے سر اٹھا کر اظہر کو دیکھا ـ"جی ـ؟"

"یہ گو لو صاحب توتلے ہیں نا ـ؟ جاوید نے جب ان سے کہا اندر جا کر آپا سے کہو اظہر بھائی آئے ہیں۔" تو بولے:"جی آپا، اجل بھائی ـ؟؟ میں نے کہلوا دیا

"آپ کی اجل آئی ہے۔" (رجی کے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی) "اور سچ مچ یہ خواہ مخواہ کسی کا آ جانا اور اِتنے اُتنے دنوں کے لئے بھی نہیں پورے سال چھ ماہ کے لئے اجل سے کیا کم ہے؟" وہ قہقہہ لگا کر بولا

" آپ کی اجل آئی ہے نا ___ ؟

اب کے ذرا غور سے رجی نے اظہر کو دیکھا. جانے کیسے ایک جملہ اس کے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔

" اتنی خوبصورت موت بھی کسے ملتی ہے ؟" (وہ خود حیران رہ گئی یہ میں نے کیا کہہ دیا!)

اظہر کی ہنسی اک دم رک گئی) وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر بڑے تعجب سے اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ رجی کی توجہ دوسری طرف منتقل ہوگئی ۔

" اری شمو، تم اتنی بڑی ہوگئی، ہو لڑکی ___ یہ چائے تو دیکھو کمبخت موری کا پانی اس سے بُرا ہوتا ہے بھلا۔" (وہ خود کو باتوں میں بہلانا چاہ رہی تھی) شمو ٹرے اُٹھا کر چلی تو رجی بھی اس کے پیچھے چلی گئی ۔

" ہائے شمو ___ میرا دماغ ایسا ٹھکر ڈکا ہے سے ہو گیا ۔ یہ تو صبح سے طے تھا نا کہ آج ابو جان کے بھتیجے آنے والے ہیں، پھر میں کیسے بھول گئی !"

" بے چاری کو بہت کام رہتے ہیں نا ۔ ؟" شمو نے یوں جواب دیا جیسے آپا کو نہیں کسی اور کو سنا رہی ہو ۔

" یہ گودو بھی نرا نکما ہے. ایسی توتلی باتیں کرتا ہے کہ خاک بھی پلے نہیں پڑتا ۔ بھلا میں کیا سمجھ سکتی تھی " آپ کی اجل آئی ہے ۔ کوئی بات ہو بھلا !

" اجل کے معنی موت ہیں آپا ؟" شمو ہیٹر کا سوئچ آن کرتی ہوئی بولی ۔

" ہاں ہاں " ___ رجی ذرا گھبرا کر بولی ___ " پھر " ؟

شمو زور سے ہنس پڑی ___ " تب تو آپا سچ مچ آپ کی موت آئی ہے ۔ کم بخت بڑا ڈھیٹ نظر آرہا ہے ۔ ہنسی تو رکتی نہیں ۔ "

" ہنستا رہے، ہمیں کیا " رجی لاتعلقی سے بولی ہنسی پر کوئی کنٹرول تھوڑا ہی ہے ہمارا "

" مگر آپا یہ ہمارے ہی گھر کیوں آن پڑا ۔ شہر میں ہوٹل نہیں ہیں کیا ۔ ؟

" رجی نے ذرا ناراضگی سے اُسے دیکھا ___ " شمو کیسی باتیں کرتی ہے تو ۔ مہمان کو

ایسا نہیں کہا کرتے۔ وہ بے چارہ تو ٹریننگ کے لئے آیا ہوا ہے۔ سال چھ ماہ بعد فارن چلا جائے گا بھلا ہمارا کیا لے جائے گا۔"

شمو نے یونہی بے خبری میں کہا ۔"سب کچھ لے جائے گا۔"

رجی چیخی ۔"ارے پانی ۔" پھر ذرا دھیرے سے بولی ۔"پانی اُبل رہا ہے شمو پتی تو جھونک دے ذرا سی۔"

ماحول میں بس پانی کی سی سی گونج رہی تھی۔ رجی بولی

"سب کیا لے جائے گا؟"

"ارے بھئی خواہ مخواہ خرچہ بڑھے گا۔" شمو بڑھیا بن کر بولی ۔"پھر قرضہ بڑھے گا۔ آرام، سکون، چین لے جائے گا کہ نہیں۔" وہ ہاتھ ہلا ہلا کر بول رہی تھی۔

رجی کو غصہ سا آ گیا۔

"کسی کے احسانوں کا بدلہ چکانے کی بات بڑی ہلکی ہوتی ہے۔ شمو، مگر تجھے یاد نہیں کیا ۔ ابو دہلی گئے تو ان کے دوست نے کتنی خاطریں کی تھیں ۔ اور ابو اپنے کام کے سلسلے میں کتنے دن وہاں رہے۔؟ اب انہی دوست کا بیٹا مجبوری ناطے ہمارے ہاں آتا ہے تو تو کہتی ہے۔"...

شمو نے اس کی بات کاٹ دی ۔"اتنے امیر تو ہیں ہوٹل میں کیوں نہیں رہ جاتے؟"

رجی نے ذرا ناگواری سے اسے دیکھا ۔"گھر کا سا آرام ہوٹلوں میں ملنے لگے تو لوگ گھر بسانے ہی چھوڑ دیں۔"

"چھی چھی چھی ۔۔ انٹر میں پڑھنے والی لڑکی ایسی احمقانہ باتیں سوچے تو اللہ ہی حافظ ہے۔"

شمو کچھ جھینپ گئی ۔۔ رجی اس کا نوٹس لئے بغیر بولی

"میں چائے لے کر جاتی ہوں تو تھوڑے سے میوے لے آ۔"

کمرہ سنہری روشنی اور جوان قہقہوں سے اُبل رہا تھا۔ (وہ دونوں اس قدر پکے دوست

نظر آرہے تھے، جاوید کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔

"نہیں، یہ سب آپا کرلیتی ہیں۔ گھر کے کام کاج سے جانے کیسے فرصت نکال لیتی ہیں۔ یہ سارے پھول انہی کے کھلائے ہوئے ہیں۔ اور پھران کے ذمہ کام نہ ہو، تب بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں۔"

"پاگل جوشٹری۔" کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رجی نے جملہ پورا کردیا۔

جاوید بوکھلا کر پلٹا۔

"کمال کرتی ہیں آپا آپ بھی۔ میں تو ایک طرح سے آپ کی تعریف کر رہا تھا۔۔۔ پوچھیئے تو اظہر بھائی سے۔ سب سے سوائے آپ کے اور کوئی دوسرا ٹاپک ہم دونوں کے بیچ آیا ہی نہیں۔"

رجی خوشدلی سے ہنسی۔ "اچھا؟" اور اس نے اپنی آنکھیں شرارت سے کھولدیں۔

اظہر بڑی مستعدی سے اُٹھا اور اکدم رجی کے قریب آکر اس کی آنکھیں دیکھنے لگا۔

"افوہ، بڑی بڑی۔ روشن روشن جیسے دو چراغ۔" پھر وہ پلٹا اور مسکرا کر جاوید سے کہنے لگا۔

"کیوں بھئی تمہارے یہاں لائٹ کا بل کتنا آتا ہے"؟ جاوید کچھ سراسیمہ ہو گیا تھا ابھی کچھ جواب دے بھی نہ پایا تھا کہ اظہر خود بول اُٹھا۔ "جب اتنے روشن چراغ موجود ہوں تو پھر......"

رجی کا سانس سینے میں ہی کہیں ٹھہر گیا تھا۔ اظہر اس قدر قریب آیا۔ جھکا، دیکھا اور چلا بھی گیا۔۔۔ اور یونہی پرسکون تھا۔ یہاں تو سمندر میں جوار بھاٹے کی آمد آمد تھی۔ اس نے گھبرا کر الٹی سیدھی چائے پیالیوں میں انڈیلنی شروع کردی۔

"آپ سب لوگ میرے لئے قطعی اجنبی نہیں ہیں۔۔۔ افوہ، چچا جان کتنی باتیں سناتے تھے آپ سبھوں کی۔ پھر جب اتنا گہرا تعارف کروادیا جائے تو اجنبیت کہاں باقی رہی بھئی۔ اور پھر میرے البم میں آپ سبھوں کی تصویریں ہیں۔" "آپ کی"۔ وہ جاوید کی طرف مڑا۔

—" اور جناب آپ کی —" وہ دروازے میں کھڑی شمو کو دیکھ کر بولا —" اور جناب گولو مہاراج کی — اور اس نے اپنا رخ رجی کی طرف پھیر دیا۔

"اور جناب بی بی مریم کی —"؟

اخروٹ کی طشتری رجی کے ہاتھوں میں کانپنے لگی۔ شمو جو اب اس کی بے تکلفی اور خوش مزاجی سے راضی ہو چلی تھی۔ بشاشت سے ہنس کر بولی۔

"یہ بی بی مریم آپ نے آپا کو کہا ہے ؟"

"ہاں اور کیا — ؟ وہ پیالی ہاتھ میں لئے گھوم گیا۔ ان بی بی کے چہرے پر کس بلا کی معصومیت ہے — میں نے میوزیم میں بی بی مریم کا مجسمہ دیکھا ہے۔ بس ایسی ہی ملتی جلتی معصومیت ہے۔"

"سچ"۔ شمو اور بھی کھل کر بولی۔

"ہاں جناب اور کیا — ایسی معصوم کا کوئی دل دکھائے تو نپ نہ پڑے۔ اور بھئی سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا کی معلوم پڑتی بھی نہیں ہیں۔" اس نے شرارت سے دیکھ کر رجی سے پوچھا۔

"کیوں صاحب آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں ؟ آسمانوں سے تو کوئی تعلق نہیں ہے آپ کا !"

جاوید بولا —" اور اظہر بھائی — آپا کا لباس بھی کچھ عجیب سا ہوتا ہے نا۔ یعنی ہمارے گھرانوں میں عام طور سے جیسے لباس پہنے جاتے ہیں، ایسے تو یہ پہنتی ہی نہیں ہیں"

اب کے اظہر نے ذرا غور سے رجی کو دیکھا۔ پھول دار لمبے سے لبادے میں سچ مچ ہی وہ کوئی اجنبی دیش کی رہنے والی دکھائی دیتی تھی — وہ لبادہ — جو ہاؤس کوٹ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سلیپنگ گاؤن بھی نہیں — ڈریسنگ گاؤن بھی نہیں — کمر کے پاس سے تنگ ہوتا ہوا، وہ نیچے آکر بہت پھیل جاتا تھا، اور جب رجی چلتی تھی تو وہ پھول دار دامن اس کے پیچھے پیچھے یوں چلتے تھے، جیسے انگریز شاہزادیوں کے فرغل — اس لبادے

پر وہ دوپٹہ یا اوڑھنی کچھ بھی نہ پہنتی ۔ ہر دم اڑتے رہنے والے بالوں کو البتہ ایک اسکارف سے ضرور باندھ لیا کرتی ۔

" اظہر بھائی ۔ آپ شلوار اور قمیض میں اتنی پیاری، اتنی اسمارٹ لگتی ہیں کہ کیا کہوں مگر سنتی کب ہیں کسی کی ۔" وہ اظہر سے بڑی گھل مل کر باتیں کرنے لگی ۔

" نہیں بھئی ۔ ہمیں تو اس لبادے میں ہی بھلی لگ رہی ہیں ۔" اظہر بڑی اپنائیت سے بولا ۔

رجی کو اپنا وزن سنبھالنا مشکل ہو گیا ۔ وہ اٹھی اور شاہ زادیوں کی سی تمکنت سے چلتی کمرے سے باہر چلی گئی ۔

رجی باہر آ کر بیٹھ گئی مگر اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اتنے سارے کام کرنے کے پڑے تھے ۔ شام ڈھل رہی تھی ۔ رات کا کھانا پکوانا تھا ۔ پودوں کو پانی دینا تھا، سب کے بستر لگوانے تھے ۔ کیا کچھ نہ کرنا تھا، اور وہ یہاں سست ماری بیٹھی تھی ۔ اس کے ہاتھ پاؤں جیسے بے دم ہو رہے تھے ۔

" مجھے یہ کیا ہو گیا ہے ۔"

اس نے پاؤں جھٹک جھٹک کر اپنی طاقت کا اندازہ لگانا چاہا ۔ اس نے محسوس کیا کہ پاؤں کے جھٹکنے کی حد تک تو وہ خود کو مطمئن کر سکتی تھی ۔ مگر کھڑے ہونے کو کہا جاتا تو شاید وہیں گر پڑتی ۔ کچھ کرے نہ کرے گرامی کو کھانا بھجوانا ضرور تھا ۔ ہاسپٹل کا ٹائم گزر جائے تو پھر کون اندر جا سکے گا ۔ ؟

اندر سے باتوں اور ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ اب سب مل کر اس قدر اپنائیت اور خلوص سے ہنس بول رہے تھے کہ دور دور پتہ نہ لگتا تھا کہ ان سبھوں میں ایک نووارد اجنبی بھی بیٹھا ہے ۔ گوتو کے توتلے ادھورے فقرے اور پھر اظہر کی گونج دار ہنسی اس کے کانوں میں سما رہی تھی ۔

" ارے یہ کہاں چلی گئی ۔ ؟" اچانک اظہر کی آواز آئی ۔

اتنی بے تکلفی سے کسی نے اس کے بارے میں آج تک نہ پوچھا ہوگا ۔ بھائی بہن تو سب چھوٹے ہی تھے ۔ اُمی اور ابو تک اُسے ملنساری اور نرمی سے پکارتے تھے، جیسے وہ ان کی بیٹی نہ ہو کوئی قابل احترام ہستی ہو ۔ پھر اب یہ کون آگیا تھا ۔ جو سارے احترام کو بالائے طاق رکھ کر اتنی بے تکلفی سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا ۔ یہ کون تھا جو آسمان نہیں تھا مگر آسمان بن کر اس پر چھا رہا تھا ۔ وہ تو آج تک سر اُٹھا کر چلتی آئی تھی ۔ یہ اس کا سر کس نے جھکا کر رکھ دیا تھا ۔ ؟ کیا وہ خدا تو نہیں تھا ؟

اس نے زور سے سر کو جھٹکا ۔" یہ میں کیا سوچ رہی ہوں' یہ میں کیا سوچ رہی ہوں یہ میں کیا سوچ رہی ہوں ، مجھے سنبھلنا چاہیئے ۔"

وہ بڑی مشکل سے اُٹھ کر صحن میں جا سکی ۔

" اچھا تو اب وہ چولھے چکی میں گھس گئی ہے ۔" اظہر نے ذرا حیرت سے شمو سے پوچھا

"جی ہاں ـــ وہی سب میں بڑی ہیں نا ۔ وہی سب کام کرواتی ہیں ۔"

(تو اظہر صاحب یہ لڑکی وہ لڑکی ہے جو آپ کی صحبت سے زیادہ اہمیت اپنے گھریلو دھندوں کو دیتی ہے ۔)

اظہر نے ذرا دکھ سے ، کچھ رُکتے جھجکتے پوچھا ۔" کیوں نوکر نہیں گھر میں ؟"

"جی ہیں تو ـــ ایک لڑکا ہے ـــ ایک ماما ہے ۔ مگر نوکر سنتے کب ہیں ؟ اُمی جب تک بیمار نہ تھیں وہی سب کچھ کرتی کرواتی تھیں ۔ اب بیمار کیا پڑی ہیں سب جھمیلے آپا کے سر منڈھ گئے ۔ کالج بھی کہاں جا رہی ہیں اب "

"کیوں ؟" اظہر نے گھبرا کر پوچھا ۔ پھر خود ہی اپنے لہجے میں شرمندہ سا ہوگیا ۔

" بس یہی گھر کے دھندے " شمو ہاتھ ہلا کر بولی !" انسان پڑھائی میں دل لگائے کہ گھریلو بکھیڑوں میں ۔ "

" پھر اب کالج نہیں جاتی وہ ؟"

" جی نہیں ' دراصل ہوا ایسا کہ انھوں نے اپنی بی ۔ اے کی فیس" .... ایکدم اس نے جاوید

کی گیلی آنکھوں کو دیکھا اور رک گئی۔ پھر اٹکتے اٹکتے بولی: یہ بات جاوید بھائی کو اچھی طرح معلوم ہے۔ کیا بات تھی بھیا وہ؟

اظہر، جاوید کی طرف مخاطب ہو گیا۔ جاوید نے جیسے بڑے کرب سے سنایا۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی اظہر بھائی — میرا میڈیکل کا تھرڈ ایر تھا۔ اور آپا کا بی اے کا فائنل — فیس کی ضرورت تو دونوں کو تھی، مگر فیس ایک ہی کی بھری جا سکتی تھی، آپا نے کہا میری تعلیم کچھ ایسی اہم نہیں ہے — اور —" وہ بات بنانے کو ذرا جوش سے بولا —

"اب میں فورتھ ایر میں ہوں اظہر بھائی، اللہ نے چاہا تو جیسے تیسے یہ دن کٹ جائیں گے پھر تو اپنے وارے نیارے ہیں۔"

شمو کی آنکھوں میں بڑی حسرت اور اداسی تھی، وہ بالکل منہ کھولے بچوں کی طرح جاوید کی باتیں سن رہی تھی۔ اظہر نے یہ سب کچھ سن کر بڑی بے اطمینانی اور بے چینی محسوس کی — تاجر باپ کا اکلوتا بیٹا — حد درجہ سوشل — زندگی کے دکھوں کو کبھی سمجھا نہ محسوس کیا۔ آج اس کے سینے میں یہ درد کہاں سے اُبل پڑا ہے۔ وہ تو جس سوسائٹی میں جی رہا تھا۔ وہاں فکر اور دکھ نام کی کوئی چیز ہی نہ تھی — زندگی وہاں کتنی حسین، رنگین اور بھرپور تھی، کوئی دکھ نہیں — لڑکیاں جہاں بھنورا بنی آس پاس پھرتی تھیں اور، اور..... (مگر رجی صحن میں جھارا اُٹھائے لئے جا رہی تھی۔ اب وہ پھولوں اور پودوں کو پانی دے گی)

اظہر کو کچھ دکھ بھی تھا۔ کچھ خوشی بھی تھی — دکھ تھا تو یہ کہ رجی نے اس کی آمد کو ذرا بھی اہمیت نہ دی، چائے پانی کر کے وہ روز ہی کی طرح اپنے کاموں سے الجھنے چل دی۔ جیسے اظہر اسی گھر کا ایک فرد تھا۔ غیر اہم سا، اور خوشی اس بات کی کہ اسے بھی کوئی نظر انداز کر سکتا تھا خوشی تو یہ تھی کہ اب وہ خود کسی کا بھنورا بننے جا رہا تھا۔ مرد کی فطرت کچھ کچھ شیر کی سی ہوتی ہے شیر مُردے پر نہیں لپکتا۔ اپنی بہادری سے کسی کو زیر کرتا ہے۔ اور اس کارنامے پر خوش ہوتا ہے اور مزے لوٹتا ہے — مرد بھی اس سے دور نہیں — سامنے آئی بے بس چیز اسے بھاتی نہیں جو اس کی مردانگی کو للکارے، جو اس کے لئے جھکے، اس کو جھکائے۔ اس کو پاکر وہ خوش ہوتا ہے

اسی میں اس کی خودداری اور انا کو تسکین ملتی ہے۔

رات کو سب کے کھانے پینے ختم ہو گئے تو رجی گول کمرے میں آئی (وہ کمرہ گول دول تو تھا نہیں ۔ یونہی اس کا نام گول کمرہ پڑ گیا تھا) اظہر بیٹھا مزے سے بھک بھک سگار پی رہا تھا ۔ رجی آئی اور اپنی چراغوں ایسی آنکھوں سے اس کے سچپانوں کو دیکھتی بولی ۔

" یہ بدتمیزی کیا ہے، سارے کمرے کو انجن بنا رکھا ہے ۔ شرم نہیں آتی بار بار وہی حرکت کرتے ۔"

اظہر کو ان چراغوں کی لو باقاعدہ اپنی بیٹھک میں گھستی محسوس ہوئی ، گرم گرم ، کیسی جان لیوا حرارت ۔ وہ مڑا ۔

" ہا...... " بس رجی کے منہ سے اتنا ہی نکلا

" آپ ..... " بڑی دیر بعد وہ اتنا ہی بول سکی

اس نے جھٹ سگار میز تلے پھینک دیا ۔" چلو بھائی ، اب تم کہتی ہو تو کبھی نہیں پیئں گے سگار وگار ... "

رجی اسقدر حیرت زدہ تھی ، کچھ شرمسار بھی تھی ، خوف ، حیرت اور مسکراہٹ کی دھی بھم سی پرچھائیں اس کے چہرے پر ڈول رہی تھی ۔ یہ سب چیزیں رجی کو اکدم بہت خوبصورت بہت معصوم ، بہت اونچا اور بڑا قابل احترام بنا دیتی تھیں ۔

" میں تو سمجھی جاوید ہو گا ۔ وہ اکثر یہ حرکت کرتا ہے ۔ بُری حرکت " اس نے سگار کی بو سے بچنے کو ناک سکوڑی " میں آپ کو کیسے منع کر سکتی تھی ، ؟ "

اظہر نے جھک کر سگار اٹھا لیا " تو مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے بھائی کو کسی بُری چیز سے بچنے کو کہہ سکتی ہیں ، مگر ہمیں نہیں ۔ ہاں ٹھیک تو ہے ، ہم کون ٹھہرے آپ کے ۔"

رجی گھبرا گئی (اور زیادہ خوبصورت ہو گئی) تھوڑی دیر تو اسے سوجھا ہی نہیں کہ کیا کرے ۔ پھر لپکی اور اظہر کے لبوں سے سگار نکال کر پھینکتی ہوئی بولی

" اب سے کبھی سگار منہ میں نظر آئے تو پھر سمجھوں گی ۔"

(ارے وہ ڈر رہی ہے ۔ مجھ سے سہم رہی ہے ۔ مجبور ہے ، ورنہ اس کی اداؤں میں خوف کیوں ہوتا ۔ ہاتھوں میں یہ لرزش کیوں ہوتی ، ۔ گویا اس نے میرا حکم مانا ہے ۔ مگر کیوں ۔ کیوں؟

رجی کھڑکی سے لگی کھڑی تھی باہر دیکھتی ہوئی بولی

"ارے آپ نے اپنی موٹر یونہی باہر کھڑی کر رکھی ہے ۔ اور جو رات کو پانی وانی برس پڑا ۔ تو ؟" کچھ ندامت لئے وہ بولی ۔" ہمارے یہاں گیرج تو ہے نہیں ۔ ہاں دیکھئے وہ باہر کی طرف ایک کھُلا سا کمرہ خالی ضرور ہے ۔ وہاں آپ اپنی گاڑی .....

(اچھا ۔ تو اب سمجھا ۔ پیسہ ۔ پیسہ ۔ پیسہ ۔ پر جھجک ، یہ رکاوٹ یہ سہما سہماپن ۔ ! وہ شاید سمجھتی ہے کہ اس کے سامنے جھک کر ہی چلنا چاہیئے ۔ یہ رکاوٹ تو دور کرنی ہی ہوگی ،)

"گاڑی ۔ ارے ہٹاؤ ۔" وہ لاپروائی اور کچھ تضحیک سے بولا ۔ تم کیا سمجھ رہی ہو بڑی اچھی گاڑی ہے وہ ۔ ہش ۔ بالکل کھٹارا ہے ۔ مجھے تو شرم آتی ہے اس میں بیٹھتے ۔"

رجی کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی چمکنے لگیں ۔" آپ بھی خوب باتیں کرتے ہیں ۔" (اب کے اس کا انداز اس قدر سادگی بھرا اور بیباک سا تھا ۔ معصوم سی بے باکی اس کے لہجے سے صاف ہویدا تھی) ...

" اتنی اچھی چیز کو کہتے ہیں کہ اس سے شرم آتی ہے ۔ اگر مجھے ڈرائیونگ آتی تو میں خود اسے لیجا کر وہاں رکھ دیتی ۔"

" میں سکھا دوں ڈرائیونگ ۔" اظہر نے بڑی سادگی سے پوچھا ۔

رجی نے اس کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا ۔" سیکھ بھی لوں تو گاڑی کہاں سے آئے گی ۔"

" اونہہ ۔ اس کی فکر نہ کرو تم ۔ اللہ دے ہی دیگا ۔"

" کہاں سے دیگا ؟ آج تک گاڑی میں بیٹھنے کی تو نوبت نہیں آئی اور گاڑی ہی دے دے گا ۔ ایسی باتوں سے صرف بچے ہی خوش ہو سکتے ہیں ۔" وہ ذرا جل کر بولی

اظہر اسے بازو سے گھسیٹتے ہوئے بولا :-" اچھا آؤ میں گاڑی گیراج میں لے جا رہا ہوں

تم پیچھے بیٹھ جاؤ"

(زمین میں زلزلہ آیا تھا نہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹے تھے۔ آسمان کانپا تھا نہ کسی طوفان میں درخت ہلے تھے۔ صرف اظہر نے اس کا بازو تھاما تھا!)

وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ جاوید سے اتنا ہی کہہ سکی۔ "اظہر بھائی ہیں نا تمہارے، انھیں سونے کا کمرہ دکھا دینا مجھے تو بڑی نیند آرہی ہے۔"

"اور ان کی کار۔" جاوید بے چینی سے بولا! "پائی وائی آیا تو"

"ہاں وہ ہم دونوں نے ابھی گیراج میں لے جا کر کھڑی کی ہے۔" وہ جیسے زمین میں اندر ہی اندر کہیں ڈوبتی ہوئی بولی۔

صبح حسب معمول اسی انداز سے طلوع ہوئی۔ رات والے زلزلے کا اب نام و نشان بھی باقی نہ رہ گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے دامن جھلاتی روزمرہ کے کاموں میں مصروف نظر آرہی تھی۔

ناشتے کے بعد جب اظہر بن ٹھن کر باہر نکلا تو رجی برآمدے میں کھڑی بلیوں کو دودھ پلا رہی تھی۔

"اچھا یہ شوق بھی آپ نے لگا رکھا ہے۔" وہ بشاشت سے بولا۔ پھر ذرا جھک کر بلیوں کو دیکھتا ہوا بولا۔ "مگر آپ نے یہ کیسی نیلی آنکھوں والی بلیاں پال رکھی ہیں جناب۔ سنا ہے ایسی آنکھوں والی بلیاں بڑی بے وفا ہوتی ہیں۔ چھوڑ کر چلی جاتی ہیں مالکن کو۔"

وہ بلی کی پشت پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی: "آنکھیں تو آپ کی بھی نیلی ہیں۔"

وہ اکدم چونکی۔ اظہر زور زور سے ہنس رہا تھا

"مگر بھائی میں تو بلی نہیں ہوں نا"

جانے کیسے اس کے منہ سے پھسل پڑا۔ "سوال تو نیلی آنکھوں کا تھا۔"

اظہر کے قہقہے بھی تھم گئے وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں رجی، سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر پتہ نہیں سچائی کہاں تک ہے کہ نیلی آنکھ کبھی وفا

نہیں کرتی ۔"

رجی مسکرائی ۔" واہ آپ بھی سچ سمجھتے ہیں ایسی باتوں کو ۔ میں تو یوں ہی کہہ رہی تھی ۔"
اور وہ خالی طشتری اٹھا کر وہاں سے چلی گئی ۔ اظہر اُسے دیکھتا رہا ۔ یہ لڑکی اپنے آپ میں کسقدر گم ہے ۔ اپنی مصروفیتوں، اپنی ذمہ داریوں کا اسے کتنا شدید احساس ہے ؟ وہ تو باتوں باتوں میں اپنا ٹائم تک گنوانا نہیں چاہتی ۔

اظہر اب تک چاند تھا جس کے اطراف چکور دیوانہ وار طواف کیا کرتا ہے ۔ اسے اس درد اور خلش کا پتہ نہ تھا ۔ اب وہ دھیرے دھیرے چکور بن رہا تھا ۔ اور وہی درد اور خلش اس کا مقدر ہوئی جا رہی تھی ۔ جو ازل سے چکور سے عبارت ہے ۔ اسے اس تڑپ اور کرب میں لطف آنے لگا ۔

بہت کم دن بیتے تھے ۔

مگر ایسا لگتا ہی نہ تھا کہ اظہر کوئی اجنبی ہے ۔۔ کچھ یوں لگتا جیسے وہ ڈار سے بچھڑی کونج تھا جو پھر اڑتے اُڑتے اپنی ڈار سے آ ملا ہو ۔ اور کسی قسم کی اجنبیت کا احساس ان کے بیچ نہ تھا ۔ رجی اس گھر کو یوں لے کر چل رہی تھی ، جیسے اس سے بڑا کوئی نہ ہو ۔۔ ابو تھے ضرور مگر ان کی حیثیت نہیں کے برابر تھی ۔ ان کی ساری عمر محکمۂ تعلیمات میں گزری تھی ۔ اب وہ خالی وقت میں مطالعہ میں مشغول رہتے ۔ ایک کالج میں تھوڑی دیر پڑھانے بھی جاتے تھے ۔ مگر لوٹ کر آتے تو پھر کتابوں کے انبار میں دفن ہو جاتے ۔۔ یوں اپنی جوانی ہی سے وہ کچھ بیمار اور خاموش طبع سے آدمی رہے تھے ۔ گھر کے بُرے بھلے میں کبھی دخل نہ دیتے ۔ جو کرتیں بیگم ہی کرتیں ۔ ان کا واسطہ بس اتنا ہی تھا کہ وقت پر کھانا کھا لیتے ۔ ہفتے میں ایک آدھ بار بیوی بچوں کو لے کر پکچر یا آؤٹنگ بھی کرا آتے ، پھر گھر کا جنجھٹ گھر ہی میں آ پڑتا ۔ اُمی ہی ماں باپ بن کر پال رہی تھیں کہ ان پر اچانک برانکائٹس کا شدید حملہ ہوا ۔ بیماریوں میں بیماریاں نکلتی گئیں اور جب ان کا تفصیلی معائنہ ہوا تو ٹی بی کا خدشہ نکلا ۔ وہ ہاسپٹل میں تھیں اور اب زندگی کی باگ ڈور رجی کے ہاتھ میں !

رجی ۲۲، ۲۳ سال کی تھی اور زندگی کی اس منزل پر تھی جہاں پہنچ کر ہر عورت کی بس ایک ہی تمنا باقی رہ جاتی ہے۔ زبان کہے نہ کہے، آنکھ کہہ دیتی ہے کہ وہ کون تمنا ہوتی ہے۔ آنکھ جھک جائے تو انگ انگ بولنے لگتا ہے۔ مگر رجی خود کو یوں سنبھالے سنبھالے چل رہی تھی۔ اور اپنی اس چال پر مطمئن بھی تھی، کہ جیسے اس کی سوئی سوئی زندگی میں جاگل سی پڑ گئی ہو پانی سامنے ہو تو پیاسا بہت دنوں دل پر جبر نہیں کر سکتا۔ صبر نہیں کر سکتا۔

مگر شاید وہ ابھی خود کو آزما رہی تھی۔

جاوید، شمو، گولو اور اظہر کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ اور رجی حسب معمول غائب تھی۔ اظہر پائپ کی راکھ پھینکنے کے بہانے اٹھا اور کھڑکی تک ہو آیا۔ اس نے جھک کر دوسری طرف دیکھا، ہتھیلیوں میں ٹھوری ٹکائے وہ بڑی معصومیت سے بیٹھی تھی۔

او بڑی سرکار، میں نے کہا حضور کیا کر رہی ہیں؟" وہ کھڑے کھڑے چہکا۔

رجی تیزی سے پلٹی۔ اس کے چہرے کا رنگ یکسر بدل گیا۔ گھبرا کر بولی:

"جی۔ جی۔ کچھ بھی نہیں تو..."

اظہر اسے ڈانٹ کر بولا۔ "کچھ بھی نہیں تو پھر ہم میں آکر بیٹھتی کیوں نہیں، کیا ہم کوئی ڈھیڑ چمار ہیں؟"

رجی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں (مجھے اس لمحہ سے ڈرنا چاہیئے...... مجھے اس لمحے سے ڈرنا چاہیئے .... خداوندا)

وہ بنا کچھ کہے سنے اٹھی اور پرلی طرف سے سیڑھیاں پھلانگ کر گول کمرے میں آ گئی

"اب تو آپ خوش ہوئے۔" وہ بے پناہ سنجیدگی سے بولی تینوں ہنسنے لگے۔

تینوں ہنسنے لگے مگر اظہر اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"جا بھئی تو جا اپنا کام کر، ایسی بیزار ہو کر کیوں بیٹھی ہے، ہماری محفل میں بوریت پھیلا رہی ہے تو..."

جاوید نے ذرا حیرت سے اظہر کو دیکھا۔ مگر شمو تالیاں پیٹ کر ہنستی ہوئی بولی

"بہت اچھے اظہر بھائی، یہ اسی لائق ہیں۔ یہ سمجھتی تھیں جیسے کوئی ان سے بڑا ہے ہی نہیں۔ بس ہردم ہم پر رعب گانٹھتی رہتی تھیں۔ اب آیا نہ مزا؟"

"کیوں ری چڑیل، میں نے تجھ پر کب رعب گانٹھا۔" رجی ہنس کر ذرا ندامت سے بولی۔ "جاوید بھائی سے پوچھئے۔ گولو سے پوچھئے اور مجھ بدنصیب سے پوچھئے اور یہ نہیں تو اظہر بھائی خود ہی بتائیں۔ اس رجی کی بچی نے آپ پر بھی رعب گانٹھنے کی ناکام کوشش کی تھی یا نہیں؟"

رجی تیزی سے اُٹھی اور شمو کے پیچھے لپکی مگر راستے ہی میں اظہر نے اسے جالیا اور ہنس کر بولا

"ہاں ہاں، اتنی تیزی بھی اچھی نہیں۔"

رجی نے گلابی آنکھوں کا سارا خمار سمیٹ کر اظہر کو دیکھا، یونہی سادگی سے، جیسے وہ شمو کو دیکھتی، اظہر میں کون خاص بات تھی۔ وہ تو سب کو ایسے ہی دیکھے گی۔ وہ کسی سے نہیں ڈرے گی، ہاں، ہاں اسےمیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔؟ مگر اظہر اس کی بے پناہ معصومیت سے اس کی آنکھوں کے حسن سے (حسن جو بڑا زہریلا تھا بڑا قاتل تھا) اس کی بے باک خوبصورتی اور بھولپن سے ڈر گیا۔ سہم گیا۔ وہ الٹے پیروں یوں جیسے کسی دیوی کے چرن چھو کر جارہا ہو۔ چلتا چلتا اپنی کرسی پر جاکر بیٹھ گیا۔ اُف! کسقدر گہرا طوفان تھا۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ میں یقیناً ڈوب جاتا، یقیناً ڈوب جاتا.... یقیناً...

"یقیناً۔" وہ باآواز بلند بولا "تمہاری یہ الگ الگ رہنے کی ادا اچھی نہیں۔" پھر وہ بڑا خوش ہوا کہ وہ رجی۔ کے سامنے کچھ بول سکتا ہے، ہونٹ ہلا سکتا ہے۔ زبان کو کام میں لا سکتا ہے۔ ورنہ اس کے مرجانے میں کیا کسر باقی رہ گئی تھی۔ (ویسے اظہر میاں سچ بتانا اس نے خود سے پوچھا کیا تم بھی اپنا شمار زندوں میں کرتے ہو؟")

صبح سے امی کی طبیعت بہت خراب تھی اور رجی سارے گھر میں گھبرائی گھبرائی سی

پھر رہی تھی ۔ اگر امی کو کچھ ہو گیا تو ۔ ؟ ۔ تو ۔ ؟ ۔ تو ۔ ؟ یوں امی کرتی دھرتی کچھ نہیں تھیں۔ مگر ان کی موجودگی کا، زندگی کا احساس ہی اس کے لئے سب کچھ تھا۔ خدا کو دیکھا کس نے ہے، وہ مادی شکل میں کس کے دُکھ درد بانٹنے آتا ہے۔ ؟ مگر اس کی موجودگی اور بڑائی کا احساس ہی تو سب کچھ ہے ۔ کوئی ۔ وہ کوئی جو ہم سے بڑا ہے، ہم پر چھایا ہوا ہے نظر نہیں آتا نہ سہی، مگر ہمارے درمیان موجود تو ہے ۔ اس کا احساس تو زندگی بخش ہے امی بھی اس گھر کے لئے کچھ وہی درجہ رکھتی تھیں۔ یعنی انسان اگر کسی انسان کو خدا کہنے کی بے باک جرأت اور گستاخی کر سکتا ہے تو امی خدا تھیں ۔ ہاں اس گھر کی خدا ۔

رجی کی پریشانی بالکل بجا تھی ۔

شام کو وہ برآمدے میں نکل کر بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی ۔ جاوید سامنے آیا تو وہ لجاجت سے بولی۔

" جیدی پیارے، مجھے ایک رکشا لا دے ناگڈے ۔ ہاسپٹل جانا ہے۔"

پرلے سرے سے اظہر سر نکال کر بولا

" اور جناب ہمارا کھٹارا کس دن کام آئے گا ۔" اور وہ باہر نکل آیا

رجی نے تھوڑی دیر کو اس کی طرف دیکھا، پھر نگاہیں ہٹالیں ۔

"ہم کسی کا احسان کیوں لادیں اپنے سر ۔" وہ جیسے خود کو بچانے کی کوشش میں بولی ۔

" تو گویا ہم کسی ہیں نا ۔ آپ کے کوئی نہیں ۔ وہ مصنوعی خفگی سے بولا

" ہیں کیوں نہیں ۔ ابو کے دوست کے چہیتے بیٹے ۔ ابو کے چہیتے بھتیجے اور"... اکدم اس کی زبان رک گئی اور اس نے بوکھلا کر اظہر کا نوٹس لئے بغیر ذرا درشتی سے کہا۔ " جیدی ہاسپٹل کا ٹائم نکلا جا رہا ہے۔"

اظہر نے بھی رجی کا نوٹس نہ لیا ۔ بڑے بڑے ڈگ بھرتا، وہ سیڑھیوں سے اترا اور کار میں گھس گیا۔ ہلکی سی گھڑگھڑاہٹ ہوئی اور کار سیڑھیوں کے پاس آکر رک گئی

وہ مشین کی تیزی سے اُترا اور رجی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کار میں ڈھکیل دیا۔ اور مُڑ کر جیدی سے بولا

"یار اگر اس لڑکی پر میرا بس چلتا ناتو "..... موٹر کی گھرگھراہٹ میں رجی نے بعد کے الفاظ سنے نہیں، مگر راستے میں چلنے والے جھاڑ، بجلی کے کھمبے، چلتی لڑکھتی گاڑیاں، لمبی لمبی بسیں جیسے کانوں میں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔

اگر میرا بس چلتا۔ اگر میرا بس چلتا — اگر میرا.....

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اور بڑی خوشی سے سوچنے لگی — "اچھا ہی ہے کہ مجھ پر کسی کا بس نہیں چلتا — ہاں —"!

ابّو، امّی کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے اور ساری فضا میں عجیب غمنا کی سی پھیلی ہوئی تھی وہ دونوں داخل ہوئے، تو ایک لمحے کو دونوں نے رجّی اور اظہر کو دیکھا اور پھر اسی ماحول کا ایک حصّہ ہوگئے۔ اظہر نے بڑے تعجب سے سوچا کہ امّی نہ ابو، کسی نے رجّی کو میرے ساتھ دیکھ کر ناک بھوں نہیں چڑھائی۔ یہ کیسا گہرا اعتماد ہے۔ کیا سچ مچ یہ عبادت کئے جانے کے لائق کوئی چیز ہے۔ یا پھر میں ہی ایسا سمجھتا ہوں۔ ؟

اسے کچھ پتہ نہیں وہ کتنی دیر بیٹھا۔ — کیا ہوا — لاحول ولاقوۃ اچھا بھلا وہ دلی کی ہائی سوسائیٹی میں (MOVE) کرتا تھا۔ یہاں آکر تو وہ بچاری بن بیٹھا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ زبان کھول بھی پاتا تو اسے لگتا کہ وہ سب کچھ دل ہی دل میں رہ گیا۔ الٹی سیدھی باتیں ہی کر جاتا تھا۔ ایسی کیسی بے بسی ہے یہ ؟

"چلیئے —" اور وہ اپنی دنیا سے اس دنیا میں لوٹ آیا۔

"ہاں ہاں چلنا تو ہے ہی۔" پھر وہ اپنے چچا جان کی طرف مڑا،

"چلیئے آپ بھی بیٹھ جایئے۔"

وہ اپنی ازلی مصروفیت جتاتے ہوئے بولے: "ناں بھائی، میں تو ادھر سے سیدھے حیدر صاحب کے ہاں جاؤں گا۔ کل ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے جناب" (اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ جملہ اس نے

زور سے نہیں کہہ دیا تھا)

دروازے سے نکلتے نکلتے اس نے دیکھا۔ امی ان دونوں کو بڑی غمگین اور بے بس نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ رجی آگے آگے اپنے لمبے لمبے دامنوں کو جھلاتی جا رہی تھی، وہ پیچھے پیچھے آرہا تھا اس کے قدموں کے نقش پر اپنے قدم جماتے ہوئے۔

" دیکھئے — آپ میرے سامنے چلئے - آپ کو نہیں معلوم بدنصیبوں کے نقش قدم پر چلنے سے بڑی ......

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا - اظہر ہنسا -

" آپ کو الہام بھی ہوتا ہے کیا " رجی نے اسے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بولا " ہاں ہاں ٹھیک تو پوچھتا ہوں، - ورنہ آپ نے کیسے جانا کہ میں آپ کے نقش قدم پر چل رہا ہوں ؟

" ہنک " — بس اتنی سی ہنسی تھی - ہلکی سی " ہنک " کے ساتھ جو شروع بھی ہوئی اور ختم بھی — مگر کتنی باتیں اس ننھی سی آواز نے کہہ دیں ؟!

" امّی کی طبیعت بہت خراب ہے - جنرل وارڈ کا واسطہ ہے نا، کسی کو پاس رہنے بھی نہیں دیتے - ورنہ آج میں یہیں رہ جاتی - وہ اظہر کو سنا ضرور رہی تھی، مگر مخاطب نہیں کیا تھا -

اظہر نے اسے دیکھا - بہت دیر تک دیکھتا رہا - بولا کچھ نہیں - رجی نے ایک بار چلتے چلتے ذرا کی ذرا رک کر اسے دیکھا اور اظہر گڑبڑا کر بولا

" پتہ نہیں، آپ لوگ پوز کرتے ہیں یا واقعی کچھ غریبی کا معاملہ ہے - آپ کا چھوٹا سا بنگلہ تو ایسا فرسٹ کلاس ہے - سامنے مزیدار باغیچہ بھی ہے - ہماری دلی میں تو ایسا مکان سچ مانیئے پچاس ساٹھ ہزار سے کم میں نہیں ملنے کا — "

" تو کیا آپ کا مطلب ہے ہم مکان بیچ دیں - " وہ بڑی سنجیدگی اور طنز سے بولی -

" لاحول ولا - میں نے یہ کب کہا - " وہ بھاگ گیا -

" وہ تو دادا جان کا بنایا ہوا ہے - اور پھر یہ ہے نا کہ اگر ہم بیچنے کے بارے میں

سوچ بھی لیں تو مکان کا کرایہ جائے گا ہی، پھر کیا فائدہ کسی کی روح کو دکھ پہنچا کر۔"

"آپ کو صرف روحوں کے سکھ کا خیال رہتا ہے، یا زندہ انسانوں کی بھی بات کر سکتی ہیں آپ۔" وہ بڑی بے ڈھنگی سے بول گیا۔

"جی!" وہ نا سمجھے بولی اور سیڑھیاں اُتر کر کار کے پاس پہنچ گئی۔ "اللہ جانتا ہے" وہ خود سے کہنے لگی۔ "وہ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا کہ کسی کو خواہ مخواہ زیر بار کیا جائے۔ جیدی، اور گولو کو اتنی بار منع کیا گیا مگر وہ سنتے نہیں۔"

اظہر سمجھ گیا۔ "اچھا تو آپ سمجھتی ہیں ذرا سے پٹرول سے میں زیر بار ہو جاؤں گا۔ مگر یہ تو سوچئے جناب۔ سبھوں کے کالج اسکول رستے میں پڑتے ہیں، جاتے جاتے اُتار دیتا ہوں۔ آپ کیوں بگڑتی ہیں؟

"مجھے اُلّو نہ بنایئے۔ حیدرآباد میرا دیکھا بھالا شہر ہے۔ آپ راستے میں چھوڑ جاتے ہیں انھیں یا..." وہ ہنس پڑی۔ "باتیں خوب بناتے ہیں آپ —؟"

رجی بہت کم ہنستی تھی اور جب ہنستی تھی تو اس قدر خوبصورت ہو جاتی تھی کہ اظہر کی نگاہ اس کے چہرے پر ٹھہر نہ سکتی (اسے ہنستا دیکھ کر ایک بار یونہی اظہر نے سوچا تھا۔ "بھلا بجلی پر نگاہ کیسے ٹھہر سکتی ہے؟)

کار تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اس کے بال ہوا کے ہلکوروں سے، رومال سے بھی قابو میں نہیں آرہے تھے۔ اظہر گھبرا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟ یوں ہی بات چلانے کو بولا

"میرے البم میں آپ کی کئی تصویریں ہیں۔"

"مگر میرے البم میں تو آپ کی کوئی تصویر نہیں۔" وہ ذرا مسکرا کر بولی (مگر دل میں تو موجود ہے جیسے کوئی قریب سے بولا) اس نے گھبرا کر اظہر کو دیکھا اور بولی "آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا؟ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی کانوں میں سرگوشیاں کر رہا ہے۔ پتہ نہیں امی کیسی ہوں؟" اس کا چہرہ گہرے غم میں ڈوب گیا۔ اظہر کو اس پر رحم سا آ گیا۔

"اچھی ہوجائیں گی ، گھبرانے کی کیا بات ہے۔؟" اس نے نہایت بھونڈے انداز سے تسلی دی۔ رجی نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے وہ اچھی ہوجائیں گی۔

اظہر سٹ پٹا گیا۔ وہ تو اپنی رو میں جانے کیا کیا بکے جارہا تھا، بولا: "خدا اتنا بے رحم بھی تو نہیں ہوسکتا نا"

"ہاں ۔" وہ طنز سے بولی اور چپ ہوگئی

رات کو خوب پانی برسا۔ جگہ جگہ پانی ٹھہر گیا۔ سرد، سرد ہوائیں چلنے لگیں اور کھڑکیوں کی راہ آآکر برچھیاں چبھونے لگیں۔ رجی ہڑبڑا کر اٹھی۔ کھڑکیاں بند کیں اور گولو اور شمو کی رضائیاں گردن تک اُڑھادیں۔ جیدی تو ہمیشہ سے اوڑھ لپیٹ کر سونے کا عادی تھا۔ وہ خود بھی لیٹ گئی

"اور اظہر کے کمرے کی کھڑکی بند کی رجی تم نے"؟) جیسے کوئی قریب سے بولا۔

رجی کتنی دیر بالکل ساکت پڑی رہی۔ کیا جواب دے اس پکار کا۔ ۔کیا بولے ؟ کیا کہے ؟ کھڑکی لقیناً کھلی ہوگی۔ اور تیز ہوا اسے برچھیاں چبھو رہی ہوگی۔ پھر کیا یہ اس کا فرض نہیں تھا کہ جس طرح گولو، شمو اور جیدن کی دیکھ ریکھ کرتی تھی، اظہر کی بھی کرے ۔ مگر وہ اتنی رات گئے اپنے کمرے میں مجھے دیکھ کر کیا سوچے گا۔ ؟ کیا کہے گا۔؟ اونہہ۔ سوچے گا کیا۔ کیا میں کسی بری نیّت سے جارہی ہوں۔ ؟ اور وہ اپنی رضائی پھینک کر اُٹھ کھڑی ہوگئی۔ دھیرے دھیرے وہ ایک آوارہ اور بھٹکی ہوئی روح کی طرح برآمدوں اور کمروں سے ہوتی ہوئی اظہر کے کمرے تک پہنچ گئی۔

اس کا خیال کتنا صحیح تھا۔؟ کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور شمالی دریچے کی تیز ہوائیں تو سیدھی اس کے سرہانے پڑرہی تھیں۔ رضائی جانے کب کی زمین پر گری پڑی تھی اس کے بال تیز ہوا سے کانپ رہے تھے اور وہ پھر بھی گہری نیند میں تھا۔ کتاب اس کے سینے پر پڑی ہوئی تھی۔ اور رات کو وہ زیرو پاور کا نائٹ بلب جلانا بھول گیا تھا۔

تبھی اس کے کمرے میں جگ مگ روشنی ہو رہی تھی ۔ رجی نے کھڑکی سے باہر جھانکا ۔
پھول پودے ہواؤں میں جھوم رہے تھے ۔ اور باہر سائیں سائیں رات کے سناٹے کو بوندوں
کی رم جھم نے ایک دل آویز اور کبھی نہ فنا ہونے والی موسیقی میں ڈھال دیا تھا ۔ کمرے کے
پردے ہواؤں سے کانپ رہے تھے ۔ اور خود رجی کا دل بھی ۔

کسقدر حسین رات ہے ۔ اس نے جیسے خود سے کہا پلنگ پر اظہر سویا تھا ، گلابی
پپوٹوں کے اندر اس کی نیلی پتلیاں بھی خوابوں میں گم ہوں گی ، ۔ اُف یہ رضائی ۔ کیا اسے
سردی نہیں لگتی ۔ ؟

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی ۔ اور آگے بڑھی ۔ اور آگے ، پھر اس نے آہستگی
سے رضائی اُٹھائی اور اسی آہستگی سے اس کی گردن تک اُڑھا دی ، ۔ اچانک اس کا ہاتھ
اس کے چہرے سے جا ٹکرایا ۔ اُف ! ناک کس قدر ٹھنڈی ہو رہی تھی ! اس نے بیتابی سے
اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا ۔ تیز ہواؤں کی دھار نے اس کے ماتھے ، چہرے ، ناک اور
گالوں کو برف بنا دیا تھا ۔ اس نے
اپنے چھوٹے چھوٹے گرم گرم ہاتھ اس کے گالوں پر رکھ دیئے ۔ یہ احساس اسے زندگی بخش
رہا تھا کہ وہ اپنے جسم کی ، اپنے خون کی گرمی سے کسی کی زندگی کا سامان کر سکتی تھی ۔
یکدم تیر کی تیزی سے اظہر اُٹھ کر بیٹھ گیا ! گہری نیند سے جیسے اُسے کسی نے جھنجوڑ کر
بیدار کر دیا ہو ۔ رجی کے ہاتھوں کے لمس نے اس کے سوئے ہوئے جسم کو بیدار کر دیا تھا ۔
اب وہ قیامت تک نہیں سو سکتا تھا ۔ اسے گہری نیند سے رجی نے یوں جگایا تھا
کہ اب وہ کبھی نہیں سو سکتا تھا ۔ کبھی نہیں ۔ کبھی نہیں ۔

بوندوں کی رم جھم رم جھم موسیقی اور دل آویز ہو گئی ۔ سر سر ہواؤں نے گیتوں کا سماں ،
باندھ دیا ۔ پھولوں کی خوشبو باغوں سے ہوتی ہوئی یہاں تک آ گئی تھی اور پتوں کی سرسراہٹ
ایک نغمہ بن گئی ۔

اظہر سحر زدہ سا اُسے دیکھ رہا تھا ۔ نیلے ہلکے رنگ کے بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ

اور بھی دلکش ہو گیا تھا۔ سفید لبادے کے لمبے دامن فرش پر ڈھیر ہو گئے تھے اس کے بال رومال کی قید سے آزاد تھے۔ اور وہ یوں ساکت و صامت کھڑی تھی جیسے جان ہی نہ ہو اظہر اُٹھا۔ اس کے قریب گیا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں آہستگی سے یوں تھاما جیسے ہلکے دھکے سے چٹخ جانے والا کانچ ہو۔ رجی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی اس کا چہرہ اظہر کے ہاتھوں میں تھا اس کی آنکھیں اظہر کی آنکھوں سے اس قدر قریب تھیں۔ اس کا چہرہ اظہر کے چہرے سے اسقدر قریب تھا۔ اس کے ہونٹ اظہر کے ہونٹوں سے اس قدر قریب تھے۔ اظہر کے اپنے چہرے پر ایک جلا سی تھی۔ اس کی تابناک آنکھوں سے یہ روشنی نکل نکل کر اظہر کے چہرے کو بھی منور کر رہی تھی۔ اظہر اس عبادت خانے میں تم کیسے نکل آئے؟ کیا تم خود کو اس کا اہل بھی پاتے ہو۔۔ ؟ تم۔ تم۔

اظہر خائف ہو گیا۔ ڈر گیا۔ سہم گیا۔ اس کے چمکتے ہوئے ہونٹ۔ اس کا گرم اور تپا ہوا چہرہ۔ اس کی نیلی نیلی چمکتی آنکھیں، ایک لمحے میں، لمحے کے ہزارویں حصے میں اکدم دُور ہو گئیں۔ اس نے رجی کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ وہ تڑپ کر ریلنگ پر آبیٹھا۔ اس کا سانس اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ یوں جیسے کڑے کوسوں چل کر آیا ہو۔ نہیں وہ کبھی اسے چھونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس قدر معصوم اور پاک تھی۔ وہ دنیا کے چھل اور فریب سے بالکل ناواقف سی مورت وہ کیسے اسے گنہگار بنا سکتا تھا۔ اظہر کا سانس رکا اور وہ جیسے سرگوشی میں بولا۔

"رجی۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بولو رجی جواب دو۔ رجی۔ رجی؟"

رجی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی زندگی کا سارا غم سارا کرب، اس کی چراغوں ایسی آنکھوں میں سمٹ آیا۔ چراغوں کی روشنی بہنے لگی وہ لپک کر آگے بڑھی اور اظہر سے لپٹ گئی۔

"رجی۔" وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولا۔ "میں شاید تم سے محبت نہیں کرتا۔ کر بھی نہیں سکتا۔ میں نے جب اپنی اس آگ کا تپش کا، اس جلن کا تجزیہ کیا۔ میں نے محسوس کیا

کہ محبت کا نام اس جذبے کے لئے موزوں نہیں ۔ یہ جملہ تو بہت گھسا پٹا بڑا ذلیل سا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔ نہیں رجی میں اسے محبت کا نام نہیں دے سکتا ۔ تم محبت نہیں کچھ اور ہو ۔ شاید وہ ہو جو زندگی کے لئے سب سے اہم ہوتا ہے ۔ مجھے معاف کرنا رجی ۔ مجھے الفاظ بنانے نہیں آتے ورنہ شائد میں اپنے دل کی صحیح ترجمانی کر بھی دیتا" اس نے ایک بار رجی کو دیکھا اور پھر رجی میں جذب ہوتا ہوا بولا ۔

"رجی میں تمہاری عبادت کرتا ہوں ۔"

باہر رات ہولے ہولے بیت رہی تھی اور وہ کبھی نہ فنا ہونے والی لازوال اور دل آویز موسیقی تیز تر ہو گئی تھی ۔

رم جھم ۔ رم جھم
آج رجی کے آنسوؤں کو راہ مل گئی تھی ۔

دوسرے دن امی کا انتقال ہو گیا ۔

رات بھر وہ بے کلی محسوس کر رہی تھیں ۔ تیز بخار میں جب کہ باہر تیز بارش ہو رہی تھی وہ ہاسپٹل کے باغ میں پڑے ۔ بنچ پر جا کر بیٹھ گئیں ۔ برسات کا سارا پانی ان کے سر، جسم اور کپڑوں میں رستا رہا، جذب ہوتا رہا ۔ ڈیوٹی نرس جب دوا پلانے ان کے بیڈ پر آئی تو وہ غائب تھیں ۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، بازو والے پیشنٹ سے پوچھا، اور جب کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہ بنچ پر بے ہوشی کے عالم میں پڑی دکھائی دیں ۔ مگر دنیا کی کوئی دوا ان کو ہوش میں نہیں لا سکتی تھی ۔ ان کا سینہ جکڑ گیا تھا اور سانس چلنا بند ہو گیا تھا ۔

وہ رات بڑی بھیانک، بڑی جان لیوا ۔ اور بڑی اداس تھی ۔ صحن میں امی کی لاش رکھی ہوئی تھی ۔ فضا میں عود اور لوبان کی خوشبو تھی ۔ گھر کے سارے لوگ یوں چل پھر رہے تھے جیسے انسان نہ ہوں روحیں ہوں ۔ رجی صبح سے بیہوش پڑی تھی ۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا گھر میں کیا ہو رہا ہے ۔ وہ صبح سے نڈھال اور ڈری ڈری تھی اس نے کوئی گناہ

نہیں کیا تھا۔ کوئی پاپ نہیں کیا تھا۔ اس کی کنواری جوانی ابھی تک ویسی ہی اچھوتی تھی اور بے داغ تھی۔ کنول کی منہ بند کلی کی طرح اس کا سارا شباب، اس کی ساری خوبصورتیاں ابھی اس کے اپنے سینے میں بند تھیں، مگر گھر کی چار دیواری میں پلنے والی ڈرپوک لڑکی کے لئے محبت کا اظہار بھی کسی گناہ سے کم نہیں تھا۔ اور پھر وہ تپش اور وہ آگ جا اظہر کی آنکھوں سے نکل کر اس کی اپنی آنکھوں میں ضم ہو گئی تھی، اسے بن موت مارے ڈال رہی تھی۔ وہ حد درجہ نڈھال تھی۔ ایسے میں جب گیارہ بجے کے قریب اسے اپنی ماں کی موت کی خبر ملی، وہ سنتے ہی جہاں تھی وہیں گر پڑی۔

گھر کی ویرانیوں اور اداسیوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ دن پہلے بھی ایسے ہی تھے جیسے اب — امی کا جسم پہلے بھی کب موجود تھا۔ وہ تو ایک خیال تھیں۔ مگر ایسا خیال جو کہ حقیقت سے بھی سوا ہوتا ہے۔ اب ۴ بجے ہاسپٹل کھانا جانے کی گڑبڑ نہ ہوتی۔ مغرب کے وقت واپسی پر موٹر کی گھر میں گھر گھراہٹ کے ساتھ، جیدی، گولو، اور شمو کے قہقہے نہ گونجتے اظہر کی بے تکلف باتوں اور لطیفوں کی بھی جیسے موت ہو گئی تھی — غم، لباس اور کنگھی سے بے نیازی نے اس کے حسن کو اور بڑھا دیا تھا۔ میلے کپڑوں اور روکھے بالوں میں وہ جہاں بیٹھتی بیٹھی ہی رہ جاتی — ایک ماڈل کی طرح گھنٹوں اسی طرح گذر جاتے اور وہ پلک نہ جھپکاتی۔

جیدی ایک دن کالج سے واپسی پر سیدھا رجی کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ بڑی بے دلی سے کھڑکی سے باہر گھورے جا رہی تھی۔

"آپا — کل میری فیس کی آخری تاریخ ہے۔" وہ اس کے کان میں بولا۔

"اچھا۔" وہ چونکی "مگر" وہ کچھ دکھ سے بولی،

"جو کچھ روپیہ تھا وہ تو امی پر اٹھ گیا۔" آنسوؤں کی شدت نے اس کا گلا جکڑ لیا۔

"خیر کوئی بات نہیں — میں امتحان نہیں دوں گا — کوئی نوکری ڈھونڈ لوں گا۔

"شرم نہیں آتی ذرا سی۔" رجی غصہ سے بولی۔ "ڈاکٹر بننے میں کل ایک سال رہ گیا ہے اور یوں ذرا سی مصیبت کے لئے پڑھائی ادھوری چھوڑو گے —

— میں انتظام کر دوں گی۔"

"کہاں سے کریں گی — مجھے بھی تو بتائیے۔" جیدی محبت سے بولا

"تجھے اتنی باتوں سے غرض۔" وہ ہلکے سے مسکرا کر بولی

"اور آپا میری فیس بھی تو دینی ہے۔" شمو بھی کمرے میں آدھمکی تھی۔ پیچھے سے گولو نے کورم پورا کر دیا — "اور میری —؟"

وہ تینوں اس کے سامنے بچوں کی طرح کھڑے اپنا سوال دہرا رہے تھے۔ اس کو اپنی بزرگی کا شدید احساس ہوا۔ اور وہ کھلے دل سے بولی۔ (حالانکہ امی نے زیورات نہ توڑنے کو قسم دے رکھی تھی۔)

ابھی تو میرے پاس سونے کی چوڑیاں ہیں — بعد کا بعد میں دیکھا جائے گا۔"

وہ تینوں کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جیدی اس کے پیچھے پیچھے گیا اور بولا: "آپا میری ایک بات مانیں گی آپ؟"

"کیا ہے"؟ وہ آنکھیں اُٹھا کر بولی

"آپ شادی کر لیجئے۔"

رجّی کے منہ پر گلال بکھر گیا۔ وہ خود کو سنبھال کر بولی، ہٹ پگلے۔ بڑی بہن سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"ارے آپا سچ کہہ رہا ہوں۔ مذاق نہیں۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے آپ کو چکّی کی طرح پستے ہی دیکھا ہے۔ شادی ہو گی تو آپ بھی ذرا سکھ سے سانس لے سکیں گی۔

رجّی نے کچھ ناگواری سے جیدی کو گھورا — "اچھا اور میں چلی گئی تو آپ سب لوگوں کا کیا بنے گا۔"؟

کیوں؟" طنز سے بولا: "آپ ہماری خدا ہیں!"

رجّی مسکرائی "تھوڑی دیر کو ایسا ہی سمجھو۔"

جیدی چڑ کر بولا "ابو نہیں ہیں کیا؟"

"ابو کی صحت اس قابل ہے کہ وہ گھر چلا سکیں ؟ اور میاں جیدی، مرد بھلا کیا خانہ داری میں اُلجھے گا۔ تم تو پاگل ہو بس ۔"

"شمو دیکھو ریکھ کرلے گی ۔"

"بہت خوب، کیا کہنے ہیں ۔ بے چارے کی چٹیا پکڑ کر تم گھما دیا کرو گے روزانہ ــــ ارے وہ تو بالکل بچّی ہے جیدی وہ کیا سنبھالے گی گھرداری ۔" اس کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا

" تو جہاں تک آپ کی باتوں سے اندازہ لگا سکا ہوں آپ کا یہی مطلب ہے کہ آپ شادی نہیں کریں گی ۔"

رجی شرمانے لگی ، " نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں ہے مگر بھئی مجھ ایسی ناکارہ لڑکی سے کون شادی کرے گا ؟"

جیدی کو سچ مچ غصّہ آگیا ۔ "آپ ناکارہ ہیں ؟"

وہ اُٹھ کر چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے اظہر کو گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا ۔

"اظہر بھائی ــ ہماری ان بہن صاحبہ کو سمجھایئے ۔"

کیا ــ کیا بات ہے بھئی ۔" اظہر پریشان ہو کر بولا

" یہ کہتی ہیں یہ اتنی ناکارہ ہیں کہ کوئی اُن سے شادی ہی نہیں کرے گا ۔"

اور وہ غصّے سے رجی کو دیکھنے لگا ۔ رجی کی حالت غیر تھی ۔ مارے شرم اور خجالت کے اس کا چہرہ عنابی ہو رہا تھا ۔ اکدم جیدی مڑا ۔

" اظہر بھائی ۔ ایک بات پوچھوں ــ سچ سچ جواب دیں گے آپ ؟"

اظہر مسکرایا تو جیدی اچانک بولا ۔ " آپ آپا سے محبّت کرتے ہیں نا ؟"

اظہر بری طرح گھبرا گیا ۔ رجی کا سارا بدن کانپنے لگا ۔

ماحول کا نقشہ ہی بدل گیا ۔ بڑی دیر بعد اظہر سنبھلا اور صلاحیت سے کہنے لگا ۔

"جیدی ــ آسمان پر چمکنے والا چاند کسی کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتا ۔ میری محبت کا بھی کچھ یہی حال ہے ۔ چاند سی روشن شے بھلا چھپائی بھی کیسے جا سکتی ہے ۔

سات پردیوں میں سے بھی جوت محسن چھن ہی جاتی ہے۔" اس نے رجی کی طرف دیکھا۔ رجی کے لئے یہ لمحہ بڑا عجیب، بڑا کٹھن، بڑا خوبصورت، بڑا لذت آمیز تھا۔

"اور یار" — اظہر کہہ رہا تھا۔ "تم میرے اس جذبے کو محبت کا نام دے کر اس کی توہین کرو بھی مت، — میں تمہاری آپا سے محبت نہیں کرتا۔ نہیں کر سکتا۔ میں جب ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں ان کو پوج ہی سکتا ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اگر میں نے انھیں حاصل کر بھی لیا تو شائد چھونے کی ہمت مجھ میں پیدا ہو گی ہی نہیں وہ تو آسمان ہے جیدی — اور میں —؟"

جیدی نے سر اٹھایا تو اظہر کمرے سے جا چکا تھا۔

رجی کی زندگی بہاروں سے بھر گئی!

برسات کی رم جھم کرتی رات جب ملگجی اندھیرے نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ رجی دھیرے سے اٹھی اور دبے پاؤں چلتی اظہر کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اظہر گہری نیند سو رہا تھا مگر اس کا شائد احساس جاگ رہا تھا۔ جیسے ہی رجی نے اس کے کمرے میں قدم رکھا، اس کا انگ انگ بیدار ہو اٹھا۔ مگر وہ یوں ہی پڑا رہا۔ رجی آہستگی سے اس کے قریب آئی پھر جھکی اور جھکی۔ اس کے نتھنے، سرخ سرخ نتھنے جو گلاب کی کومل پتیوں کی طرح ہنسنے میں لرزنے لگتے تھے، بے طرح پھڑک رہے تھے اس کی آنکھوں سے گرم گرم شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ہونٹوں کے کنارے بیقراری سے کانپ رہے تھے۔ اس نے اور جھک کر اظہر کو دیکھا۔ وہ بڑا معصوم دکھائی دے رہا تھا۔ رجی نے اس کی پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کیا۔ اور اس کی آدھے چاند ایسی پیشانی پر اپنے بیقرار کانپتے ہونٹ رکھ دیئے زندگی کے سارے دکھ۔ ساری کلفتیں، رنج و غم کا ہر احساس مٹ گیا تھا۔ فنا ہو گیا تھا۔ اب زندگی میں کوئی حسرت تھی نہ تمنا۔ بس سکون تھا۔ ایسا سکون جو مرکر ہی مل سکتا ہے۔ اس نے دھیرے سے اپنے ہونٹ ہٹا لئے۔ اظہر کی پیشانی پر اس کے ہونٹوں کا سرخ سا نشان پڑ گیا تھا۔ یہ داغ محبت جو بیک وقت چاند بھی تھا۔ اور اس کے پیار

کی مُہر بھی!

"تم میرے ہو — صرف میرے — صرف میرے

وہ دھیرے ہی دھیرے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑاتی رہی — جاتے جاتے اس نے ایک بار پھر غور سے دیکھا اور دو آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے۔ باہر رم جھم موسیقی تھی اور فضا میں پھولوں کا عطر —!

رجّی خوش تھی — بہت خوش۔ اس کی خوشیوں کا کوئی کنارا نہ تھا۔ ماحول گنگناتا محسوس ہوتا۔ گھر کے ذرّے ذرّے سے نغمے پھوٹتے محسوس ہوتے۔ کیا وہ بدل گئی تھی؟ کیا زندگی ہی نئے راستے پر چل پڑی تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اظہر سے ضرور شادی کرے گی۔ اب وہ اظہر کے سامنے آتے جھینپنے لگی تھی۔ وہ وہی تھی۔ اظہر بھی وہی تھا۔ مگر اک حجاب سا دونوں کے بیچ حائل ہو گیا تھا۔ اگر اکیلے میں کبھی اظہر پاس آجاتا تو وہ کانپنے لگتی۔ منہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیتی جب تک اظہر چلا نہ جاتا اس پر یہی بے قراری رہتی۔

ایک دن شمّو نے زبردستی رجی کو پکڑ کر اپنی ساڑی، بلاؤز پہنا دیا۔ اور اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر گردن کے پاس بڑی سی گرہ ڈال دی رجی بالکل بدل گئی کوئی اور ہی چیز بن گئی۔ سنگار میز کے سامنے بیٹھی وہ ناخنوں پر پالش لگا رہی تھی کہ کنگھا لینے اظہر آگیا۔

"ارے — رجی یہ تم ہو" وہ کھڑا کھڑا سا اسے دیکھنے لگا۔

شمّو باہر سے دوڑی آئی اور آتے ہی پیچھے سے بولی۔

"کیوں اظہر بھائی آپا کتنی پیاری لگ رہی ہیں نا —؟"

"ارے ہاں بھئی — پہچانی ہی نہیں جاتیں۔"

"پہچاننے وہچاننے کا میں نہیں پوچھ رہی۔" شمّو بور ہو کر بولی "یہ بتائیے کیسی لگ رہی ہیں —"

"کاش میں بتا سکتا۔" اظہر سانس بھر کر بولا۔ پھر رجّی سے مخاطب ہو گیا "رجّی تم ساڑی کیوں نہیں پہنتیں؟"

بڑی سادگی سے شمو بولی :" اجی نہیں اظہر بھائی ساڑی پہننا آپا کو بُرا تھوڑی لگتا ہے، مگر بات یہ ہے کہ وہ آپا والے لبادے میں کپڑا کم لگتا ہے نا۔ ساڑی ہو تو پھر پیٹی کوٹ بھی ہو پھر بلاؤز بھی ہو۔ جتنے میں یہ جوڑا بنے ہماری آپا کے دو جوڑے بن جاتے ہیں ۔"

"اچھا صاحب "۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا

" پھر آپ بھی آپا کی طرح لبادے کیوں نہیں پہنتیں ؟"

"آپ نہیں جانتے اظہر بھائی میری آپا تو بڑی پیاری، بڑی خیال والی ہیں۔ وہ خود تکلیف برداشت کر لیتی ہیں مگر کسی کو تکلیف میں یا دکھ میں نہیں دیکھ سکتیں ۔"

" بڑی سادھو مہاتما قسم کی معلوم ہوتی ہیں، آپ کی آپا "

وہ مسکرایا۔

"ہاں اظہر بھائی ۔ ایسے ہی ایک بار میں نے آپا سے کہا تھا، مجھے ساڑی اچھی لگتی ہے بس اب مجھے ہمیشہ ساڑیاں خرید کر دیتی ہیں ۔ میں لاکھ روکوں مانتی کب ہیں ۔" وہ احسان مند ہو کر آنسوؤں میں ڈوب کر بڑی مشکل سے بولی ۔ "آپا تو سورج ہیں اظہر بھائی جو خود جلتا ہے مگر دوسروں کو روشنی دیتا ہے ۔"

دھڑ ۔ دھڑ ۔ دھڑ ، جیسے کہیں، آگ لگ گئی اور شعلے بھڑکنے لگے ۔ آگ اونچی ہی اونچی ہوتی گئی اور رجی اس میں جھلستی گئی ۔ رجی کا پورا پورا جل گیا ۔ رواں رواں جھلس گیا ۔ ابھی ابھی ساڑی پہنے حسن کی مورت بنی جو رجی بیٹھی تھی ۔ وہ جل گئی تھی، ختم ہو گئی تھی اور اب کرسی پر ہاتھوں میں تھوڑی لئے جو رجی بیٹھی تھی وہ کوئی اور رجی تھی ۔ بچوں کی ماں گھر کی بزرگ ۔ شمو باہر چلی گئی تھی ۔ اظہر ابھی تک کھڑا تھا اور رجی وہاں جھلسی ہوئی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی ۔

" شاید یہ خوشی میں برداشت نہ کر سکوں رجی ۔ یہ سورج میرے آسمان پر چمکے گا؟؟ میں دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی نہیں ۔ ۔"؟؟ وہ جھکا !

یہ لمحہ بڑا جان لیوا تھا ۔ زندگی اور موت کا سوال اسمیں چھپا ہوا تھا ۔ لرزتا، کانپتا

جھجکتا یہ لمحہ اس کے قریب آیا۔ اور قریب اور قریب ــــ وہ سمٹ گئی ۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے جا رہا تھا ــ وہ اظہر کی تھی ــ اپنے اظہر کی ، ــ کوئی مجبوری کوئی دکھ ، کوئی وجہ اسے اظہر سے دور نہیں کر سکتی ، نہیں ۔ نہیں ــ وہ اظہر کے بغیر نہیں جی سکتی ــ نہیں جی سکتی

" تو رجی تمہارے بعد اس گھر کا ۔ گولو کا ـــ جیدی کا شمو کا کیا ہوگا ؟ تمہارے بیمار ابو کو کون دیکھے گا ۔ میں بھی نہیں ، تم بھی نہیں ۔ پھر زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی رجی بٹیا " اس کی امی کہیں قریب سے بولیں ۔ رجی نے سر اٹھا کر ، گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا ۔ یہ آواز ــ یہ آواز کہاں سے آئی تھی ، یہ تو اس کے اپنے دل کی آواز تھی ۔ اس کی دھڑکنیں بول رہی تھیں ۔ یہ کیسے منہ پھیرے ؟ کیا کرے ؟ کدھر جائے ؟ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں ۔ آس پاس شور ہونے لگا سائیں سائیں ہوائیں چل رہی تھیں ۔ بادل گرج رہے تھے ۔ پہاڑ پھٹ رہے تھے ۔ زلزلے آرہے تھے وہ ڈول رہی تھی کبھی ادھر کبھی ادھر ـــ کبھی اُدھر ، کبھی ادھر ۔ پھر سب کچھ ساکت ہوگیا ــــ ماحول پرسکون ہوگیا ۔ اسے راستہ مل گیا ۔ اس نے فیصلہ کر لیا ۔ ایک چراغ سے چار چراغوں کی روشنی ، چار چراغوں کی زندگی ، کہیں بہتر ہے ۔ کہیں بہتر ہے ۔ اس کے سامنے روشنی پھیلتی گئی اور خود اس کی آنکھیں چندھیا گئیں ۔

اظہر کے دلی پہنچنے کے بعد ۔ اس کے ابا کا رجی کے ابو کے نام خط آیا ۔ انھوں نے اظہر کے لئے رجی کو مانگا تھا ۔ جیدی توکل کی بجائے آج ہی آپا کی شادی کر دینا چاہتا تھا مگر خود آپا نے ضد کر کے جیدی کی زبانی ابو کو کہلوا دیا ۔ "ان لوگوں سے کہہ دیجئے ہمیں شادی کی اتنی جلدی نہیں ۔ اب تھوڑے دِنوں کی بات ہے ، جیدی ڈاکٹر ہو جائے گا شمو بی اے ہو جائے گی ۔ زندگی کسی ایک راستے پر ہولے تو پھر آگے کی سوچی جائے گی ۔"

ابو اپنی صحت کی وجہ سے جلد از جلد یہ کام کروا دینا چاہتے تھے ۔ مگر رجی کے آگے ان کی ایک نہ چلی ۔ رجی کی بات ٹالنا ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں ۔ وہ اس گھر کا چراغ تھی جس کی روشنی میں سب راہ پاتے تھے !

رجی کی اس حرکت پر جیدی اتنا ناراض ہوا کہ اس نے بہن سے بول چال بھی بند کر دی۔

دن بڑی بے رنگی اور اداسی لئے گذر رہے تھے۔ بادل کبھی ایک جگہ نہیں رکتے، وقت بھی بادلوں کا ساہی تو ہوتا ہے۔ ابھی یہاں، ابھی وہاں، چپ چپاتے اتنے دن گذر گئے کہ رجی کے دل میں پیار کا داغ ناسور بن گیا۔

جیدی ڈاکٹر بن گیا۔ رجی کے دل کی بڑی تمنّا تھی جو خدا نے پوری کر دی تھی، مگر جیدی اس سے اتنا خفا تھا کہ منہ دے کر بات نہ کرتا۔

رجی اپنی صحت کی طرف سے جان بوجھ کر لاپرواہ رہنے لگی۔ اس پر مزید کام کئے جاتی۔ ہر لمحہ خود کو مشغول رکھنا چاہتی۔ نتیجے میں رہی سہی صحت اور تباہ ہوئی جا رہی تھی۔ سردیوں کے دنوں میں ایک بار وہ جان کر آنگن میں سوئی۔ اور صبح اس کی حالت غیر تھی۔ بستر پر پڑے پڑے اسے سرشام ہو گئی۔ جیدی گھر لوٹا تو رجی کو منہ لپیٹے سوا پایا۔ بڑے کمرے میں آیا تو دیکھا کہ گرد جوں کی توں پڑی ہے۔ کل کی دیا سلائی کی تیلیاں اور ایش ٹرے میں پڑی راکھ بھی فریاد کر رہی ہے۔ کھڑکی میں سے جھانکا تو دیکھا باغ کی روشوں پر پتیاں اور کچرا پڑا ہوا ہے۔ آنگن میں دھول اڑ رہی تھی اور بھوک لگی تو کھانے کا کوئی ٹھکان نہیں تھا۔ وہ گول کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اتنے دنوں کا غبار جو اس کے دل میں جما ہوا تھا آنکھوں کی راہ بہہ بہہ کر دل کو دامن کرنے لگا۔

"آپا ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ جو کرتی ہیں اچھا ہی تو کرتی ہیں۔ واقعی ان میں جو عقل اور ذمہ داری ہے اتنی ہم سبھوں میں ملا کر بھی نہیں۔ ایک دن وہ بستر پر پڑی ہیں تو گھر کا کیا حال ہو گیا ہے وہ اتنی سالوں اتنی محبت پر ور رہیں۔ امی کے بعد ہمیں تنہا چھوڑ بھی کیسے سکتی تھیں۔"

جیسے جیسے وہ سوچتا، آنسو اسی تیزی سے بہے چلے آتے۔ روتے روتے جیدی کی ہچکی بندھ گئی۔ اپنی امی کی موت پر بھی وہ اتنا نہ رویا تھا۔ اس کا پورا جسم سسکیوں سے ہل رہا تھا اور ضبط کی ناقابل برداشت شدّت سے اس کی سسکیاں اب ننھی چیخوں میں بدل رہی تھیں ساتھ والے کمرے سے رجی تباہ حال باہر نکل آئی۔ بخار کی تپش سے اس کا منہ تمتما رہا تھا،

وہ لپک کر آگے بڑھی۔

"کیا ہوا جیدی، کیا ہوا میرے عزیز۔" جیدی نے اپنے کندھے پر اس کا جلتا جلتا ہاتھ محسوس کیا۔

"آپا"۔ اس کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

رجی تو یونہی تباہ ہو رہی تھی۔ بھائی کو روتا دیکھ برداشت نہ کر پائی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

"آپا ہم سب نے آپ پر بہت ظلم ڈھایا ہے۔ آپا اب زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"کیا کہہ رہے ہو میرے پیارے، کون کہتا ہے تم نے مجھ پر ظلم ڈھایا ہے۔ تم لوگوں نے تو مجھے زندگی دی ہے۔ وہ سسک سسک کر کہہ رہی تھی۔" تمہاری وجہ سے تو میری زندگی میں خوشیاں ہیں۔"

"نہیں آپا۔" جیدی روئے گیا" میں جانتا ہوں آپ کے دل پر کیا بیتتی ہے۔ مجھ سے آپ کا حال چھپا نہیں ہے، آپا۔ میں۔ میں ...

" نہ رو میرے لال، نہ رو میرے، بیٹے" رجی کے ٹوٹے ٹوٹے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ شدّت ضبط سے کانپ رہے تھے، جیدی نے تڑپ کر سر اٹھایا!

" آپا۔ آپ نے مجھے لال کہا۔ بیٹا کہا۔ آپا .."

" ہاں جیدی، اب مجھے خیال آتا ہے، اظہر نے ایک بار مجھے مریم کہا تھا۔ مریم بھی تو کنواری ماں تھی نا۔ میں بھی۔ میں بھی۔ ..

اور اس نے روتے روتے اپنا سر جیدی کے سینے پر ٹکا دیا۔

جیدی کا دل ٹوٹ گیا۔ آپا دل ہی دل میں اظہر بھائی کو کتنا یاد کرتی ہیں۔ ان کی کہی باتیں کیسے ان کے دل پر نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ کیسا دکھ ہے خداوند۔ یہ کیسی رات ہے؟ اس رات کی سحر کہاں ہے، ہے بھی یا نہیں؟؟ اس نے رجی کو زور سے لپٹا لیا۔

جیدی کی پوسٹنگ کسی دیہات پر ہو گئی تھی اور رجی کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ مسافروں جیسی زندگی گزارے اور جب انسان پڑھ لکھ کر کمانے لگتا ہے تو اسے زندگی کا ساتھی بھی چن ہی لینا چاہیئے۔

"جیدی میں تیرے لئے لڑکی دیکھ رہی ہوں، چاہتی ہوں تیری روانگی سے پہلے شادی ہو جائے۔"

"آپا۔۔" جیدی چیخا۔ "میں اس قسم کی کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔" غصّے اور رنج کے مارے اس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا تھا۔

"اچھا۔؟؟" رجی مصنوعی خوش دلی سے بولی۔

"ہاں آپا میں کہے دے رہا ہوں میں شادی وادی عمر بھر نہیں کروں گا۔"

"رجی ہنسی۔" ارے تیرے تو بڑے بھی شادی کریں گے۔ تو کیا مجھے دھونس بتاتا ہے۔

"اچھا یہ بات ہے تو کر دیجیئے میرے بڑوں کی شادی۔"

وہ پلٹ کر بولا۔

مذاق مذاق میں بات کتنی دور پہنچ گئی۔ رجی چونکی اور جیسے کراہ کر بولی

"جیدی تو میرے دل میں تیر کیوں چبھاتا ہے۔ تو۔۔ تو اتنا ظالم تو کبھی نہیں تھا میرے عزیز۔" جیدی نے سر اُٹھا کر آپا کو دیکھا۔ دنیا کے سارے غم سمٹ کر اس کے چہرے پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ کچھ بول نہ سکا۔

"جیدی اگر تُو نے میری بات نہ مانی تو یاد رکھو۔" رجی چپ ہو گئی۔ "میں ابھی نہیں بتاتی میں تجھ سے کیا انتقام لُوں گی۔ ہاں پہلے تو انکار کر، پھر خود ہی دکھ جائے گا۔" جیدی کانپ گیا۔ آپا مجھ سے کیا انتقام لے گی۔؟ یقیناً آپا خود اپنی ہی جان کو دکھ پہنچائے گی۔ ورنہ آپا جیسے محبت بھرے دل کسی کو کیا دکھ دے سکتے ہیں۔؟ وہ داؤ بچانے کو بولا۔

"آپا میں اپنی پوسٹنگ کوشش کر کے حیدرآباد ہی میں کرا لوں گا۔ اور کم بخت نہ ہوئی تو لات مار کر اپنی پرائیوٹ ڈسپنسری کھول لوں گا۔"

" وہ ہو گا تب ہو گا - مگر میں تجھے یوں ہی نہ چھوڑوں گی - اپنے لئے نہیں تو میرے لئے تجھے شادی کرنی ہی پڑے گی --- ہاں سن لے جیدی -

رجی سفید ساڑی، سفید بلاؤز پہن کر اور جوڑا باندھ کر جب آئینے کے سامنے آئی تو اسے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ وہ بے حد معتبر اور سنجیدہ نظر آ رہی تھی - خصوصیت سے جوڑے نے اُسے بہت گریس فل بنا دیا تھا - شمو کی ایک سہیلی اس کی نظر میں تھی - جو بی اے کر رہی تھی اور بہت اچھے خاندان سے تھی - صورت شکل کی بھی بہت پیاری تھی - معین صاحب یقیناً جیدی جیسے لڑکے کو داماد بنانا اپنی خوش بختی خیال کریں گے - اس نے وثوق سے سوچا -

مسز معین بہت خوبرو عورت تھیں - چالیس سے اُوپر ان کی عمر رہی ہو گی - مگر رکھ رکھاؤ ابھی تک نئی نویلیوں کا سا تھا - جب رجی نے ستارہ کے لئے ان سے بات چھیڑی تو وہ بولیں

" مگر لڑکے کی ماں کون سی ہیں ؟"

رجی پر وہ ایک لمحہ صدی بن کر گذرا - اس نے بڑے ضبط سے جواب دیا " جی میں ہی لڑکے کی ماں ہوں -"

مسز معین اپنی جگہ سے اُچھل پڑیں - "یعنی ، یعنی کہ آپ لڑکے کی ماں ہیں - آپ تو مجھ سے بھی چھوٹی ہوں گی - ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے - آپ کے لڑکے بالے کہاں سے آئے - ؟"

رجی نے بہت سنبھل سنبھل کر جواب دیا - " جی ، امی کے مرنے کے بعد میں نے چھوٹے بھائی بہنوں کو ماں بن کر پالا ہے - میں ہی تو ان کی ماں ہوئی -"

" تو آپ نے ان لوگوں کی وجہ سے اپنی شادی نہیں کی -"

وہ ذرا حیرت اور ستائش بھرے لہجے میں بولیں -

رجی نے بڑی سادگی سے جواب دیا - " جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں کہ وہ لوگ میری زندگی میں پتھر بن گئے ہوں ، میں نے خود ہی نہیں کی -"

مسز معین کبھی بچہ نہیں تھیں - اس کے چہرے مہرے سے اس کے دلی کرب کا حال جان گئیں۔ انھوں نے حیرت سے اُسے دیکھا وہ اتنی چھوٹی سی لڑکی ۔ کس قدر عظیم تھی !

جیدی ایک نہ ایک بہانہ ڈھونڈ نکالنا چاہتا تھا - چڑ کر بولا ۔
" اور آپ شادی کے لئے پیسہ کہاں سے لائیں گی ۔ ؟"
رجی ہنس کر بولی ." اتنی نادان تو میں ہوں نہیں کہ ہاتھ میں پیسہ نہ ہو اور اتنا بڑا کام کرنے بیٹھ جاؤں، زیور تو پاس ہے ہی ." (حالانکہ اس کو امی کی قسم یاد تھی)
جیدی سرخ پڑ کر بولا - " بس بس آپا بہت ہو چکا - اب آپ چاہتی ہیں کہ رہا سہا آپ کا زیور بھی میں مار دوں میں سچ آپ سے مرتے دم تک بات نہ کروں گا ."
رجی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ " مریں تیرے دشمن' بازو برابر تو میرا بھائی ہے جیدی، تجھے تو میں بھیا کہہ کر بلا سکتی ہوں میرے عزیز تو جیئے، تیری کمائی میں سے میں کتنے ہی زیور بنوالوں گی ۔"
پھر بہت دیر بعد وہ دکھی لہجے میں بولی :" اور اب ۔ یوں دیکھا جائے تو میری عمر بھی کون زیور پہننے کی رہ گئی ہے جیدی ؟"
جیدی نے چونک کر سر اُٹھایا - آپا اس کے قریب بیٹھی تھی اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ جیدی نے غور سے دیکھا کہ ابھی سے آپا کے بالوں میں چاندی کے تار جھلملا رہے تھے ۔
جیدی بہت خوبصورت تھا ۔ رجی چاہتی تھی دُلہن ویسی ہی ملے اور ان دونوں کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی کہلائے ۔ ستارہ . رجی کے معیار حسن پر پوری اترتی تھی اور معین صاحب نے بھی زیادہ حیل حجّت نہ کی ۔ بلکہ دل ہی دل میں تو وہ بیحد خوش ہوئے کہ ڈاکٹر داماد ملا ۔ رجی نے کسی کو کچھ نہ بتایا کہ شادی کا انتظام اس نے کس روپے سے کیا ہے ۔ وہ خود ہی خوشی خوشی سارے کار سلجھا رہی تھی صبح سے جو جاتی تو شام تک بازاروں کے چکر لگاتی رہتی ۔ جیدی اس کا بڑا پیارا ، بڑا اچھا بھائی تھا ۔ جو اس کا بھائی بھی تھا دوست بھی ۔ اس کے غم کو بھی سمجھتا

تھا اور خوشیوں کو بھی وہ چاہتی تھی۔ جیدی کی شادی میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

شادی بہت اچھی طرح ہوئی۔ مہمانوں سے پٹے ہوئے گھر میں کون ایسا نہ تھا جس نے دل سے بھی اور منہ سے بھی رجی کی تعریف نہ کی ہو۔ "بہن ہو تو ایسی ماں کا سلوک کیا ہے۔" مگر ایک جیدی، تھا جس کی آنکھ سے آنسو نہ تھمتا تھا۔ تعریف و تحسین کا ایک جملہ جس کی زبان سے نہ نکلا۔

شادی میں دلی والے چچا جان مع اظہر کے آئے تھے۔ شادی کے سارے مہمان جا چکے تھے وہ اب تک نہ گئے تھے۔ انھوں نے پھر سے ابو پر زور دینا شروع کیا۔ کہ اب تو ماشاءاللہ سے جاوید میاں بھی کام سے لگ گئے ہیں اور دوسرے بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔ پھر خیر سے گھر میں بہو بھی آگئی ہے۔ اب کیا رکاوٹ ہے۔؟ ابھی بات رجی کے کانوں تک آئی تھی،۔ ڈھلمل ڈھلمل سی تھی کہ قدرت نے ایک وار اور کیا۔ ایک رات ابو اچانک ختم ہو گئے اور کئی دن یونہی روتے گزر گئے۔

اظہر جب سے حیدرآباد آیا تھا، جیسے پرانا اظہر نہ رہ گیا تھا، نہ اس کے وہ قہقہے تھے نہ وہ ادائیں، بس ہونٹوں پر چپکی سی لگی رہتی۔ رجی سے اس کی بات چیت بھی نہ ہوئی تھی خود ہی اُسے بات کا موقع نہ دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اظہر کو موقع ملا تو وہ کیا کہے گا۔ اکیلے میں اگر کبھی وہ ایک جگہ ہوتے بھی تو رجی فوراً کسی نہ کسی کام کا بہانہ بنا کر چلی جاتی۔

ایک دن سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اظہر بار بار ماتھے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ شمو اچانک بولی "۔اظہر بھائی، یہ آپ پیشانی پر کیا تلاش کر رہے ہیں۔؟"

اظہر نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا۔" نہیں شمو، مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ یہاں میرے ماتھے پر چاند کا نشان سا تھا۔ ڈھونڈ رہا ہوں کہ میرا وہ چاند کہاں کھو گیا۔" اس کی آواز میں شدید دُکھ اور کرب کا احساس تھا۔

"چاند—؟" شمو حیران رہ گئی، اچانک رجی بول پڑی

"جی ہاں مجھے یاد ہے، میں نے ضرور دیکھا ہے وہ چاند۔"

"پھر آپ بتا سکتی ہیں کہ اب اس کی جگمگاہٹ کہاں کھو گئی ۔"

رجی نے باتوں باتوں میں لاپرواہی سے کہا "اندھیری راتوں میں چمکنے والے اس چاند کو کیسے بھلا جاسکتا ہے، جس نے زندگی میں روشنی بھر دی تھی ۔" وہ شمو کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "شمو اب تو بی اے کے بعد کیا کرے گی ۔؟ اور نہ کچھ بھی کرے، مگر بہر حال تجھے میری نگرانی اور میری محبت کی ضرورت باقی رہے گی ۔" شمو اس کی اوٹ پٹانگ باتوں سے بوکھلا گئی ۔

"آپا، آپ آج کیسی الٹی پلٹی باتیں کر رہی ۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ۔؟؟"

"مجھے کچھ بھی نہیں ہوا شمو، میں بہت اچھی ہوں ۔" وہ ہنسی

"میں اکثر سوچتی ہوں کہ اب تو اس گھر سے میرا اتنا گہرا ناطہ ہو چکا ہے کہ میں کہیں جا نہیں سکتی ۔ جیدی یہاں رہے گا نہیں ۔ گولو کی تعلیم نامکمل ہے ۔ اور پھر تو اکیلی ۔ یہ سب کیسے ممکن ہے کہ تم سب کو اس اندھیرے میں چھوڑ کر بس اپنے لئے کوئی چاند تلاش کر لوں ! ؟"

اس رات جب اظہر اسی پرانے کمرے میں سویا ہوا تھا تو بالکل ویسی ہی رات تھی ۔ وہی ماحول، وہی زندگی، سب کچھ وہی تھا ۔ بالکل وہی ۔ مگر رجی وہ نہ تھی ۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے آئی ضرور، مگر وہ ٹھٹھک گئی ۔ پھر اس نے جھجکتے سہمتے قدم بڑھائے اور اس کے پلنگ کے پاس آکر ٹھہر گئی ۔ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی اور یونہی مڑ گئی ۔ آنکھوں میں آنسو لئے ۔ اظہر جاگ رہا تھا ۔ جیسے ہی وہ پلٹی، لپک کر اٹھا اور اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا

"رجی ۔ سچ کہہ دوں رجی ۔ اب تم خدا ہو گئی ہو ۔ میں تمہارے بغیر زندہ تو رہ سکتا رجی ۔ مگر خوش نہیں رہ سکتا ۔ ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں تمہارے سامنے کوئی جھوٹ بولنے کو جی نہیں چاہتا ۔ پھر میں یہ جھوٹ کیسے کہوں کہ تمہارے بنا میں زندہ نہیں رہ سکتا ۔ مگر رجی ایسی زندگی کس کام کی ۔ اس سے تو موت ہی اچھی ہے ۔ تم میری زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہو رجیا ۔ تم ۔ تم ۔

رجی کا سارا بدن ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی ۔ اور، ہونٹوں کے کونے اسی بے قراری سے کانپ رہے تھے ۔ جیسے وہ بے صدا آواز سے کسی

سے گئے ہیں۔ برائے نیک بارے میں کہتے ہیں ۔ وہ یونہی کانپتی ہوئی اظہر سے لگی کھڑی رہی۔ اس کے روکھے سوکھے بالوں سے اظہر کو وہ زندگی بخش مہک آرہی تھی جس سے وہ آج تک محروم رہا تھا اس نے سرتھکا کر ان روکھے سوکھے بالوں کو چوم لیا۔

"میری زندگی — میری جان —"

رجی کا جسم کانپا اور وہ بے دم ہو کر اظہر کے بازوؤں میں گر پڑی۔

جیدی نے جو درخواست دے رکھی تھی وہ منظور ہو گئی تھی۔ اور اب جیدی پشاور میں تھا — رجی بہت خوش اور مطمئن تھی کیونکہ وہ ان دنوں ستارا کو اکیلی رکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ جب ستارہ متلی یا چکر کی شکایت کرتی تو رجی بڑے بوڑھوں کی طرح معنی خیز انداز سے مسکراتی اور بچے ہوئے ٹائم میں ننھے گدیلے، روئی دار توشکیں، اور چھوٹے چھوٹے کپڑے سیتی رہتی۔

ننھا آشو گھر بھر کی مسرت کا سامان بن کر آیا۔ بہت دنوں بعد اس گھر میں بچے کی کلکاریاں گونجی تھیں — اب رجی کو لمحہ بھر کی فرصت بھی نہ ملتی۔ وہ ساری زندگی کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھائے چل رہی تھی۔ اسے بیتے دنوں کی یاد کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی اگر یاد آتا بھی اس کے لئے تبسم بن کر آتی تھی۔ اور خصوصیت سے برسات کی راتیں تو اس کا سہرا آزمانے آتی تھیں۔ رہ رہ کے اس کے تصور میں داغ محبت ابھرتا۔ جو بیک وقت چاند بھی تھا اور اس کے ارمان پیار کی مہر بھی۔

اظہر نہایت بددل ہو کر اپنے دوست کے ساتھ لندن چلا گیا تھا — وہاں وہ بڑی پریشان اور تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ وہاں اس نے یہ بھی سنا کہ رجی نے شو کی شادی کر دی ہے اور اب وہ ننھا جیدی تین بچوں کا باپ بن چکا ہے۔ وقت کیسے گزر جاتا ہے — ؟ کیسے کیسے؟ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں رہتا کہ وہ اپنے ساتھ کتنے دکھی دلوں کی آہیں اور کتنی آنکھوں کے آنسو لے گیا ہے — بس بڑھتا چلا جاتا ہے — گزرتا چلا جاتا ہے۔

بہت دنوں بعد اسے ایک خط ملا تھا۔

اظہر۔

یہ دکھ کبھی میرے جی سے نہیں ہٹتا کہ میں نے ایک دل دکھایا ہے۔ ایک کعبہ ڈھایا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں اظہر۔ رات میرے لئے قہر بن کر آتی ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے جھل مل کرتا چاند ادھر سے ادھر ڈھل جاتا ہے۔ تارے ایک کر کے دم توڑ دیتے ہیں مگر میری بے خواب آنکھیں نیند کے لئے یونہی ترستی رہ جاتی ہیں، ان میں نیند آئے بھی کہاں سے ان میں تو آنسو سما چکے ہیں۔ ! کتنے ستاروں کی میتیں ان آنکھوں نے دیکھی ہیں۔ کتنے چاند تاروں کو آنکھوں نے کفن پہنایا ہے۔ اے زندگی، - اے دل!!

مجھے بڑا دکھ اس لمحے ہوتا ہے اظہر، جب یہ سوچتی ہوں کہ میں نے تمہاری زندگی تباہ کی ہے۔ کتنے دکھ اس دل نے پال رکھے ہیں۔ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے اظہر کیا مجھے معاف نہ کر دو گے۔ ؟

... گڈو اس سال میٹرک میں ہے۔ پھر میرے سارے سکھ پورے ہو جائیں گے۔ اظہر۔ مجھے یہ خوشی رہے گی کہ میں نے امی کی روح کو کوئی دکھ نہیں دیا۔ مگر کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر بڑی ہنسی آتی ہے کہ میں ابھی تیس کی بھی نہیں ہوئی ہوں اور میرے بال سفید ہو چکے ہیں بس تمہیں کیا بھیجوں - میری زندگی اور زندگی کا سارا پیار تمہارے ہی لئے تو ہے

رجی

جیدی کے بڑے بیٹے کی تیسری سالگرہ تھی۔ شمو بھی اس فنکشن کے لئے اپنی سسرال سے آگئی تھی، وہ اور ستارہ مل کر سب تیاری کر رہی تھیں۔ رجی ہدایات دے رہی تھی۔ جیدی نے اب گورنمنٹ سروس چھوڑ کر اپنی پرائیوٹ ڈسپنسری کھول لی تھی۔ اور اس کی پریکٹس خوب چل نکلی تھی کسی چیز کی کمی اب محسوس نہ ہوتی۔ پرانے دنوں کا وہ ظالم سورج جو سدا بادلوں کے پیچھے ہی رہا کرتا تھا اب بادلوں کا سینہ پھاڑ کر کھلے آسمان پہ جگ مگ کرتا تھا۔ رجی بے حد مطمئن تھی۔ وہ کھلے دل سے خوب پیسہ اٹھا رہی تھی۔

کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جا رہی تھیں۔ ستارا اور شمو ہنس ہنس کر بیلوں اور صراحی دار غباروں میں پھونکوں سے ہوا بھر رہی تھیں سارے میں شور و ہنگامہ تھا، خوشی تھی۔ اکدم رجی پرانے سامان والے کمرے میں گئی اور وہاں سے گراموفون اور ریکارڈ اٹھالائی پھر اپنے دامن سے ریکارڈ کی گرد صاف کی اور ریکارڈ پر سوئی لگادی۔ پہلے کھر کھر سر سری آواز نکلی پھر میوزک بجنے لگی، اور کوئی غم بھری آواز سے پکارا۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

بج رہا ہے اور بے آواز ہے

رجی ہاتھوں میں اپنا اداس چہرہ لئے بڑی محویت سے سُن رہی تھی

کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے

اکدم ستارہ اور شمو نے چونک کر صحن کی طرف نگاہیں اٹھائیں، جہاں ایک اسٹول پر گراموفون دھرا تھا اور ایک نیچی کرسی پر رجی یوں گم سم بیٹھی تھی، جیسے رجی نہ ہو پتھر کی مورت ہو۔ پھر دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

" ارے آپا" دونوں چلّائیں۔ " یہ کیا پُرانا دُھرانا ریکارڈ چڑھا رکھا ہے۔

رجی وہیں سے چونک کر بولی۔" مجھ سے کچھ کہا؟"

ستارہ ہنس کر بولی ۔" آپا آپ کے بھائی ابھی پرسوں ہی تو تازہ فلموں کے کوئی اٹھارہ ریکارڈ لائے ہیں۔ ریڈیو گرام پر کیوں نہیں سنتیں۔ یہ کیا پھٹ نوس باجہ بجائے جا رہی ہیں آپ؟!

رجی مسکرا کر بولی ۔" نہیں ستارا یہ تو بڑا اچھا گانا ہے۔ نسیم بانو نے گایا ہے۔"

شمو بولی ۔" وہ تو ٹھیک ہے آپا۔ مگر ایسا سڑیل گانا اور ایسے خوشی کے موقع پر؟ اُٹھیئے نا۔" وہ لاڈ و انداز پر اتر آئی۔

لَے نہ ٹوٹے زندگی کے ساز کی

اک تری اور اک مری آواز ہے

اک تری — اک مری — اک تری — اک مری

رجی کچھ نہیں سن رہی تھی اور سب کچھ سن رہی تھی۔ ستارہ اور شمو یونہی کھڑی تھیں۔ اسی دم باہر سے جیدی آیا، اور آتے ہی ٹھٹھک گیا۔

لے نہ لوٹے زندگی کے ساز کی
زندگی آواز ہی آواز ہے!

ریکارڈ گھر گھر بجے جا رہا تھا۔ سوئی آخری سرے پر آکر یونہی گھومنے لگی، تو رجی نے اُٹھ کر پھر ریکارڈ چلا دیا۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

"جیدی بھیا، دیکھئے نا ذرا۔" شمو کی ہنسی سے بھری آواز کہیں دور سے رجی کے کان میں پڑی، اور اس نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا۔ اس نے دوسرے ہی لمحے تیزی سے ریکارڈ پر سے سوئی ہٹائی اور دھڑام سے گرامو فون کا کور گرا دیا۔ وہ اس کا دوست، وہ اس کا بھائی، وہ اس کا غمخوار، وہ کیسے اپنے دل کا درد اس بخوبی سے چھپائے؟ اس نے ہنس کر (وہ ایک ہنسی جو لاکھ آنسوؤں کو روکنے سے پیدا ہوتی تھی) جیدی کو دیکھا اور بولی۔

"بیٹے کی سالگرہ کا ہنگامہ دیکھو اور باپ اب چلے آ رہے ہیں۔"

وہ دھیرے دھیرے ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح برآمدوں سے ہوتی ہوئی اپنے کمروں کو جانے لگی۔

جیدی کا بیٹا آشو تھا تو تین سال کا، مگر عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا۔ گول چپا کی طرح تتلانا اسے نہیں آتا تھا۔ ٹپر ٹپر باتیں کئے ہی جاتا۔ سالگرہ کی تقریب کے بعد بچے ادھر ادھر بکھر گئے اور مہمان عورتیں وہیں باغ میں کرسیاں ڈالے باتیں کرنے لگیں۔ جانے ان معصوم بچوں میں کیا تو تو میں میں ہوئی کہ آشو ایکدم تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور اپنی ممی کے

گھٹنوں سے لپٹ کر سسکنے لگا۔

"مم ۔ می ۔ ممی ، وہ نرگس کی بچی بولتی ہے کہ ۔ اون ۔ اون ۔ بولتی ہے کہ ہمیں تو گرینی ہے ۔ تمہاری گرینی نہیں ہے ؟؟" اس نے دور اشارا کیا ۔ نرگس اپنی دادی کی انگلی تھامے گملے سے کوئی پھول نوچ رہی تھی ۔ مسز معین آج طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اس فنکشن سے غائب تھیں ۔

ستارہ نے بالکل لاپرائی سے منے کو اٹھا کر گھٹنوں پر بٹھایا اور بولی

"بھلا کیا کہتی ہے وہ نرگس ، میں بھی سنوں ۔"

آشو نے رو رو کر وہی بات دہرائی ۔" ہاں ممی ہمیں گرینی نہیں ہے ؟"

رجی سفید سلک کی ساڑی اور بلاؤز پہنے ڈھیلا سا جوڑا باندھے ۔ سامنے ہی کرسی پر بیٹھی تھی ۔ ستارہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔

"کون کہتا ہے میرے منے کی گرینی نہیں ہے ۔ وہ دیکھ تیری گرینی بیٹھی ہیں کتنی پیاری ہیں نا ۔" وہ ممتا بھرے انداز سے آشو کی خوشی دیکھ رجی کی طرف دیکھ کر مسکرائی

دھڑ ۔ دھڑ ۔ دھڑ ۔ آگ ہی آگ ۔ شعلے ہی شعلے ۔ یہ دوسری بات تھی کہ رجی کی زندگی میں پھر سے آگ لگی تھی اور ایسی آگ جس کا بچاؤ ہی نہ تھا ۔ ایسی آگ جو نہ آبلے پیدا کرتی تھی نہ بدن جھلساتی تھی ، پھر بھی سب کچھ جل جاتا تھا ، بھسم ہو جاتا تھا ،

"ہاں ہاں بیٹے آؤ ۔ میں تمہاری دادی ہوں نا ۔ تمہاری دادی ۔ دا ۔ دی ۔"

اور وہ دیوانہ وار قہقہہ لگا کر ہنسی جو ہنسی نہیں کچھ اور ہی تھی ۔ اور وہ آشو کو گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی ۔

مہمان سب جا چکے تھے ۔ سب نے جاتی دفعہ بار بار رجی کو پوچھا ، مگر ستارہ نے جب بھی اس کے کمرے میں جھانکا اسے منہ لپیٹے پایا ۔

"صبح سے کام میں لگی ہیں نا ۔" شائد تھک کر سو گئی ہیں ۔

آپ محسوس نہ کیجئے گا ۔" ستارہ ایک ایک سے معذرت کرتی رہی ۔ مگر ستارہ

نہیں جانتی تھی کہ اب رجی عمر بھر کے لئے جاگ چکی تھی ۔شاداب وہ کبھی نہیں سوئے گی ۔

کھانے کی میز لگ چکی تھی ، ہنستی جھومتی رجی کمرے میں داخل ہوئی۔اس نے سر پر پر پوڈر تھوپ رکھا تھا اور بوڑھوں کی طرح کمر جھکا کر چل رہی تھی ۔سین مکمل کرنے کو اس نے ایک لاٹھی تھام رکھی تھی ۔

"ہاہاہا ۔ اب میں پوری دادی لگتی ہوں نا جیدی ۔ میں تیرے بچوں کی دادی اور شمو کی نانی .... ہی ہی ہی ۔"! وہ دیوانہ وار ہنسے جا رہی تھی ۔

جیدی نے ہاتھ کا نوالہ پھینک دیا ۔ "آپا ۔ آپا ۔" وہ چلایا ۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے ۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ۔"

اس کی کرخت آواز سن کر رجی نے گھوم کر ایک لمحے کو اپنے جیدی کو دیکھا کچھ اس طرح جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو ۔

"آپا ۔ میں جیدی آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں ۔ آپ کا بھائی ۔ آپ آپ کا اپنا ۔"

وہ جیدی کے سینے سے لپٹ کر رو پڑی ۔" جیدی یہ سب لوگ کہتے ہیں ، میں بوڑھی ہو گئی ہوں ۔ میں دادی بن گئی ہوں ———————————

ہاں جیدی کیا یہ ممکن ہے ۔ اگر اظہر آئے گا تو کیا کسی بوڑھی کو بیاہ لے جائے گا ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا جیدی کہ اندھیری رات میں راستہ بتانے والا وہ چاند بھی ڈوب گیا جو ماتھے پہ پیار کی مہر بن کر جگمگاتا تھا جو داغ محبت بھی تھا اور جو ..."

اس کا دم چڑھ گیا ۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں ۔ وہ تھک کر جیدی کے بازوؤں میں گر پڑی ۔ جیدی جو ایک بھائی بھی تھا ۔دوست بھی تھا اور ڈاکٹر بھی ۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف منہ پھیرا ۔صدیوں کا غم اس کے چہرے پر ایک لمحہ میں سمٹ آیا تھا ۔

"ستارہ" ۔ وہ ڈوبتے ہوئے بولا "آپا پاگل ہو گئی ہیں ۔"

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے　　　بج رہا ہے اور بے آواز ہے

•

رجی) اپنی دُھن میں بیٹھی گائے جا رہی تھی ۔ بیچ بیچ میں وہ لامعنی بک بک بھی شروع کر دیتی ۔

"اب میں یہ لبادہ کیوں پہنوں ۔ میرا بھائی تو اب ہزاروں سے کما رہا ہے ۔ چھی چھی ۔ اس میں بھی کوئی روح نظر آتی ہوں مگر یہ کیا ضرور ہے کہ میں اظہر کی گاڑی میں ضرور بیٹھوں ۔ اب تو جیدی بھی گاڑی خریدنے والا ہے ۔"

جیدی آنکھوں میں آنسو لئے اسے بیٹھا دیکھ رہا تھا ۔ جب سے وہ پاگل ہوئی تھی، ہر بات میں کسی نہ کسی طرح اظہر کا ذکر ضرور نکل آتا ۔ اور جیدی کا دل یوں ہو کر رہ گیا تھا جیسے کسی نے چاقو سے کھانچے لگا کر نمک بھر دیا ہو ۔

"جیدی، وہ جب پہلی بار تم اور اظہر آئے تھے نا تو وہ دلی سے آیا تھا نا ۔ راستے میں اسے تم نے کیسے پا لیا ۔ ؟ اسے گھر کا راستہ کس نے بتایا تھا ۔ تم نے ۔ ؟ اچھا تو شائد تم اسٹیشن پر جا کر اس کی راہ دیکھ رہے تھے ۔ کیا پتہ مجھے ؟"

اس کا تھکا ہوا دماغ جب کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیتا تو وہ پیشانی پر بل ڈال کر سوچتے سوچتے نڈھال سی ہو جاتی اور پھر چُپ ہو جاتی ۔

"شکر ہے اب گو لو نے تتلانا چھوڑ دیا ہے ورنہ مجھے یاد ہے کہ پہلی بار جب اظہر آیا تھا تو اس نے مذاق سے کہلوا دیا تھا ۔ آپ تی اجل آئی ہے ۔ یعنی میری موت آئی ہے ارے واہ، وہ تو زندگی کا پیام بن کر آیا تھا میرے لئے ۔"

وہ رجی، جس نے عمر بھر کبھی جیدی اور شمو کے سامنے اظہر سے آنکھ ملا کر بات نہ کی اب کھلے دل سے اپنی محبت کے داغ انہی کے سامنے عریاں کرتی ۔ اس کا مافی الضمیر ان باتوں کو دہراتا رہتا جس نے اس کا دل کاٹ کر رکھ دیا تھا ۔

جب چاندنی راتوں میں جگمگاتا چاند آسمان کے بیچوں بیچ آ ٹکتا تو وہ گھنٹوں محویت کے ساتھ چاند کو تکے جاتی ۔ پھر چاند سے باتیں شروع کر دیتی ۔ کھانا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا نیند اس کے پاس نہ پھٹکتی تھی ۔ شمو کی شادی ہوئی تھی تو ۔ وہ اپنے پرانے کپڑے اور سادی

ساڑیاں چھوڑ گئی تھی۔ اور اب جیدی کے ہاتھ میں بے حساب پیسہ آیا تو رجی نے ساڑیاں پہننی شروع کر دی تھیں۔ ستارا اسے جبر کر کے کپڑے بدلواتی تو وہ خوش ہو کر بولتی۔

"ہاں ساڑی میں مزور پہنوں گی ۔۔ ایک بار اظہر نے کہا تھا میں ساڑی میں کوئی اور ہی چیز بن جاتی ہوں۔"

مسلسل کب کب کے بعد وہ خاموش ہوتی تو وہی نیم بانو والا پرانا گھسا پٹا گیت گانے لگتی۔ کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے۔ سنسان کمروں میں اس کی درد بھری آواز گنبد کی صدا بن بن کر لوٹتی، ٹکراتی، گونجا کرتی۔ وہ ایک ایک کھڑکی ایک ایک دروازے میں جاتی۔ کبھی باغ میں پھولوں کے پاس جا کر کھڑی ہوتی اور جیسے سوچتی رہ جاتی کہ اسے کیا تلاش ہے کیا کھو گیا ہے۔ ایک بار اس نے بڑی بے چارگی سے جیدی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب میرے دل میں ۔۔ اس جگہ درد سا کیوں ہوتا ہے؟ کہیں پھوڑا تو نہیں ہے یہاں؟" جیدی کے گلے میں اسٹیتھسکوپ دیکھ کر اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر درد کی جگہ بتائی تھی۔

جیدی میز پر سر ٹکا کر اس رات دو بجے تک روتا رہا۔۔۔۔

جب وہ بوجھل دل اور سرخ آنکھیں لئے برانڈے میں اترا تو دیکھا ملگجی چاندنی میں آدھے چاند کو گھورتی رجی اس سے کہہ رہی تھی۔

"ارے تم ۔۔ تم چمک رہے ہو پھر بھی میری دنیا میں اندھیرا ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ اس برسات کی رات کے بعد اب کبھی ۔۔۔۔

جیدی ساکت رہ گیا۔

کئی دن گزر گئے ۔۔ رجی مسلسل باتیں کئے جاتی ۔۔ اتنے دنوں سے اسے جو چپ لگی تھی اور اس کے دل میں جو باتیں گھٹ کر رہ گئی تھیں، وہ انھیں ایک ایک سے سناتی پھولوں سے ستاروں سے، چاند سے جیدی سے، ستارہ سے بچوں سے۔ بچے اس کے آس پاس آتے تو وہ معتبر بن کر بولتی۔

"بچو، میں تمہاری دادی ہوں ۔ آں ۔ بوڑھوں کا کہا مانا کرتے ہیں ۔"

اکیلے میں جانوروں سے بھی باتیں کئے جاتی ۔ بلی کو گود میں تھام کر کہتی ۔

" دیکھ تیری آنکھیں نیلی ہیں ۔ گھر چھوڑ کر بھاگ نہ جانا ۔ بے وفائی نہ کرنا ۔ مگر نیلی آنکھوں والوں کا بھروسہ ہی کیا ہے ۔" اور وہ ہنسے جاتی ۔ بے تحاشہ ہنسے جاتی ۔

اب تک رجی بے ضرر پاگل تھی ۔ وہ صرف اپنے آپ میں الجھی رہتی ۔ مگر اب چند دنوں سے اس نے توڑ پھوڑ شروع کر دی ۔ کوئی بھی چیز اٹھا کر پھینک دیتی ۔ شیشے کے برتن چکنا چور کر ڈالتی ۔ جیدنا اسے سمجھاتا تو وہ تیزی سے بولتی ۔

" یہ میری بات کا جواب نہیں دیتے کم بخت ۔ میں بات کرنے کو ترس گئی میں نے بھی انتقام لے لیا ۔" اور وہ اونچے اونچے ہنسنے لگتی ۔ ۔ ہنسی ہنسی کر گاتی ۔

اک تری اور اک مری آواز ہے
زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

رجی کے سنبھلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہا ۔ تو اس نے طے کر لیا کہ آپا کو اب مینٹل ہاسپٹل میں داخل کروا دینا چاہئے ۔ اس نے بھاگ دوڑ کی مگر اسپتال میں داخلہ ملنا بھی قیامت سے کم نہ تھا ۔ کچھ اس کا ڈاکٹر ہونا کام آیا اور کچھ رسوخ سے کام لے کر بھاگم بھاگ کی ۔

پولیس ڈاکٹر انچارج سے ملا اور رجی کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد انچارج ڈاکٹر نے اسے پرمیشن دے دی ،

لیڈی ڈاکٹر جیدنا سے بہت خلوص سے ملی ۔ ۔ اس نے رجی کی لگاتار لامعنی ، بکواس سنی اور پھر کہا ۔

" مسٹر، آپ مجھے پہلے اس کیس کی رپورٹ دے دیجئے ۔ اس کے بغیر ہم آسانی سے مریض کو سنبھال نہیں سکتے ۔"

جیدنا نے دکھ سے سر اٹھا کر لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا

" کیا آپ کے خاندان میں کوئی پہلے بھی پاگل ہوا تھا ؟"

"جی نہیں ۔" وہ آہستگی سے بولا

"پھر اُن کے دماغ کو کوئی صدمہ ضرور پہنچا ہوگا۔" وہ پین سنبھالتی ہوئی بولی ۔

جیدی رکا اور پھر ریکارڈ کی طرح بجتا چلا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر کا قلم بھی اسی تیزی سے چلتا گیا۔ اکدم وہ رک گئی ۔

"مسٹر ــ یہ کچھ ذاتی سا سوال ہو جاتا ہے ــ مگر میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے جو صدمے کی نوعیت بتائی ہے تو مس رضیہ پر کسی کا دباؤ تھا کہ شادی نہ کرے ۔"

"جی ــــ اور بہت گہرا دباؤ تھا ۔"

"صریح ظلم تھا ــ کس نے روکا تھا انہیں" ؟

"ان کے دل نے "۔ جیدی، آہستگی سے بولا

" وہ بہت حساس ہے ڈاکٹر ــ اس نے دوسروں کو سکھ دیکر جینا سیکھا تھا ۔ مگر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے ۔ میں بھی آخر ایک ڈاکٹر ہوں ، دماغی نہ سہی مگر اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ پے در پے صدموں نے اسے نڈھال کر دیا ۔ جس دن اس کا دماغ چلا اس دن ایک بہت سنگین واقعہ رونما ہوا تھا ۔

"وہ کیا ۔" ڈاکٹر دلچسپی سے بولی ۔

" دیکھئے ــ رجی ابھی تیس کی بھی نہیں ہوئی ہے ۔ مگر صدموں نے اس کے بال جگہ جگہ سے سفید کر دیئے ہیں ــ ہمیشہ سے جس طرح وہ سب سے پیش آتی رہی ہے اس کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس دل میں بھی کوئی آرزو ، کوئی ارمان پل سکتا ہے ۔ وہ میرے بیٹے کی سالگرہ کا دن تھا ۔ جب اپنے دوستوں کی حرص میں اس نے اپنی ممی سے پوچھا تھا کہ میری دادی کہاں ہے ــ اس کی ممی نے نبے دھیانی میں رجی کو دکھا کر کہا ــ "وہ ہیں تیری گیرنی" اور اس وار نے اس کا دل کاٹ کے رکھ دیا ۔ وہ پیالہ جو بھر چکا تھا ، چھلکا نہیں تھا اس دن چھلک پڑا ۔ مجھے اس کے پاگل ہو جانے پر قطعی تعجب نہیں ہے ڈاکٹر ۔" اور جیدی چپ رہ گیا ۔

کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جس لڑکے سے وہ محبت کرتی تھیں' آپ کسی نہ کسی طرح، ان کی شادی کروا دیتے ؟"

جیدی ایک بھائی پہلے تھا، ڈاکٹر بعد میں اس نے۔ بے بسی سے سر اٹھا کر ڈاکٹر کو دیکھا اور میز پر سر رکھ کر سسکنے لگا۔

جیدی چلنے لگا تو بالکل ایک عام آدمی بن کر' ایک عام انسان بن کر' جاہل بن کر پوچھنے لگا، "ڈاکٹر میری آپا کو یہاں کوئی تکلیف تو نہ ہوگی، ؟"

ڈاکٹر نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا - "میں جانتی ہوں مسٹر — آپ ایک ڈاکٹر بعد میں ہیں اور درمند بھائی پہلے۔"

وہ کچھ رکی اور بولی — "بہتر ہوگا اگر آپ ہفتہ پندرہ دن میں صرف ایک بار آیا کریں۔ ایسے ذہنی مریضوں پر ان کے پیاروں کی موجودگی اچھا اثر نہیں ڈالتی۔ ہم ان کے ضروری معائنے کے بعد الیکٹرک شاک جلد ہی شروع کر دیں گے۔

جیدی بوجھل دل لئے آفس سے نکل آیا۔

ہفتہ بھر کے بعد جیدی ہاسپٹل پہنچا۔ بے تابی سے وہ آفس میں گھسا۔

"میں آپا سے ملنا چاہتا ہوں ڈاکٹر — کہاں ہیں وہ ؟"

وہ اندر لپکنے کو ہوا۔

"آپ یہیں بیٹھیے۔ میں ابھی انہیں یہاں بلاتی ہوں - اُدھر دوسری پاگل عورتیں بھی ہیں، کیا کیجیے گا آپ وہاں جا کر ؟!

تھوڑی دیر میں ایک نرس کے ساتھ رجی آتی دکھائی دی، ملگجی سفید ساڑی۔ بال بکھرے پیلی پیلی رنگت، ننگے پیر' چھوٹے چھوٹے پاؤں اُٹھاتی، اپنے آپ میں گُم۔

جیدی ذرا مڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈاکٹر — کیسا آپ لوگوں کا انتظام ہے' ان کے پیر میں چپل تک نہیں ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر پیار سے مسکرائی — "ہم ان باتوں کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں مسٹر

جاوید ـ ابھی چند روز انھیں چپلیں نہیں مل سکتیں ـ وہ چپلوں سے نرسوں کی ڈاکٹروں کی تواضع شروع کر دیتی ہیں۔"

جیدی "اوہ" کہہ کر چپ ہوگیا

رجی آ کر چپ چاپ اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے جب کہا۔

"رضیہ بی بی، ان سے ملیئے۔ آپ کے بھائی ہیں۔" تو وہ منہ پھیر کر بولی۔ "میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ان سے کہہ دیں یہاں سے چلے جائیں۔" اور پھر وہ بے تحاشہ ہنسنے لگی!

"ڈاکٹر یہ اس قدر بے تحاشہ ہنستی کیوں ہیں؟" جیدی دکھ سے بولا

"جہاں تک میں اس کیس کی ریڈنگ کر سکی ہوں، ان کی ہنسی کا ایک واضح سبب ہے وہ زندگی بھر ہنسی کے لئے ترستی اور گھٹتی رہیں۔ اب وہ اپنے پرانے دنوں کا بدلہ لے رہی ہیں

رجی نے کھڑے کھڑے گانا شروع کر دیا تھا۔ بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔

"دیکھئے" ایڈن ڈاکٹر بولی ـ "زندگی کی محرومیوں کا کتنا خوبصورت اظہار ہے!"

جیدی، چپ چاپ سنتا رہا۔ ڈاکٹر بولی

"کل سے ہم نے بجلی کے شاک شروع کئے ہیں۔ اس سے یقیناً نتائج بہتر ہوں گے۔"

"سونے کے لئے بستر وغیرہ کا معقول انتظام ہے یا نہیں ڈاکٹر۔" وہ بچوں کی طرح ایک ایک سوال کر رہا تھا۔

"آپ اطمینان رکھیں"

اگر دیکھ بھال کے لئے میں خود رہ جاؤں تو ـ" ؟؟

"ڈاکٹر کو مریض اتنا پیارا ہوتا ہے ۔!" وہ اس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولی

جیدی تو اپنے حواسوں میں تھا نہیں ـ پتہ نہیں ستارہ یا شمو، کس نے اظہر کو رجی کی بیماری کی اطلاع دے دی تھی۔ اظہر لندن سے واپسی پر دلی میں اپنے والد کا کاروبار سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ـ خط ملتے ہی وہ حیدر آباد دوڑا آیا ۔

"ارے اظہر بھائی یہ آپ ہیں؟" شمو نے اس کے تیزی سے سفید ہوتے ہوئے

! لزنا کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا ۔" کیا ہو گیا تھا آپ کو ۔ اچھے تو رہے ۔!

"ہاں اچھے تو رہے ۔" وہ بے رنگ لہجے میں بولا ۔" اچھے نہ ہوتے تو زندہ کیسے رہتے ۔ بار بار پیشانی کو چھوتے رہنا اب اس کی کبھی نہ ٹوٹنے والی عادت ہو کر رہ گئی تھی ۔

جیدنا اور اظہر ابھی آفس ہی میں تھے ۔ لیڈی ڈاکٹر کا غذوں پر جھکی ہوئی تھی اظہر جلد سے جلد ربی کو دیکھ لینا چاہتا تھا ۔ بڑی دیر بعد وہ سر اٹھا کر بولی ۔

"آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ اب کچھ کچھ حواسوں میں آ چلی ہیں ۔"

"سچ "۔ جیدی خوشی سے اُچک کر بولا ۔

"جی ہاں"۔ لیڈی ڈاکٹر متانت سے بولی " مگر میں نے کچھ کچھ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے ۔ یاد ہو گا جب وہ یہاں آئی تھیں تو کسی کو پہچانتی تک نہ تھیں ۔ توڑ پھوڑ کرتی رہتی تھیں پچھلی بار بھی آپ آئے تھے تو نفرت سے منہ پھیر لیا تھا انھوں نے ۔ مگر کل پہلی بار پوچھا کہ میں کہاں ہوں ۔ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں ۔"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا ڈاکٹر"۔ جیدی بے تابی سے بولا

"یہی کہا کہ آپ کی طبیعت کچھ خراب تھی ۔ یہ ہاسپٹل ہے ۔ کچھ دنوں بعد آپ چلی جائیں گی ۔"

اظہر خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا ۔ جیدی نے پوچھا ۔

" ڈاکٹر وہ بالکل اچھی ہو جائیں گی نا ؟"

بہت دیر تک اس نے کوئی جواب ہی نہ دیا ۔ پھر سر اٹھا کر جیدی کو دیکھا اور رک رک بولی ۔" اس کا جواب بہت مشکل ہے ۔ ہم تو خدا پر بھروسہ ہی کر سکتے ہیں ۔ بس ——

—— سائنس نے اتنی ترقی ضرور کر لی ہے ۔ مگر پھر بھی خدا کے وجود کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے

آج رجی نسبتاً بہتر حالت میں تھی پاؤں میں سلیپر تھی اور بالوں میں تیل بھی پڑا تھا اور پہلے کی وحشت بھی اس کے چہرے پر نہیں برس رہی تھی مگر جیسے ہی اس نے جیدی اور اس کے ساتھ اظہر کو دیکھا گم سم سی رہ گئی۔ وہ ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی قریب آئی۔ اور قریب آئی ــ اور قریب ــ پھر اظہر کے چہرے کو چھُوا۔ اس کے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کیا اور جیسے خواب میں بڑبڑائی۔

"یہ کون ہے ؟! ـ اسے دیکھا ضرور ہے ـ مگر" ـ وہ دماغ پر زور ڈال کر سوچتی رہی ـ سوچتی رہی ـ پھر تھک سی گئی ـ اونہہ، کر کے وہ ڈاکٹر کی طرف پلٹی اور بولی

"کیا میں پاگل ہوں ڈاکٹر؟"

"کون کہتا ہے ؟" وہ پورے یقین اور وثوق سے ذرا مسکرا کر بولی ۔" آپ تو بالکل اچھی ہیں ـــ"

"ہاں وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ بالکل اچھی ہوں، میں پاگل نہیں ہوں، ورنہ میں ان لوگوں کو پہچانتی کیسے ؟ ـ یہ وہی ہیں نا جنھوں نے میری زندگی میں زہر گھولا ہے ـ یہ وہی ہیں" وہ جوش میں آکر پتہ نہیں اور کیا کیا بکتی کہ ڈاکٹر کے اشارے پر نرس اسے لے کر چلی گئی۔

یہی وہ حیدر آباد کی سڑکیں اور شاہراہیں تھیں، جن پر اظہر کئی بار جیدی، گولو، شمو اور رجی کے ساتھ گھوما تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کار چلائے جاتا اور راہ چلتوں پر فقرے کسے جاتا، گولو اور شمو ہنسی سے لوٹ پوٹ جاتے اور وہ کنکھیوں سے دیکھتا کہ رجی پر اس کا کچھ اثر ہوا ہے یا نہیں ـ رجی کی مسکراہٹ کے لئے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا ـ ہر راستہ یونہی ہنستے بولتے کٹتا۔ اور جب وہ گھر پہنچتے تو مارے ہنسی کے رجی کے گال تمتمائے رہتے ـ

آج بھی وہی سڑکیں تھیں، کار کی وہی دھیمی رفتار ـــ وہی ماحول وہی سب کچھ،

مگر وہ دل کہاں تھا — ؟ رم جھم موسیقی کی ہمراہی میں آنے والے گورے گورے پیروں کی وہ چاپ کہاں تھی ؟ جلتے جلتے ہونٹوں کے وہ چاند کہاں تھے — گرم گرم ہاتھوں کا وہ لمس کہاں تھا ؟ نیلی آنکھوں کو بے وفا کہنے والے وہ ہونٹ کہاں تھے — ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن کر بھٹکی ہوئی روح کی طرح دھیرے دھیرے گھومنے والی رجی کہاں تھی جو ہرگز خدا نہیں تھی مگر آسمان پر رہتی تھی جو چاند نہیں تھی مگر چاند کی طرح چمکتی تھی — جو سورج نہیں تھی مگر سورج کی طرح جلتی تھی — یہ سب کچھ کہاں کھو گیا تھا — کہاں — کہاں — اے دل — اے دل !!

گھر پہنچنے کے بعد جیدی نے پہلی بار اظہر کو غور سے دیکھا۔ غموں کی زبان نہیں ہوتی۔ مگر کچھ غم ایسے ہوتے ہیں ، جو بے زبان ہوتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتے ہیں جیدی کیا پوچھ سکتا تھا۔ ؟؟

"چچا جان کیسے ہیں ؟" وہ ماحول کی بے حسی دور کرنے کچھ بھی پوچھ بیٹھا۔

"بہت خفا ہیں"

"کیوں ؟" جیدی حیرت سے بولا

"کہتے ہیں شادی کر لو ، میری زندگی آج کل ہو رہی ہے — کون جانے کب مر جاؤں اکلوتی اولاد کا سکھ تو دیکھ لوں۔"

"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں" وہ بے حس بن کر بولا۔

"اچھا — تم بھی یہی کہتے ہو —" اظہر طعن سے بولا

"انتظار اس چیز کا کیا جاتا ہے اظہر بھائی جو واپس آنے والی ہو — ایسی چیز کے انتظار کا فائدہ بھی کیا ، جس کی واپسی کی کوئی امید ہی نہ ہو —"!

"جاوید —" اظہر پوری طاقت سے چلایا

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اظہر بھائی — آپا کے دماغ کو جو صدمہ پہنچا ہے۔ وہ ایک دو دن کے عطا کردہ غم کا نتیجہ نہیں۔ برسوں کے دبے ہوئے غم نے ان کے صبر کو للکارا ہے۔ اچھے ہوتے ہوتے بھی انہیں سال بیت جائیں گے۔ ان کا انتظار فضول ہے۔

اظہر چپ چاپ سُن رہا تھا۔

"آپا جیسی فطرت رکھتی ہیں اُسے دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس حالت میں بھی اگر وہ کوئی التجا کر سکتی تھیں تو بس یہی کہ اب میرا تو سب کچھ ختم ہو چکا ہے ___ اپنے ابو کی خواہش کا احترام ہی کر لیں۔"

"مگر دل - یہ دل کیسے مانے میرے دوست"۔

اظہر ہاتھ ملتے ہوئے بولا - "کچھ یوں لگتا ہے جیسے سینے میں ہر دم آگ سی لگی ہے اب دنیا میں کوئی خوشی، کوئی سکھ باقی نہیں رہا۔ وہ رک کر دھیرے دھیرے بڑے غم سے بولا -" جس دل میں آرزو ہے، وہ دل برباد ہے ۔ برباد ہے ۔"

اگلے ہفتے جب جیدی اور اظہر، رجی سے ملنے ہاسپٹل پہنچے تو رجی انھیں دیکھ کر گم سُم بدحواس یا خستہ نہ ہوئی ـ وہ لپک کر آئی اور اظہر کی پیشانی کو چھو کر بولی -" یہاں کبھی کوئی چاند طلوع ہوا تھا - یاد ہے ؟" کوئی جواب نہ پا کر اظہر سے چمٹ گئی -" دنیا میں بہت دکھ ہیں اظہر - بہت غم ہیں - میں یہاں نہیں رہنا چاہتی - مجھے یہاں سے کہیں بھگا لے چلو۔" اور وہ اظہر کی قمیص میں اپنا منہ چھپائے سسکتی رہی -

جیدی نے تھرا گیا - آپا اب کبھی اچھی نہ ہو سکیں گی - کبھی نہیں - وہ تو اظہر بھائی سے ہماری موجودگی میں بات بھی کھل کر نہ کرتی تھیں اور آج - آج انھوں نے - نہیں - نہیں اب ان کا انتظار فضول ہے۔

جیدی نے ایک نہ مانی اور اظہر کی شادی ہو گئی۔

رجی کی زندگی سے تو ساری خوشیاں ختم ہی تھیں - کیا یہ ظلم نہ تھا کہ اب اظہر کی زندگی کو بھی غموں کی پوٹ بنا دیا جاتا اور پھر چچا جان بے چارے نے کیا قصور کیا تھا کہ اکلوتی اولاد کا سکھ نہ دیکھتے ___ ؟

کتنے ہی برس اور مہینے وقت ٹھہر کر اڑ گئے۔

ایک دن رجی لیڈی ڈاکٹر سے بولی ۔ "آپ نے مجھے یہاں کیوں ڈال رکھا ہے یقین کیجئے میں بالکل اچھی ہوں ۔ مجھے اپنے گھر کی بہت یاد آ رہی ہے ۔"

ڈاکٹر کھل اُٹھی ۔ مریض اس حد پر پہنچ جائے ایسا بہت کم ہوتا تھا ۔ مگر رجی نہ صرف سکون سے اپنے ماضی کو دہراتی تھی ۔ بلکہ ڈاکٹر کو اپنا سچا ہمدرد پاکر اس سے اپنے دکھڑے بھی بیان کرتی تھی ۔ مگر عجیب بچوں کی سی معصومیت سے، اس کا ڈاکٹر کو مخاطب کرنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا، جیسے زندگی کے سارے فیصلے ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھے ۔

"کیوں ڈاکٹر ۔ یہ سراسر میری زیادتی ہوتی نا اگر میں محض اپنے آرام، سکون محبت اور جسمانی لطف کی خاطر اتنے سارے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر شادی کر لیتی ۔"؟

"بالکل بالکل ۔" ڈاکٹر اس کی ہاں میں ملاتی ۔

"میرا فیصلہ بہت اچھا تھا نا ۔" وہ معصومیت سے پوچھتی

"اس میں کیا شک ہو سکتا ہے ۔"!

"اچھا آپ کی رائے میں میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا تھا نا ۔"؟

"ایسے غلط کام کرنے والے کو تو میں دیوی کہوں گی ہاں ۔" ڈاکٹر اسے خوش کرنے کو بولتی

"بس تو آپ کہتی ہیں تو یقیناً میں صحیح راستے پر تھی ۔"

اس دن رجی نے خود ہی گھر جانے کے بارے میں کہا مگر ادھر نرسیں بھی کئی دنوں سے کہہ رہی تھیں کہ وہ بالکل صحت مند ہو گئی ہے ۔ دوا نہیں پیتی، کسی کو اپنا کام نہیں کرنے دیتی، بلکہ کہتی ہے میں خود اپنا کام کر سکتی ہوں ۔ مجھے اپنا اچھا برا خود سمجھتا ہے ۔

ڈاکٹر کی معائینوں کے بعد جیدی رجی کو گھر لے آیا ۔

اس دن جیدی، شمو اور گولو کی خوشی قابل دید تھی ۔ جیدی تو مارے خوشی کے ناچتا پھر رہا تھا ۔ اس نے اس رات بہت زوردار پارٹی دی ۔ سارے دوستوں اور ملاقاتیوں کو بلوایا ۔ رجی کے لئے اس نے خاص طور سے خود جا کر ایک بھاری سفید زریں ساڑھی خریدی ۔ ویسا ہی بلاوز ۔ سفید چپلیاں اور جوڑے کے لئے سفید پھول ۔

رجی بھی بچوں کی سی خوشی اور معصومیت کے ساتھ سب میں مل کر ہنستی بولتی رہی ۔ سب اسے مبارکباد دیتے تو وہ بس اتنا ہی بولتی ۔

"ارے یونہی میری طبیعت ذرا خراب ہو گئی تھی ۔ آپ اُسے اتنا محسوس کیوں کر رہے ہیں ۔"

رجی ماضی کی گئی باتیں یکسر بھول چکی تھی ۔ بیٹھے بیٹھے وہ اچانک عجیب سا سوال کر دیتی

"یہ پھول یہاں کس نے اگائے ہیں ۔ میں نے تو نہیں !"

"ارے اپنے اس کمرے میں ایک گرام فون ہوا کرتا تھا نا جیدی وہ کہاں رہ گیا ۔"

معقول جواب سے وہ مطمئن ہو جاتی ورنہ اس کا دماغ کھوج کئے ہی جاتا ۔ ایک چیز جسے وہ آج تک نہ بھول پائی تھی وہ تھا آدھا چاند آسمان پر تیرتا وہ دیر تک نظریں گاڑے اسے دیکھتی رہتی اور پھر ہنس کر دل ہی دل میں مطمئن ہو جاتی ۔

وہ اب تک اظہر کو یاد کرتی تھی ۔ اس کے ماضی کا یہ دریچہ آج بھی کھلا تھا ۔ وہ اس دریچے میں جھانک کر دیکھتی تو بیتی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگتیں ۔ وہ کسی سے مارے شرم کے پوچھ بھی نہ سکتی تھی کہ اظہر کہاں ہے ۔ لندن سے آیا یا نہیں ۔ کئی بار اس نے خط لکھنے کے بارے میں سوچا ۔ مگر ایک انجانی سی شرم نے اس کے ہاتھ روک دیئے

رات سے رجی بہت بے چین تھی !

برسات کے ظلم ڈھانے والے دن تھے اور آگ لگانے والی راتیں ۔ اس رات پانی خوب برسا ۔ رجی تیز ہوا کے جھونکوں کی گستاخیوں سے پریشان ہو کر جاگ پڑی ۔ اور جاگتے ہی اسے کئی دنوں پہلے کی وہ رات یاد آ گئی جب اس نے عملی طور پر اپنے پیار کا اظہار کیا تھا ۔ محبت جیسی بے زبان شے کو زبان بخشی تھی ۔ وہ دھیرے سے اُٹھی اور کمرے در کمرے ہوتی ہوئی اسی کمرے میں آ کر رک گئی ۔ جہاں آج سے سالوں پہلے اظہر کا پلنگ ہوا کرتا تھا رم جھم کی دلآویز اور کبھی نہ فنا ہونے والی وہ موسیقی آج بھی کانوں میں گونج رہی تھی ۔ پھول کچھ زیادہ ہی بے تابی سے مہک رہے تھے ۔ ہوا کے جھونکے کی طرح شمالی دریچے سے

ہو ہو کر کمرے میں طواف لگا رہے تھے۔

"تم کہاں ہو — کہاں ہو — کہاں —"

وہ بے تابی سے ادھر ادھر ٹہلتی پھری — پھر دریچے میں آ کر رک گئی۔ ٹھنڈے شیشے سے گال لگائے وہ کتنی ہی دیر کھڑی رہی — آج ماضی حال بن گیا تھا — برسات کے ننھے ننھے آبدار قطروں نے اس کے ذہن کی گرد دھو دی تھی — اور وہ پوری طرح ہر ہر عکس کو صاف جھلکتے دیکھ سکتی تھی — اتنی ٹھنڈک میں بھی اس کے ہونٹ جلنے لگے۔ کسی کی پیشانی پر محبت کا داغ چھوڑنے کے لئے — اس کے ہاتھ مچلنے لگے، کسی کے چہرے کو پیار سے چھونے کے لئے۔ اور وہ خود کسی خزاں رسیدہ پتی کی طرح تھر تھر کانپنے جا رہی تھی۔ ملن کی چاہ آج تیز سے تیز تر ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی رات کو وہ کمروں سے ہوتی ہوئی پرانے سامان والے کمروں میں پہنچی اور پھر وہ ٹھوڑی کو ہاتھ میں لیئے بڑی محویت سے سن رہی تھی۔

آیا بسنت سکھی، برہا کا انت سکھی

پھر گیت کے بولوں کے ساتھ ساتھ اس کے ہونٹ بھی گنگنانے لگے، برہا کا انت سکھی — برہا کا انت سکھی .....

دوسرے دن وہ حد سے زیادہ نڈھال تھی — پرانی یادوں نے آج اس کے زخموں کو کھرچ کھرچ کر رکھ دیا تھا۔ وہ باوری باوری سی جگہ جگہ پھرتی رہی — بار بار وہ گنگناتی

آیا بسنت سکھی برہا کا انت سکھی۔

جیدی ہاسپٹل جانے کے لئے باہر نکلا تو رجی باغ میں بیٹھی گنگنا رہی تھی، اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ آخر آپا اپنی دنیا میں لوٹ ہی آئیں۔

شام کو جیدی نے پکچر کا پروگرام بنایا تھا، اور سب مل کر اسے انجوائے کرنے جا رہے تھے — جیدی خوشی سے بولا۔

"بھئی یہ آپا بہت کام چور ہو گئی ہیں — آج چائے انہی سے بنوائی جائے گی" وہ مسکرایا — "کیوں آپا؟"

"میں کوئی کام سے ڈرتی تھوڑی ہی ہوں — ساری زندگی ہی تم لوگوں کا کام کیا ہے"
اور وہ اپنا لبادہ سنبھالتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
جیدی بور ہو کر بولا — "آپا آپ نے پھر وہ اپنی شاہی پوشاک پہن لی۔ مجھے اس سے دکھ ہوتا ہے۔"
رجی پیار سے ہنسی۔ رات کو اس نے کس دُھن میں، کس لمحے میں ساڑی اُتار کر یہ لبادہ پہن لیا تھا۔ اب اُسے خود حیرت ہو رہی تھی۔ یونہی ہنستی ہوئی بولی — "جیدی میرے عزیز، انسان کو چاہیئے اپنے ماضی کو کبھی نہ بھولے۔"
"ہاں مگر اس صورت میں کہ ماضی بھی ڈھنگ کا رہا ہو —"
"میرا ماضی تو بہت رنگین تھا۔ بہت خوبصورت جیدی، تو کیا جانے —" اور وہ، کمرے کے وسط میں میز کے پاس جا کھڑی ہوئی — اکدم باہر سے جیدی کا چھوٹا بچہ بھاگتا ہوا آیا
"ڈیڈی — ڈیڈی — اجل چاچا آئے ہیں"
"ایں — یہ بغیر اطلاع ہی کے چلے آئے اظہر بھائی —" جیدی کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور دوسرے ہی لمحے رجی نے دیکھا، اظہر ایک عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہا تھا برسات کے پیلے سورج کی مریض اور زرد کرنیں، رجی کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ چائے کی پیالی تھامے کھڑی تھی۔ ستارہ بولی۔
"آپا اظہر بھائی کی دُلہن سے ملیئے نا۔ جب آپ کی طبیعت خراب تھی نا تب اظہر بھائی کی شادی ہوئی تھی۔" پھر وہ مڑی —
"آیئے اظہر بھائی — آیئے نا بھابی ...."
پیالی فرش پر گر کر چکنا چور ہو چکی تھی — سورج کی زرد کرنوں نے یکلخت سارے کمرے کو اپنی زد میں لے لیا تھا — آج پھر وہی آگ جل اُٹھی تھی۔ وہی بالکل وہی۔ لال لال زبانیں نکالے، وہ شعلے بلندی اندر ہوئے جا رہے تھے — سائیں سائیں کرتے شعلے جیسے کوئی گیت سُنا رہے تھے — آپا بسنت کھِلی — آپا بسنت کھِلی — آج بڑا کانت ہو گیا

اب رتی رتی زرد ہو گئی تھی۔ اس کا جسم کہیں تحلیل ہو چکا تھا اور سفید لبادے میں لپٹی کوئی روح باقی رہ گئی تھی۔ اسے اظہر بھی کسی آوارہ روح کی طرح اُجڑا اُجڑا نظر آ رہا تھا وہ دھیرے دھیرے چلتی دریچے کے پاس جا پہنچی۔ اس کے ہونٹ کانپے اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولنے لگی۔

"تم کو یاد ہے نا اظہر۔ آج سے سالوں پہلے تم آئے تھے تو مجھ سے کہلوایا تھا۔ "آپ کی آواز آتی ہے"۔ وہ جیسے قبر کی گہرائیوں سے بول رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اپنے نحیف ہاتھوں میں اپنا زرد چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔

اُترتے سورج کی زرد شعاعیں کمرے میں ناچ ناچ کر بسنت کی آمد کے گیت گانے لگیں۔

اور رم جھم کی تال پر گیت کے بول شعلے بن بن کر لپکنے لگے۔

— • —

واجدہ کی روح سے ایک قطرۂ صداقت نکلا اور کچھ دیر قلم میں رکا ...... پھر "جیسے دریا" سمندر میں مل جاتا ہے وہ قطرہ سفید کاغذ کی موجوں میں مل کر ایک بے پناہ طوفان بن گیا۔

"جیسے دریا"

واجدہ تبسم کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ

صفحات ۳۰۴ قیمت ۲۰ روپے

واجدہ جس تخت پر بیٹھی ہے وہ ادب کا تخت طاؤس ہے جس میں مختلف کہانیوں کے لعل، زمرد، اور موتی جڑے ہوئے ہیں اور ہر ہیرے سے سچائی کی کرنوں کا انعکاس ہو رہا ہے۔ سورج کو دیکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی کرنوں سے نگاہیں چار کی جائیں۔

تخت طاؤس

واجدہ تبسم کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ

صفحات ۳۰۴ قیمت ۲۰ روپے